فیضِ سعید

جلد اول

مستورات کیلئے نماز کی افضل جگہ
نمازِ جنازہ کہاں پڑھنی چاہئے
مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم
اہل قرآن یا منکرین حدیث
تقلید کی ضرورت
یکساں سول کوڈ اور ہمارا ملک
مختصر خاندان یا خاندانی منصوبہ بندی!
دعوتِ دین کی جدید کوششیں اور...

مجموعۂ مضامین

حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ

خلیفہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنا بٹی مدظلہ

جمع و ترتیب

مولانا سیّد خواجہ نصیر الدین قاسمی

استاذ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

ناشر

برکات بکڈپو
Barakaath
Book Depot
17-1-391/2/M/1, Khaja Bagh, Sayeedabad, Hyderabad. (A.P.)

تفصیلاتِ طباعت

نام کتاب	فیض سعید (جلداول)
مجموعہ مضامین	مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ
جمع و ترتیب	سید خواجہ نصیرالدین قاسمی
صفحات	۲۸۰
قیمت	120/-
ناشر	برکات بکڈپو، خواجہ باغ کالونی، سعیدآباد، حیدرآباد

ملنے کے پتے

مکتبہ فیض ابرار نزد مسجد اکبری اکبر باغ، حیدرآباد۔ ۳۶ 040-65709415

ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ، نزد پدماوتی گرلز کالج سعید آباد حیدرآباد۔۵۹ 040-24070681

مدرسہ خیرالمدارس، چودھری نگر، لاتور مہارشٹرا 09421956690

فہرست عناوین

۱	کلماتِ بابرکات　ازحضرت مولانا شاہ جمال الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی	۵
۲	تقریظ　ازحضرت مولانا مفتی عبدالمغنی صاحب مدظلہ	۷
۳	تاثرات　ازحضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری مدظلہ	۸
۴	تقدیم	۱۰
۵	تراویح اور اسکی رکعات	۱۷
۶	ترویحہ حقیقت وروایت	۲۵
۷	قربانی، تعارف فضائل ومسائل	۴۳
۸	اگر جمعہ وعید جمع ہوجائیں	۵۲
۹	مستورات کیلئے نماز کی افضل جگہ	۵۷
۱۰	مسئلہ تین طلاق، سپریم کورٹ کا ایک استفسار	۶۹
۱۱	نماز جنازہ کہاں پڑھنی چاہئے؟	۷۴
۱۲	مسئلہ سود	۸۵
۱۳	رشوت کی لعنت	۹۷
۱۴	مسجد میں جماعتِ ثانیہ کا حکم	۱۰۶
۱۵	اہل قرآن یا منکرینِ حدیث	۱۳۴
۱۶	تقلید کی ضرورت	۱۵۸
۱۷	عقیدہ ختم نبوت مفسرین قرآن نظر میں!	۱۸۷

۱۸	مہدوی مذہب ایک تعارفی خاکہ	۱۹۲
۱۹	مہدوی بھائیوں کے نام ایک پیغام!	۲۰۰
۲۰	فقہ،فقہاءاور ہندوستان	۲۰۳
۲۱	فریضہ حج کی طرف توجہ کیجئے!	۲۰۹
۲۲	اسلام اور سوال	۲۱۴
۲۳	قادیانی سیلاب سے ہوشیار رہئے!	۲۲۰
۲۴	قادیانی فتنہ؟	۲۲۳
۲۵	یکساں سول کوڈ اور ہمارا ملک	۲۲۸
۲۶	یکساں سول کوڈ کی حقیقت	۲۳۳
۲۷	جماعتِ اسلامی کا علماء کنونشن	۲۳۷
۲۸	مختصر خاندان یا خاندانی منصوبہ بندی!	۲۴۶
۲۹	دعوتِ دین کی جدید کوششیں اوران کے اثرات	۲۵۱
۳۰	نماز میں حضورِ قلب کے اسباب	۲۶۴
۳۱	ریاستِ گوا، حالِ دیدہ وشنیدہ	۲۷۱
۳۲	یومِ سیاہ فوائد ومضرات	۲۷۹

کلماتِ بابرکات

از

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

صدر مدرس دارالعلوم حیدرآباد وامیر ملتِ اسلامیہ آندھراپردیش

مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد ان اہل علم وخوش نصیب افراد میں سے ہیں جن سے حق تعالیٰ دینی خدمات کے مختلف میدانوں میں خوب کام لے رہے ہیں، مولانا ایک بڑے مدرسہ کے ناظم اور بہت سی دینی وعصری مدارس کے سرپرست ونگران ہیں، وہ متعدد دینی تنظیموں اوراداروں کے ایک فردِ فعال ہیں، وعظ وارشاد اور اصلاحِ باطن وتربیت نفوس کی جد وجہد میں مشغول ہیں، تصنیف وتالیف اور قلمی دنیا میں بہت گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انہی میں سے ایک وہ ماہنامہ ہے جو پہلے" اشرف العلوم" کے نام سے بعد ازاں "اشرف الجرائد" کے نام سے شائع ہورہا ہے، تقریر کی طرح مولانا کی تحریر بھی شستہ وپر تاثیر ہوتی ہے، موصوف محترم کے مضامین ونگارشات عوام وخواص سب کے لئے نہایت نافع ہیں، بندے نے بھی مولانا کی متعدد تصانیف اور مضامین سے استفادہ کیا ہے، عام طور پر ماہنامے موقتی تقاضوں اوراحوال کی مناسبت سے تحریر کئے جاتے ہیں، نتیجۃً عوام مہینوں کے گذرنے کے ساتھ ان جرائد سے بھی بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں، حالانکہ دینی ماہنامے کے مواد ومضامین اپنی افادیت کے اعتبار سے ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، روزناموں کی خبروں کی طرح دن گذرنے کے ساتھ غیر اہم نہیں

ہوتے، اسی لئے مولانا کے فیض یافتہ شاگردِ رشید مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب نے مولانا کے ان مضامین کی افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کر کے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو جمع کیا ہے، جس کا نام "فیض سعید" رکھا گیا ہے، جو صاحبِ مضامین کے شیخ محترم کی طرف منسوب ہے، جو انشاءاللہ مزید موجبِ برکات ہوگا۔

محترم مرتب کی یہ کاوش کسی شاگرد کی جانب سے اپنے استاد محترم سے حسنِ عقیدت اور متعلقہ حقوق کی ادائیگی کی شکلوں میں ایک عمدہ و مستحسن شکل ہے، حق تعالیٰ مرتب و مضمون نگار کی ان خدمات کو شرفِ قبول بخشے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو استفادہ کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا شاہ) محمد جمال الرحمٰن (صاحب مفتاحی)

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب دامت برکاتہم
ناظم مدرسہ سبیل الفلاح حیدرآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدا و مصلیاً اما بعد!

پیش نظر علوم ومعارف پر مبنی مجموعۂ مضامین جو کہ فیض سعید کے عنوان سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، ملاحظہ وتقریظ کیلئے میرے پاس بھیجا گیا، مضامین کے دیکھنے کا موقع ملا الحمدللہ مختلف مضامین پر مشتمل بہترین گلدستہ ہے، مضامین نہایت مفید اور کارآمد ہیں اور ان میں تقریباً ضرورت کے اہم عنوانات آگئے ہیں، جس طرح شاہین کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی ہے اسی طرح عزیز مولانا حافظ محمد عبدالقوی سلمہ اللہ کے مضامین روحانی اعتبار سے بلند سے بلند تر ہیں ۔عزیزم مولوی خواجہ نصیرالدین قاسمی سلمہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے ان مختلف مضامین کو کتابی صورت میں استفادہ عام کیلئے مرتب کردیا ہے۔

بارگاہِ ایزدی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب ہذا کو مقبولیتِ عامہ وتامہ نصیب فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مخلوق کو منتفع ہونے کی توفیق بخشے اور آخرت کیلئے صدقۂ جاریہ بنائے، نیز مولف ومرتب دونوں کو اپنی شایانِ شان اجرِ جزیل عطا فرمائے۔آمین

والسلام

(حضرت مفتی) محمد عبدالمغنی (صاحب مظاہری)

۲؍صفر المظفر ۱۴۳۱ھ م ۲۰؍جنوری ۲۰۱۰ء

تاثرات

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم
استاذ ادب دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد !

حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب حسامی دامت برکاتہم ،ناظم ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد، ونائب ناظم مجلس علمیہ آندھراپردیش،جنوبی ہند کے اُن باتوفیق علماء میں سے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے دین متین کی کثیر جہتی خدمت کیلئے منتخب فرمایا ہے، اُن کا قائم کردہ ادارہ اشرف العلوم بہت کم وقت میں دکن کی ایک معیاری تعلیم گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کا اندازہ اس کی جانب طلبہ کے رجوعِ عام اور یہاں کے مستفید طلبہ کے مادرِ علمی ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں بکثرت داخلہ سے ہوتا ہے۔
اس کے علاوہ حیدرآباد سے باہر، انتہائی ضرورت کے علاقوں میں مکاتب ومدارس کے قیام کا سلسلہ بھی مولانا نے شروع فرمایا ہے،جن میں سے ایک اہم ادارہ امداد العلوم (نارائن کھیڑ) کے اجلاس میں احقر کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

ان انتظامی اور ملی خدمات کے علاوہ مولانا موصوف کا قلمی جہاد بھی جاری ہے،ان کے ادارہ سے ایک معیاری ماہنامہ ”اشرف الجرائد“ شائع ہوتا ہے جوان کی بصیرت افروز تحریروں سے مزین ہوتا ہے، جو وقت اور حالات کے تحت ہر قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں،انہی تحریروں اور مضامین ومقالات کو ادارہ کے استاذ جناب مولانا سید خواجہ

نصیر الدین صاحب زید مجدہم نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس وقت احقر کو اس مجموعہ سے ـــــ جس کا نام "فیض سعید" رکھا گیا ہے ـــــ استفادہ کا موقع ملا۔ احقر نے فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بعض حصوں کو سرسری دیکھا اور بعض مقالات کو بالاستیعاب پڑھا جس کے بعد احقر بلا تکلف اپنا یہ تاثر ظاہر کرتا ہے کہ مولانا موصوف اپنی تعلیمی، تربیتی اور ملی ذمہ داریوں کی طرح اس میدان میں بھی پوری طرح کامیاب اور موفق من اللہ ہیں، اُن کی تحریر میں الحمد للہ زبان و بیان کی سلاست کے ساتھ ساتھ مسلکِ حق کی کامیاب ترجمانی اور حضراتِ اکابر سے حاصل ہونے والا توازن واعتدال نمایاں ہے۔

ان مقالات ومضامین کے موضوعات کا انتخاب بھی مولانا کی دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے، بلکہ بعض موضوعات تو اُن کی جرأت و بیباکی اور سلیقہ کیساتھ حق گوئی کا شاہکار ہیں، پھر اس قدر تعلیمی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کے ساتھ اس معیار کی تحریری خدمات انجام دینا بلاشبہ ایک کرامت کی چیز ہے۔ یہ مضامین یقیناً اس لائق تھے کہ اِن کو مستقل کتابی شکل میں شائع کر کے ان کے فائدہ کو عام کیا جاتا، اس لئے میں اس کتاب کی اشاعت پر حضرت مولانا موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور حق جل مجدہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ باری تعالیٰ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور اس کو تمام مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس علاقہ کے لئے ـــــ جہاں صحیح فکری رہنمائی کی ضرورت زیادہ ہے ـــــ رشد وہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

والسلام

(حضرت مولانا) محمد سلمان عفی اللہ عنہ (صاحب)

خادم التدریس دار العلوم دیوبند

(نزیلِ حیدرآباد دکن)

۳۰ ؍ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ م ۱۷ ؍ مارچ ۲۰۱۰ء، چہارشنبہ

تقدیم

صورت بہ بیں حالت مپرس!

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کے انعاماتِ کثیرہ میں سے ایک عظیم انعام یہ بھی ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جو اکابر اہلِ حق سے وابستہ اور دین کی خدمت میں مشغول تھا، ایک دینی مدرسہ کے ماحول میں پیدائش ہوئی اور پیدائش سے تادم تحریر زندگی کے پانچ دہے مکمل مدرسہ کے ماحول میں گذر گئے، **فللّٰہِ الحمد و لافخر**، اللہ پاک سے دعا ہے —— قارئین بھی آمین فرمائیں —— کہ بقیہ زندگی جتنی بھی اس کے علم محیط اور کتاب مبین میں باقی ہے اپنے دین کی مخلصانہ خدمات سے وابستہ رکھے، اور کسی ناقدری وناشکرگذاری کی پاداش میں اس خدمت سے کبھی معزول نہ فرمائے۔

پڑھنے لکھنے کے قابل ہوا تو ۱۳۸۵ھ میں بعمر ۷/سال قرآن کریم کی تعلیم سے وابستہ کیا گیا، حفظ کی ابتدا ہی میں جبکہ پ آلم شروع ہوسکا تھا آنکھ میں کسی چیز کے چُبھ جانے کی وجہ سے شدید زخم ہوا، کافی وقت علاج واحتیاط میں نکل گیا، اس سے افاقہ کے بعد پھر سلسلہ تعلیم بحال ہی ہوا تھا کہ بعض دوسرے مانع تعلیم عوارض پیش آگئے (جن کی تفصیل کارے دارد!) اس طرح مختلف عوارض کا مقابلہ کرتے ہوئے حفظ کا سلسلہ آہستہ آہستہ جاری رہا اور دس سال کے بعد محرم ۱۳۹۶ھ میں بعمر ۱۷/سال بفضلہٖ تعالیٰ حفظ قرآن مجید مکمل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اسی سال مدرسہ فیض العلوم میں درجاتِ عربی کا آغاز ہوا، سعادت مزید یہ کہ تدریس کیلئے شیخ المشائخ واستاذ الاساتذہ مخدومی

حضرت قاری امیر حسن صاحب مدظلہ العالی تشریف لائے، درسیات کی ابتدائی کتب یہاں بھی اور ہردوئی میں بھی حضرت ممدوح مدظلہ سے پڑھنے کا موقع ملا، حضرت کی شانِ تدریس ایک مستقل کرامت ہے، وہ پڑھاتے نہیں تھے گھول کے پلاتے تھے، طالب علم کے شوق تعلّم کی مقدار چاہے کچھ بھی ہو ان کے ذوقِ تعلیم کا معیار اس کو پڑھنے پر مجبور کرتا تھا، ان کے ہاں چھٹی کا کوئی دن نہ تھا، جمعہ کے دن بھی تہجد میں اٹھاتے اور کتابیں لے کر کمرہ پر پہونچ جانے کی ہدایت دیتے، مجھے پڑھنے سے بچنے کے مواقع بہت تھے کہ میں ہردوئی میں حضرت محی السنۃؒ کے کاشانۂ مبارک میں رہتا تھا، گھر کی خدمات اگرچہ نظامِ تعلیم میں کچھ مُخل نہ تھیں، مگر ہر طالب علم کی طرح علم کی مستقبلی اہمیت سے بے خبر رہنے اور اسباق میں شرکت سے بچنے کی صورتیں مُیسر ہونے کے سبب دیگر جماعتوں میں تو بے توجہی کا شکار رہا، لیکن حضرت قاری صاحب مدظلہ کے اسباق سے بچ نہ سکا کیونکہ ان سے متعلقہ اسباق کی بہرصورت پابندی کرنی ہوتی تھی، ویسے بھی اساتذہ ماشاءاللہ مُخلص وقابل اور میرے خیر خواہ تھے، ان کے احسانات اور مہربانیوں کا کسی طرح انکار کئے بغیر مذکورہ بالا صورتحال کی روشنی میں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجھے فارسی وعربی کی جو شُد بُد حاصل ہے وہ حضرت قاری صاحب مدظلہ العالی کی رہینِ منت ہے۔

الغرض "ہدایۃ النحو" ہی تک پڑھ سکا تھا کہ صحت ناساز ہوگئی اور بگڑتی ہی چلی گئی، مقامی ڈاکٹر نے تجویز کی کہ آب وہوا سے مقابلہ مشکل ہے گھر واپس کر دیا جائے، چنانچہ حیدرآباد واپسی ہوئی، یہ واپسی بھی مخدومی حضرت قاری صاحب مدظلہ ہی کے ہمراہ ہوئی، اس سفر کا ایک واقعہ ذہن میں آ گیا جو طلبہ کے لئے بڑا عبرت آموز ہے، میں جب واپسی کی تیاری کر رہا تھا میرے ایک حیدرآبادی ساتھی نے اپنا ایک صندوق لیجا کر گھر پہونچا دینے کے لئے میرے سپرد کر دیا، میں نے اپنے صندوق میں اپنا سامان اور ان کے صندوق میں اپنا بستر رکھ کر دو ایٹم کر لئے جب مدرسہ سے اسٹیشن کے لئے رکشہ پر سوار ہو رہے تھے حضرت قاری صاحب مدظلہ کی نظر دو صندوقوں پر پڑی، اور سخت عتاب

ہوا کہ کہیں طالبعلم کے پاس اتنا سامان ہوتا ہے؟ طالب علم ہو یا تاجر؟ خوب یاد ہے کہ خفگی وعتاب کا یہ سلسلہ جو اشرف المدارس ہردوئی کے پھاٹک سے شروع ہوا تھا وہ حیدرآباد اسٹیشن پہونچنے تک جاری رہا، مجھے یہ ملال ہوتا رہا کہ میرا سامان کچھ زیادہ نہ تھا بس ایک ساتھی کی ہمدردی میں حضرت الاستاذ کی ناراضگی بھگتنی پڑ رہی ہے، کچھ جواب دینے کی مجال تھی نہ صفائی پیش کرنے کی ہمت! لیکن اس میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ حضرت قاری صاحب مدظلہ راستہ میں وقفہ وقفہ سے اس حوالہ سے ناراض ہوتے اور جب ناراض ہوتے تو دیر تک اپنی اور دوسرے اکابر کی طالب علمی کے احوال سناتے جاتے تھے جن سے بہت معلومات اور بڑی عبرت حاصل ہوئی۔

قصہ مختصر! حیدرآباد پہونچ کر ایک مدرسہ میں داخلہ لیا تو پہلے ہی دن ایک استاذ جماعت میں آئے اور کبریٰ کی عبارت وترجمہ پڑھوا کر دیکھا، پھر انہوں نے اپنا کام اس طرح ہلکا کرلیا کہ وہ کلاس میں خطوط لکھنے میں مشغول رہتے اور مجھے ساتھیوں کی عبارت حل کروانے اور مفہوم سمجھا دینے کا حکم ہوتا، اشرف المدارس ہردوئی کے منظّم ماحول کے برخلاف یہاں جماعتوں اور طلبہ کی بدنظمی سے طبیعت مایوس ہوگئی تو مرشدی حضرت محی السنۃؒ سے ترکِ تعلیم کرکے تدریس میں مشغول ہوجانے کی اجازت حاصل کرلی، مدرسہ فیض العلوم میں مکان تھا وہیں پڑھانا بھی تھا لیکن وہاں کے اصول کے مطابق شعبہ حفظ میں تدریس کیلئے "تصحیح" (یعنی نورانی قاعدہ وناظرہ کی درستگی) ضروری ہے، حسنِ اتفاق کہئے یا خوبیٔ قسمت کہ اس سال بھی مخدومی حضرت قاری صاحب مدظلہ کا قیام حیدرآباد ہی تھا، استاذ محترم مولوی سید قادر معظم شہیدؒ سے مشق کرتا اور حضرت قاری صاحب مدظلہ کو امتحان دیتا تھا، الحمدللہ اس کی تکمیل پر مدرسہ میں تقرر ہوگیا، پڑھانے کے اوقات کے علاوہ بہت وقت فارغ رہتا تھا۔

مطالعہ کا بالخصوص اکابر کی سوانح وملفوظات کے مطالعہ کا بہت شوق تھا، دن میں مدرسہ میں پڑھاتا، امامت کرتا اور بقیہ وقت مجلّات یا مصنفات کے مطالعہ میں گذارتا تھا،

میرے ایک مرحوم دوست نابینا تھے، انہیں بھی اسی کا ذوق تھا وہ سنتے رہتے میں سناتا رہتا، وہ انتہائی ذہین تھے مضامین ان کے ذہن میں تو سو فی صد محفوظ رہتے مگر میرا حافظہ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، میں ان کے مقابلہ میں نصف محفوظ رکھ سکتا تھا۔ان کتابوں کے مطالعہ کے دوران داعیہ پیدا ہوتا تھا کہ اکابر کی یہ تعلیمات اور انکے موثر ملفوظات وقابلِ رشک حالات عوام الناس تک بھی پہونچنے چاہئے تاکہ انہیں پتہ تو چلے کہ ہمارے اکابر کی شان کیا تھی؟ یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ مدرسہ ہذا ہی سے کوئی رسالہ جاری ہوجاتا، اس زمانہ میں جنوبی ہندوستان سے ہمارے اکابر کے مسلک پر مشتمل رسائل بس اکّا دُکّا ہی شائع ہوا کرتے تھے، اور وہ بھی ظاہری اعتبار سے غیر معیاری قسم کے! میں نے ایک دن ہمت کرکے حضرت محی السنۃؒ کو خط لکھا اس میں اسکی ضرورت کا تذکرہ کرکے عرض کیا کہ اگرچہ کہ احقر اس ذمہ داری کا اہل نہیں لیکن حضرت والا کی توجہ اور دعا ہو تو میں ہی آغاز کردیتا ہوں، حضرتؒ نے اس تجویز سے اتفاق اور اس کی تائید فرمائی لیکن ساتھ ہی یہ سوال بھی فرمایا کہ مدرسہ کی خدمات کے ساتھ اس کام کیلئے کیسے وقت دے سکو گے، جبکہ یہ مستقل توجہ کا کام ہے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد متعدد بزرگوں[۱] کے مشوروں اور عملی تجربوں سے اپنا سلسلہ تعلیم مکمل کرنے کا داعیہ اس قدر شدید ہوا کہ دبنے کا نام نہ لیتا تھا، میں نے اس جذبہ کا اظہار مرشدی حضرت محی السنۃؒ کے سامنے بذریعہ خط کیا، حضرت والا نے استعفیٰ دیکر پڑھائی میں لگ جانے کی اجازت عطا فرمادی، چنانچہ دارالعلوم حیدرآباد کا انتخاب کرکے داخلہ کے لئے پہونچ گیا، استاذی حضرت مفتی نوال الرحمٰن صاحب مدظلہ اس زمانے میں وہاں کے صدر مدرس تھے، ان کی خدمت میں درخواست گذار دی، انہوں نے تحریر وتعبیر کے مدنظر مجھ سے پوچھا کہ یہ درخواست کس نے لکھی؟ عرض کیا: میں نے ہی! اس پر از راہِ مزاح دریافت فرمایا: سند چاہتے ہو یا واقعی پڑھنا؟ عرض کیا: پڑھنے کا شوق ہی

[۱] بالخصوص حضرت مولانا حمیدالدین عاقل حسامی رحمۃ اللہ علیہ

یہاں تک لایا ہے! اس پر حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتاپوری کو امتحان لینے اور جماعت تجویز کرنے کی ہدایت دی، انہوں نے "قدوری" کی عبارت پڑھوا کر ترجمہ کروایا اور جماعت پنجم تجویز فرمائی، یہ وسط سال تھا جماعتِ پنجم میں بہ حیثیت سامع شریک رہا، اگلے سال باقاعدہ ششم میں پڑھتا رہا، متأہل ہونے کی وجہ سے گھر کی ذمہ داریاں تھیں، اس کے لئے امامت کر لیتا تھا اور روزانہ تقریباً ۲۰ رکلو میٹر سائکلنگ کرنی ہوتی تھی، پھر بھی شوق مشقت پر غالب تھا، اہتمام سے پڑھتا رہا مگر اس اثنا میں ایک آنکھ کی بینائی کم ہوگئی، جس کی وجہ سے ٹرافک میں سائکل چلانا مشکل ہوگیا، مجبوراً دوبارہ ترکِ تعلیم کرکے "ادارہ اشرف العلوم" کے نام سے ایک مکتب کی بنا رکھی اور محلے کے بچوں کو تجوید وقرأت کی تعلیم دینے میں مشغول ہوگیا، ادھر تکمیل تعلیم کی آرزو بجھی تو نہ تھی مجبوری نے اسے دبا دیا تھا، آنکھ کا علاج چلتا رہا، آپریشن بھی ہوا، آپریشن کے بعد روشنی بہت حد تک بحال بھی ہوگئی تھی، اسی اثنا میں دارالعلوم حیدرآباد میں "ختم بخاری شریف" کی مناسبت سے حضرت مولانا سلمان صاحب مدظلہ ناظمِ اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے بیان میں طلب علم کی راہ میں قربانیاں دینے والوں کے واقعات اس قدر تأثر میں ڈوب کر سنائے کہ مجبوریوں اور معذوریوں میں دبی تکمیلِ تعلیم کی رگِ آرزو پھڑک اٹھی، مگر اس وقت تک اشرف العلوم مکتب سے ترقی کرکے اچھا خاصا اقامتی مدرسہ بن چکا تھا، تقریباً تین سو طلبہ پڑھ رہے تھے، سر پر اس کی بڑی ذمہ داری تھی، مگر ہمت باندھتا اور خاطر کو جمع کرتا رہا، فضل ایزدی نے مدد کی اور توفیق شاملِ حال رہی، شوال میں اپنے مدرسے کے داخلوں سے فارغ ہوتے ہی دارالعلوم حیدرآباد پہنچ کر اپنے لئے "دورۂ حدیث شریف" میں داخلہ حاصل کرلیا، اور الحمدللہ پورے سال مدرسہ جاتا رہا، بال بچوں کے مسائل، خانگی ذمہ داریاں، مدرسہ کی مشکلات ومسائل، امامت اور مسجد کے مسائل پیچھے لگے رہے بلکہ ہمت توڑتے

رہے مگر اس کو بس بزرگوں کی دعائیں اور تائیدِ غیبی ہی سمجھئے کہ بات سالانہ امتحان تک بنی رہی، امتحان شروع ہوا اور اس سے ایک دن قبل اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہو کر کالر بون ٹوٹ گئی، وہ بھی داھنی جانب کی، اس کی وجہ سے داہنا ہاتھ کام کرنے سے معذور ہو گیا، مگر اللہ اللہ! شوق اور عزم بھی کس غضب کی قوت کا نام ہے اسی حال میں کسی کے ہمراہ دارالعلوم پہونچتا رہا اور بائیں ہاتھ سے پرچے لکھتا رہا۔ اپنی تعلیمی کیفیت کے مدنظر ضمیر تو بس اتنے پر راضی تھا کہ ناکامی کی رسوائی نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ کا بے پناہ کرم دیکھئے جب نتیجہ نکلا تو دورہ حدیث کی پوری جماعت میں ایک ذہین طالب علم کے بعد دوسری پوزیشن اسی عاجز کے حق میں مقدر ہوئی، واقعی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کوششوں کا بڑا اقدرداں ہے خواہ وہ کوشش کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

یہ شعبان ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۳ کی بات ہے، جبکہ اس عاجز کی عمر ۳۴ رسال تھی اسی کے اگلے سال محرم الحرام ۱۴۱۴ھ سے میں نے اپنی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے ادارہ اشرف العلوم سے بنامِ خدا ایک ماہنامہ کا اجراء کر دیا، یہ ماہنامہ ابتداءً ”اشرف العلوم“ کے نام سے آٹھ سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا، پھر بعض عوارض کی بنا پانچ سال تک موقوف رہا، اس کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا سلسلہ جنوری ۲۰۰۶ء سے بنام ”اشرف الجرائد“ شروع ہوا، جو تاہنوز بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے، اور علاقہ کے اردو جرائد میں اچھی نظر سے دیکھا جا رہا ہے، ۔اس ماہنامہ کی برکت سے مجھے کچھ لکھنے کا موقع ملتا رہا، کبھی حالاتِ پیش آمدہ پر، کبھی مواقع ومواسم کی مناسبت سے، کبھی کسی مسئلہ شرعی پر ۔روشنی ڈالنے کیلئے اس عرصہ میں اس عاجز نے جو کچھ لکھا ہے زیر نظر کتاب انہی متفرق ومتنوع مضامین کا مجموعہ ہے، اس پوری داستان کے سنانے کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ میری اپنی ضابطہ کی پڑھائی کا بھی یہ حال ہے تو اس سے میرے اندر جو کچھ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوگی وہ آپ سمجھ لیں کہ کس قدر ہوگی، یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اور میرے

اکابر کی توجہات کہ اسی کمزور صلاحیت کے ذریعہ جس قدر بھی ہوسکر ہا ہے دین کی خدمت کرر ہا ہوں، اور یہ بھی حق ہے کہ جو کچھ بھی ہوسکر ہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے اور اس عاجز پر اس کی شکر گذاری فرض ہے۔ **اللھم لا احصی ثناء ا علیک انت کما اثنیت علی نفسک و الحمد للّٰہ الذی بنعمتہٖ تتم الصالحات .**

بہرحال! قارئین سے گذارش ہے کہ زیر نظر مجموعۂ مضامین کو صاحبِ مضامین کے اسی پس منظر میں دیکھا جائے اور اس سے زیادہ توقع نہ رکھی جائے تو ناظرین کیلئے انشاء اللہ تحریر وتعبیر کا بے ڈھنگا پن زیادہ گرانی کا سبب نہ بنے گا۔

کتاب کا نام مرشدی ومربی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پرنامبٹی مدظلہ العالی کے اسمِ گرامی سے تبرک حاصل کرتے ہوئے ''فیض سعید'' رکھا ہوں، حضرتِ والا دامت برکاتہم کے اس عاجز پر مرشدِ اول محی السنۃ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بے انتہا احسانات اور خصوصی توجہات ہیں ،اسی کی برکت سے یہ بندۂ عاجز وعاصی مسلمانوں کی نظر میں کسی عزت کا مستحق ہوسکا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر صحت اور سلامتی میں بے انتہا برکت نصیب فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے بندوں کی دینی وفکری راہنمائی کیلئے حسبِ حیثیت کی گئی اس سعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے ، اور تمام تر کوتاہیوں کے باوجود محض اپنی قدرت سے ان مضامین کے نفع کو تام وعام فرمائے۔ آخر میں عزیزم مولوی خواجہ نصیر الدین سلمہ نے اسکی ترتیب میں جو صبر آزما تعاون کیا ہے اسکا میں ممنون ہوں اور ظاہری وباطنی ترقیات کی دعاؤں کے ذریعہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

محمد عبد القوی

۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

تراویح اور اسکی رکعات

نمازِ تراویح میں بیس رکعتیں سنتِ موکدہ ہیں، اوراس کی جماعت بھی سنتِ موکدہ علی الکفایۃ ہے یعنی کچھ لوگوں کا جماعت سے پڑھنا تو بہرحال ضروری ہے، نمازِ تراویح کی رکعات کے ۲۰ ہونے پر ائمہ اربعہ نے اتفاق فرمایا ہے، نیز جمہور سلف وخلف کا اس پر مواظبت اور مداومت کے ذریعہ عملاً اجماع بھی ہو چکا ہے، ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ بیس کے علاوہ چھتیس کے بھی قائل ہیں، لیکن ان کے فقہ کی متون میں بیس ہی مذکور ہیں، اسکے علاوہ یہ سولہ زائد رکعتیں وہ حضرات انفراداً ادا کرتے تھے یا پھر پچھلی شب میں پڑھتے تھے، اس لئے "تراویح" سے اسکا تعلق نہیں، نوافل کی قبیل سے ہیں۔

اور تراویح کا سنتِ مؤکدہ ہونا دلائل شرعیہ واضحہ سے ثابت ہے، چنانچہ عبدالرحمٰن جزیریؒ فرماتے ہیں:

تراویح مع الجماعۃ کا سنتِ موکدہ ہونا رسول اللہ ﷺ کے فعل سے ثابت ہے۔ چنانچہ شیخینؒ نے روایت کیا ہے کہ "آپؐ رمضان کی تیئیسویں پچیسویں اور ستائیسویں شب میں باہر تشریف لائے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ آپؐ نے آٹھ رکعتیں پڑھائیں پھر لوگوں نے باقی رکعتیں گھر جا کر پوری کیں"

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے تراویح مع الجماعۃ کو سنت قرار دیا، دوسرے اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ تراویح کی رکعتیں صرف آٹھ ہی نہیں تھیں بلکہ اس سے زائد تھیں۔ اسی لئے تو یہ لفظ

ذکر کیا گیا ہے کہ ان لوگوں نے باقی رکعتیں گھر جا کر پوری کیں۔ رہ گیا یہ سوال کہ اس حدیث سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو آپؐ نے یہ نماز پابندی سے پڑھی ہے اور نہ ہی بیس رکعتوں کا اہتمام فرمایا ہے، بلکہ صرف تین مرتبہ پڑھی وہ بھی صرف آٹھ رکعتیں! اس کا جواب یہ ہے کہ سنت تو آپؐ نے بیس رکعت ہی قرار دی تھیں لیکن چونکہ آپؐ کو اس نماز کے فرض ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے جماعت سے پابندی نہیں کرائی۔ جیسا کہ بعض روایات میں صراحتہً آیا ہے پھر جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے عملاً اس کی سنیت کو اس طرح ظاہر فرمایا کہ لوگوں کو باجماعت بیس رکعتوں کی ادائیگی کا پابند فرمایا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے عملاً اس سے اتفاق فرمالیا، پھر آپؐ کے بعد کے دونوں خلفاء راشدین یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بلا اختلاف اس پر عمل فرماتے رہے، اور ان کے بعد سے آج تک امت بتواتر اسی عمل پر قائم ہے۔

ادھر ابوداؤد کی حدیث اور بہت سی روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے اپنی طرح خلفاء راشدین کے طریقہ کو بھی مضبوطی سے تھامنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کو ضروری قرار دیا ہے، خصوصاً جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے، امام ابوحنیفہؒ سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کے بارے میں پوچھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس بنیاد پر یہ عمل جاری کرایا تھا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ تراویح سنتِ موکدہ ہی ہے، اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کی خواہش سے نہیں جاری کیا کیونکہ وہ متبعِ سنت تھے بدعت کے جاری کرنے والے نہیں تھے۔ **ما کان عمر مبتدعاً۔**

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ نمازِ تراویح اور اس کی بیس رکعتوں کے مسنون ہونے پر نہ صرف یہ کہ صحابہؓ کرامؓ کا اجماع ہوا ہے بلکہ غیر مقلدین کو چھوڑ

کر پوری ملتِ اسلامیہ بشمول ائمہ اربعہؒ کا اس پر اتفاق ہے، انہوں نے ہر زمانہ میں اسی کے موافق عمل فرمایا ہے، اور آج بھی سارے عالم کے مسلمان عوام و علماء کا اسی کے موافق عمل ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے بعد اجماعِ امت ہی اصولِ دین کی تیسری اصل ہے، اس کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ یہ غیر مقلد حضرات خود کو تو پاسبانِ دین اور مجتہد فی الاسلام تسلیم کر لیتے ہیں مگر خلفاء ثلاثہ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمہ کرامؒ کے اتفاق و اجماع سے ثابت شدہ اس مسئلہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس عمل کو "بدعت" قرار دے کر رد کر دیتے ہیں، مزید برآں اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر کے انہیں بدعتی بنا ڈالتے ہیں، افسوس! کہ خود تو ہو گئے پکے متبعِ سنت اور خلیفۂ ثانی اور وزیرِ نبوی یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ٹھیرے بدعت کے مجرم! تُف ہے اس اندھے پن پر۔

چونکہ دین کے اس اجماعی مسئلہ کے سلسلہ میں غیر مقلدین کی جانب سے بہت سی بے بنیاد باتیں شائع بھی کی جاتی رہتی ہیں۔ اور حسبِ عادت مخاطب پر رعب ڈالنے اور اپنی حقانیت ظاہر کرنے کیلئے ایسی احادیث و آثار بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن کا نہ نفسِ مسئلہ سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اہل علم کے نزدیک ان کے دعوے کی دلیل بن سکتی ہیں، چنانچہ ایسے مضامین پڑھ کر بعضے عوام بلا تحقیق اسے قبول بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے عمومی استفادہ کے مدنظر ہم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کی تحقیق کا ایک حصہ جو اس باب سے متعلق ہے پیش کرتے ہوئے اپنی بات کو ختم کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ ایک متلاشی حق کے لئے یہ مضمون نہایت کافی ثابت ہوگا۔ وھو ھذا

(تراویح کی) یہ بیس رکعتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر فرمائی ہیں، اس وقت

صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد مدینہ میں موجود تھی، ان میں سے کسی نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس پر عمل کیا، اور اس کے بعد (سے آج تک) تمام صحابہؓ و تابعینؒ اس پر عمل کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ (عہد صحابہؓ ہی میں) بیس رکعت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع منعقد ہوگیا تھا، اگر صرف اسی ایک دلیل کو لیا جائے تو (بھی نفسِ مسئلہ کے ثبوت کیلئے یہ) بالکل کافی ہے۔ کیونکہ اگر بیس رکعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہوتیں تو حضرت عمرؓ سے زیادہ بدعات کا دشمن کون ہوسکتا تھا؟ اور اگر بالفرض ان سے کوئی غلطی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جان دینے والے صحابہ کرامؓ (سب کے سب ملکر) اس کو کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ (چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ) یقیناً ان حضرات کے پاس نبی کریم ﷺ کا کوئی قول یا فعل ضرور موجود تھا، خواہ وہ ہم تک صحیح سند کے ساتھ نہ پہنچ سکا ہو، اس کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے "المطالب العالیۃ" میں "مصنف ابن ابی شیبہ" اور "مسند عبد بن حمید" کے حوالے سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھایا کرتے تھے، یہ حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن اجماع اور تعاملِ صحابہؓ سے اس کی تائید ہونے کی بناء پر اس میں قوت آگئی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "صحیح بخاری" کی ایک حدیث اس کے معارض ہے جس میں حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کے بارے میں بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں اور اس کے علاوہ بھی کبھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رمضان میں بھی وتر کے علاوہ آٹھ رکعتوں سے زیادہ تراویح نہیں پڑھتے تھے، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بخاری کی یہ حدیث تراویح کے بارے میں نہیں بلکہ تہجد کے بارے میں ہے۔ اسکے جواب میں

غیر مقلدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نمازِ تراویح و نماز تہجد دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں دو قسم کی نمازیں الگ الگ پڑھتے ہوں۔ لیکن غیر مقلدین کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اس لئے کہ تراویح آنحضرت ﷺ کے عہد میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ہمیشہ اولِ شب میں پڑھی گئی ہے جب کہ تہجد کی نماز آخر شب میں پڑھی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث باب میں تئیسویں، پچیسویں اور ستائیسویں شب میں جو تراویح کی جماعت کا ذکر ہے ان تینوں راتوں میں اول شب میں تراویح پڑھی گئی، نیز آنحضرت ﷺ نے تہجد کی کبھی باقاعدہ جماعت نہیں فرمائی اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تراویح کے لئے باقاعدہ جماعت ثابت ہے، لہذا تہجد و تراویح کو ایک قرار دینا بالکل غلط ہے، رہ گیا حضرت عائشہؓ کا ارشاد کہ رمضان ہو یا غیر رمضان آپؐ تہجد کی ہمیشہ آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے تو ان کے اس ارشاد سے تراویح کی بیس رکعتیں پڑھنے کی نفی نہیں ہوتی (کیونکہ یہ واضح ہو چکا کہ تراویح اور تہجد دو علاحدہ نمازیں ہیں ہاں! اس ارشاد سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ رمضان کی وجہ سے حضور ﷺ کی تہجد کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی،) بلکہ حضرت عائشہؓ کی دوسری روایات اس (مسئلہ میں جمہور ہی) کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً ان کا یہ ارشاد "رسول اللہ ﷺ رمضان میں (عبادات میں) اتنی محنت فرماتے تھے جتنا غیر رمضان میں نہیں فرماتے تھے"۔ اگر رمضان یا غیر رمضان میں بالکل فرق نہیں تھا تو اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث کا کیا مطلب ہوگا؟ اس کے جواب میں بعض غیر مقلدین یہ توجیہ کرتے ہیں کہ اس سے قیام کا طویل کرنا مراد ہے نہ کہ رکعتوں کا زیادہ کرنا۔ لیکن اول تو یہ بعید ہے کہ ساری رات میں آپؐ کل آٹھ رکعتیں ہی پڑھتے ہوں دوسرے مؤطا امام مالکؒ میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں "کثر صلواته" کے الفاظ بھی آئے ہیں جو غیر مقلدین

کی اس توجیہ کی تردید کرتے ہیں، اسلئے کہ یہ تکثیر تہجد میں تو ہو ہی نہیں سکتی کیوں کہ اس کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرما چکی ہیں کہ رمضان وغیر رمضان میں تہجد کی رکعات میں اضافہ نہیں ہوتا تھالامحالہ یہ تکثیر تراویح کے ذریعہ تھی۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جس طرح بیس رکعات تراویح مروی ہے اسی طرح گیارہ وتیرہ اور اکیس رکعتیں بھی ثابت ہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ ابتداء کا واقعہ ہے جب کہ صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے بیس رکعت پر عمل کا استقراء اوراجماع نہیں ہوا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ جب سے بیس رکعات شروع ہوئیں اس کے بعد سے تمام صحابہؓ وتابعینؒ کا تعامل اسی پر جاری ہوگیا۔ اور ائمہ اربعہ بھی اس پر متفق ہوگئے۔ لہٰذا استقراءامر سے پہلے کی روایات سے استدلال کرنا اصول کے خلاف ہے۔ **واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم**

ان تمام تفصیلی دلائل کے ذریعہ یہ بات کافی حد تک روشنی میں آچکی ہے کہ تراویح کا سنت موکدہ ہونا اوراس کی رکعات کا بیس ہونا ہی صحیح اور ثابت ہے، اسکے بعد بھی اگر کسی کو کچھ اشکال ہو اور دل مطمئن نہ ہو تو ہم اس سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی عمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم اوران کی سنت سے ثابت ہو، اور تین خلفاء راشدین، صحابہؓ وتابعینؒ، اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہوگیا، ڈیڑھ ہزار برس کے عام وخاص مسلمین نے اسے بدل و جان قبول کیا اوراس پر تواتر وتوارث کے ساتھ عمل کرتے چلے آرہے ہیں تو کیا ایسے عمل کو آپ بدعت قرار دے کر مسترد کردیں گے، اوراگر کریں گے تو کس دلیل سے؟ اورآپ کا یہ طرزِ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء وصحابہؓ اور جمہور علماء کے طرزِ عمل کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتا ہے؟ جبکہ خلفاء راشدین خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں " جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ

رہے گا وہ بہت اختلافات دیکھے گا، پس تم لوگ ایسے وقت میں میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور دانتوں سے مضبوط پکڑ لو، نئی نئی باتوں میں پڑنے سے احتراز کرو، کیوں کہ ہر نئی بات بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔ غور فرمایا جائے کہ اس حدیث میں ہر نئی بات کو بدعت اور گمراہی قرار دے کر اس سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ میرا طریقہ تو سنت اور نجات دہندہ ہے ہی میرے خلفائے راشدین کی سنت بھی واجب الاطاعت اور لائق تمسک اور بدعت سے بچنے کا ذریعہ ہے، اس واضح ہدایت کے بعد زیر بحث مسئلہ میں حق تک پہونچنے کا اس کے علاوہ اور کیا راستہ رہ جاتا ہے کہ اس پہلو کو اختیار کر لیا جائے جس کی جانب خلفاء راشدین اور اجماعِ امت ہیں، کیونکہ یہی سنت ہے اور اسے اختیار نہ کرنا ہی بزبانِ نبوت بدعت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جن کے عمل کو نبی کریم ﷺ سنت فرماتے اور غیر مقلدین بدعت قرار دیتے ہیں چند ارشاداتِ نبویہ اور ملاحظہ کر لیں۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میری زندگی کتنی باقی رہ گئی ہے (اس لئے میں تم لوگوں کو تاکید کر دیتا ہوں کہ) میرے بعد تم لوگ ابوبکرؓ و عمرؓ کی اتباع کرو"۔ نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "تم سے پچھلی امتوں میں بعض بعض لوگ ایسے ہوتے تھے کہ انہیں منجانب اللہ کچھ باتیں القا کی جاتی تھیں، اگر میری امت میں ایسا کوئی شخص ہے تو وہ عمرؓ ہے" یہ بھی آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "بلا شبہ اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کی زبان سے حق کو جاری کراتا ہے اور وہ حق ہی بولتے ہیں۔

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے فیصلوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا وہ اعتماد جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے امت کو اپنے بعد ان کی اتباع کا امر فرمایا

ہے ،اب اگر امام ابنِ تیمیہ ؒ یا چند اور علماء کو تراویح وتہجد میں فرق نہ کرنے کی اجتہادی غلطی کی وجہ سے حضرت عائشہ ؓ کی روایت سے اشتباہ اور سنتِ عمری واجماعِ صحابہ ؓ سے ذہول ہوگیا ،جس کی بناء پر انہوں نے تراویح کی آٹھ رکعتیں مسنون قرار دیدیں تو سوچنا چاہیے کہ آیا ان کی اس غیر اجماعی تحقیق کو اجتہادی خطاء اور تفردِ مجتہد کے درجہ میں رکھ کر اجماعی تحقیق کو اختیار کرلیا جائے یا اس تفرد کو اختیار کر کے جمہورِ امت اور صحابہ کرام ؓ کے موقف کو چھوڑ دیا جائے ، فیصلہ آپ کے ضمیر کے ذمہ میں ہے ۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

وما علینا الا البلاغ

ترویحہ، حقیقت وروایت

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

آج کل یہ وبا عام ہوتی جارہی ہے کہ لوگ ان احکام سے مطمئن نہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو عطا فرمائے ہیں اور جس پر سلف سے خلف تک صحابہ کرامؓ، اولیاء عظام، علماء ومحدثین اور سلف صالحین عمل کرتے آرہے ہیں، انھیں اس بات کی ہوس وحرص ہوگئی ہے کہ دین کے ہر معاملہ میں خانہ ساز اور نام نہاد اضافے کئے جائیں ان کی نئی شکل وصورت بنائی جائے، اپنے منشاء اور خواہش کے سانچے میں ڈھال کر اس پر عمل کیا جائے، اس مزاج کے لوگوں کے نزدیک اسلاف صالحین ——جو کہ دین وشریعت کی حقیقت ومزاج کو ہم سے زیادہ سمجھے ہوئے، ذوق علم وشوقِ عمل، لیاقت واستعداد کی پختگی اور دیانت وتقویٰ کے کمال میں بلاشبہ وبلاتشبیہ ہم سے بہت فائق ولائق تھے—— کی اتباع اور ان پر اعتماد دقیانوسیت اور خلافِ شان تحقیق ہے، اور رسم ورواج کی ہاں میں ہاں ملانا، عوام الناس کے رنگ ڈھنگ اور تقاضہائے عادات سے مرعوب ہوکر ان کے آگے ہتھیار ڈال دینا، بڑی خوبی وکمال کی بات تصور کی جاتی ہے، یہ حضرات مسائل کو قرآن وحدیث سے رجوع کر کے ان کی روشنی میں عمل کرنے کے بجائے قرآن وحدیث کو عرف وعادات اور رواج وسماج کی روشنی میں حل کرنے کے خوگر ہوتے ہیں، بالفاظ دیگر قرآن وحدیث اور احکامِ شرع کا اپنے کو پابند بنانے کے بجائے خود قرآن وحدیث کو اپنا پابند بنانا چاہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
کس قدر بے توفیق فقیہانِ حرم ہوئے

میں سچ عرض کرتا ہوں جب سے امتِ مسلمہ اس مزاج کی خوگر ہوئی ہے، پورے دینِ اسلام کا حلیہ ونقشہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ امت کے ایک طبقہ نے تو اپنا مشغلہ ہی یہ بنا رکھا ہے کہ بدعات وخرافات اور رسم ورواج کی سرپرستی وحمایت دامے، درمے، قدمے، سخنے جس طرح بن پڑے کرتا رہے، حتیٰ کہ اس کے علماء ومشائخ تک اپنے علم اور عوام کے جہل کا استحصال کرتے ہوئے پورے تصنع اور تکلف کے ساتھ دوراز کار تاویلات اور بے تکے دلائل کے انبار ان بدعات کے شیوع وپھیلاؤ کی خدمت میں جھونکنے پر لگے ہوئے ہیں، اور امت کو بدعت کے عمیق وتاریک غار میں ڈھکیلتے جارہے ہیں، حالانکہ اللہ پاک نے ان پر قوم کی اصلاح وہدایت کی نازک وگراں بار ذمہ داری ڈالی تھی، جس کی مسئولیت کے احساس سے ذمہ دار علماء ومشائخ کانپ اٹھتے ہیں۔ **کما قال تعالیٰ : اِنَّمَا یَخْشیٰ اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ** [۱]

آپ نے جو رسالہ "مسائلِ شرعیہ" کے نام سے (اسلامک ریسرچ فاونڈیشن ویلور کا مطبوعہ) جواب لکھنے کیلئے بھیجا ہے اس کا اور ناشر کا نام دیکھ کر خیال ہوا تھا کہ شاید کوئی اہم تحقیقی مقالہ ہوگا مگر اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے مصداق ہے، اور کم از کم مجھے تو اس رسالہ پر" اسلامک ریسرچ فاونڈیشن" کا پروقار وبھاری بھرکم جملہ انتہائی بے تکا اور لفظِ ریسرچ (تحقیق) کی توہین معلوم ہوتا ہے، ناشرین نے "ریسرچ" تو کجا "ریڈنگ" کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے، جس کی مثالیں زیرِ بحث مسئلہ کی تحقیق سے نمٹنے کے بعد پیش کرونگا انشاءاللہ۔

---

[۱] سورۃ الفاطر:۵۵

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ احکامِ شرع کے ثبوت کیلئے فقہاء کرام نے جو اصول متعین فرمائے ہیں وہ چار ہیں، کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس۔[۱] پھر ان میں بھی اصلاً کتاب وسنت ہی ماخذ حقیقی ہیں اور اجماع وقیاس ان کے تابع اور مخصوص شرائط کیساتھ علی الترتیب اصل ثالث ورابع ہیں[۲] پس جو عمل ان اصولِ اربعہ میں سے کسی بھی اصل سے ثابت ہو، خواہ ہمیں ناپسند وناگوار ہی ہو وہ دین وشریعت ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی حکمی حیثیت قوت ثبوت کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اور جو عمل ان میں سے کسی اصل سے ثابت نہو وہ دین سے خارج ہے، خواہ فی نفسہ کتنا ہی بھلا کیوں نہ معلوم ہو۔ اس وضاحت کے بعد مسئلہ زیر بحث کو لیجئے، اس میں غور کیجئے، ہم پہلے نفسِ مسئلہ کی وضاحت کرتے ہیں پھر اس رسالہ کا جائزہ لیں گے۔

ا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ "ترویحہ" اور اس کا حکم کیا ہے؟

ترویحہ کا لغوی معنی مطلقاً بیٹھنے کے ہیں[۳] اور اصطلاحِ شرع میں نمازِ تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد والے وقفۂ استراحت پر اسکا اطلاق ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے خود نماز تراویح کا نام "تراویح" ہوا۔[۴]

شریعت میں اس کی اصل وحقیقت بس اسی قدر ہے کہ رمضان المبارک کا "قیامِ لیل" چونکہ اپنی خاص فضیلت کے اعتبار سے دوسرے ایام کے مقابلہ میں طویل ہونا چاہیے جس کے لئے شارع نے ایک خاص نماز امت کو مرحمت فرمائی اور اسمیں افضل اور مسنون یہی ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ تو کلام اللہ شریف پورا کیا جائے[۵] — اور آداب وشوق کی رعایت اگر رہے تو مزید طوالت قیام یعنی ایک سے زائد مرتبہ قرآن کا سننا سنانا بھی پسندیدہ ہے — اسلئے اس نماز میں مصلیوں کے

---

۱ قاموس الفقہ: ۱/۳۴۶، ۲ اصول فقہ: ۸ بحوالہ المدخل، ۳ المعجم الوسیط ص: ۳۸۰، ۴ الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۱/۳۴۲ ۵ ہدایہ ۱/۱۳۱

آرام وراحت کی رعایت کرتے ہوئے ہر چار رکعت پر ”وقفۂ استراحت“ رکھا گیا۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف بھی یہی تھا جیسا کہ امام بیہقیؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔[1] پھر صحابہ کرامؓ جنہوں نے اس عبادت کو باقاعدہ باجماعت جاری فرمایا تھا ان کا عمل بھی اسی طرح کا تھا کہ وہ چار رکعت پر کچھ آرام لے لیتے تھے[2]، جہاں تک اس ”ترویحہ“ کی مقدار کا معاملہ ہے تو فقہاء نے صراحت فرمادی ہے کہ اسکی مقدار اصلاً اس قدر رہے جس قدر وقت چار رکعات کے پڑھنے میں صرف ہوا، ہاں اگر مصلیوں کو اتنا وقت گراں محسوس ہو تو اس میں امام تخفیف بھی کرسکتا ہے۔[3]

یہاں تک تو متفق علیہ گفتگو تھی جس میں غالبًا کسی کو اختلاف نہ ہوگا، زیر بحث بات اس سے آگے کی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ”وقفۂ استراحت“ میں کیا عمل کیا جائے؟ اور یہی سوال ہمارے ہاں خواہ مخواہ انتشار وافتراق کا سبب بن گیا ہے، خواہ مخواہ اس لئے کہ اس کا جواب بالکل واضح اور ظاہر ہے جس میں نہ کچھ پیچیدگی ہے اور نہ ہی کچھ ابہام۔

اسلئے کہ فقہائے کرام اس موقع پر ہمیشہ سے یہی لکھتے آرہے ہیں کہ اس میں مصلی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے راحت وسکون حاصل کرے اور یہ اتنی صاف بے غبار بات ہے کہ ایک بچہ بھی اس کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب یہ وقفہ رکھا ہی استراحت کے لئے گیا ہے تو اس میں آرام لیا جانا چاہیے، خود بریلوی مکتبِ فکر کی مستند کتاب ”بہارِ شریعت“ میں بھی یہی مذکور ہے۔[4]

پھر آرام جس کو جس میں ملے، جس کا جی چاہے تلاوت کرے جس کا جی چاہے ذکر کرے، کوئی چاہے درودِ شریف پڑھے کوئی نفل پڑھنا چاہتا ہو نفل پڑھ لے،

---

[1] سبل السلام شرح بلوغ المرام: ۱۱/۲ [2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۳۴۳/۱ [3] الفتاوی العالمگیریۃ ۱۱۵/۱ [4] بہار شریعت

کوئی خاموش بیٹھ کر ذہنی سکون حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ کر لے تا کہ اگلی رکعتوں کے لئے نشاط و تازگی پیدا ہو جائے، غرض ہر مصلی مختار ہے کہ اپنے اختیار و پسند کا جائز اور مناسب انفرادی عمل منتخب کر لے اور اس پر عمل کرتا رہے، پھر جب چاہے اس کو تبدیل کر لے کسی اور عمل کو اختیار کر لے کسی عمل کا وہ شریعت کی جانب سے فرداً بھی پابند نہیں چہ جائیکہ کسی اجتماعی عمل کو اس پر مسلط کیا جائے۔[1] ہاں! کبھی کبھار بلا پابندی اگر کوئی عمل ہو جائے مثلاً وعظ کہہ دیا جائے تو خیر اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ وسیلۂ ہدایت ہے، اک فریضہ ہے، ذکر واذکار کی طرح نفل کام نہیں، تاہم اس کا بھی کسی کو پابند نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ خود جامعہ نظامیہ کے ریسرچ فاؤنڈیشن یعنی تحقیقاتی ادارہ "مجلس اشاعت العلوم" جسکے بانی ـــــ بانی جامعہ نظامیہ ہی ہیں ـــــ کی جانب سے آج سے اڑتالیس سال پہلے شائع شدہ کتاب "حمایت الصلوٰۃ" میں جو زیر بحث رسالہ کے انیس سال بعد طبع کی ہوئی ہے، ترویحہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "دو دو کر کے جب چار رکعت پڑھ لی جائیں تو چار رکعت کی مقدار آرام سے بیٹھ کر ذکرِ الٰہی درود شریف یا دعا وغیرہ پڑھنا چاہیے"[2] یعنی اسمیں بھی اس زمانہ کے رائج عمل کا کہیں ذکر نہیں کیا، اور یہ جو فقہاء نے نقل فرمایا ہے کہ اہل مکہ کا تعامل ترویحہ میں طواف کا اور اہل مدینہ کا نوافل کا ہے سو اس کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ تو یہ کہ یہ ان کا انفرادی عمل ہے، اگر چہ سب اپنے اپنے طور پر ایک عمل کریں تو دیکھنے میں اجتماعی ہی محسوس ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اہل مکہ کے طواف کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حرم شریف میں موجود آدمی کے لئے نوافل میں سب سے افضل عمل طواف کعبہ ہی ہے، اور پھر یہ نعمت اس جگہ کے علاوہ کہیں اور میسر بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ ایک ترویحات ہی میں کیا؟ نمازوں کے علاوہ ہر وقت یہاں طواف کیا جاتا رہتا ہے، اور اہلِ مدینہ کا نفلوں والا تعامل ابتداءً

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے امدادالاحکام: ۱/ ۵۳۹ [2] حمایت الصلوٰۃ: ۱/ ۲۷۳

امام مالکؒ کے مسلک کی وجہ سے رہا ہوگا، کیونکہ ان کے ہاں تراویح کی چھتیس رکعتیں مسنون ہیں[۱]۔بیس مع الجماعت اورسولہ بلا جماعت (یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے اجتہاد سے یہ اضافہ فرمایا تھا) چنانچہ اب جبکہ وہاں مالکیوں کی کثرت نہیں رہی بلکہ ہر مسلک کے مسلمان موجود رہتے ہیں تو ترویحہ میں اسکی پابندی بھی اس طرح قائم نہیں رہی۔لوگ دوسرے اعمال کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں،اورسب سے بڑی بات یہ ہے کہ انکےاس طرز عمل سے کسی فرد کی آزادی متاثر نہیں ہوتی، پھران سب تفصیلات کے صرف نظر ان کا یہ تعامل بحیثیت حنفی المسلک ہونے کے ہمارے لئے حجت بھی نہیں[۲]۔پس اہل مکہ یا اہل مدینہ کے تعامل پر قیاس کر کے تسبیحات اور خلفاءِ راشدین کے نام ترویحوں میں اجتماعاً پکارنے کے مروجہ نامعقول عمل کے جواز کا فتویٰ دینا عقل ودیانت کا خون کرنا ہے۔

۲۔دوسرا مسئلہ ہے خلفاءراشدین کے نام پکارنا:

تمام صحابہ کرامؓ محترم اور مکرم ہیں، ان میں خلفاء راشدین بلا شبہ ایک عظیم مرتبہ کے حامل ہیں ان کے نام بھی مبارک ہیں کام بھی،لیکن ان کے اسماء گرامی کا اسطرح ورد کرنا محض لغو اور بالکل بے معنیٰ ہے،شریعت نے ان کے اتباع کی تعلیم تو دی ہے لیکن ان کے اسماءِ مبارکہ کے نعرے لگانے کا کوئی تصور امت کو نہیں دیا۔اس عمل کے ثبوت کے لئے ایک بات زیر بحث رسالہ میں یہ کہی گئی ہے کہ"اس سے ترتیب خلافتِ راشدہ کا اظہار اور منکرین ترتیب کا رد مقصود ہے"[۳] اس معصومیت اور بھولے پن کے قربان! کیسا بے تکا استدلال پیش کیا گیا ہے،آپ غور فرمائیں پہلے تو خود ان پکارنے والوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں،دوسرے جن کا رد کرنا چاہتے ہیں ان میں سے وہاں کوئی موجود ہی نہیں ہوتا،تو اس اظہار کی ضرورت ہی کیا پیش آئی، پھر آپ ہزار بار اس ترتیب کا اظہار فرمائیں اس سے کسی کو اختلاف

[۱] درس ترمذی:۶۵۲/۲ بحوالہ ہدایۃ المجتہد [۲] امدادالاحکام:۵۳۹/۱ [۳] دیکھئے رسالہ مسائل شرعیہ ص:۷

نہیں ہے، اختلاف اس میں پیدا ہو رہا ہے کہ اسے نمازِ تراویح کا جز و کس بنیاد پر اور کس دلیلِ شرعی سے بنایا گیا؟۔ دوسری دلیل **عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة** سے پیش کر کے اسے موجبِ برکت وثواب قرار دیا ہے۔[۱] حیرت ہوتی ہے کہ اس روایت کے ذریعہ اس کا ثبوت کیسے ہو گیا کہ ترویحات خمسہ میں خلفاءِ راشدین کے اسماء گرامی پکارے جائیں، حد یہ ہیکہ "ذکر صالحین" کا مفہوم تک مدنظر نہیں رکھا گیا۔ صالحین میں بلاشبہ خلفاءِ راشدین سب سے اول درجہ رکھتے ہیں مگر ذرا سوچئے کہ ان کے ذکر سے مراد ان کے احوال، مجاہدات، ایثار وقربانی وغیرہ کا تذکرہ کر کے اس سے عبرت حاصل کرنا ہے یا انکا "نام جپنا" مقصود ہے؟ اور اگر ان حضرات کے نزدیک نام کے نعرے ہی مقصود ہیں تو ایک خلفاء راشدین ہی کی کیا خصوصیت ہے، بدل بدل کر دوسرے صالحین کے نام بھی لئے جانے چاہئے کیا یہ حضرات انکے علاوہ کسی کو صالح نہیں مانتے ؟ اصل بات بس اس قدر ہے کہ یہ حضرات اس "بدعت" کی کسی نہ کسی طرح حفاظت چاہتے ہیں! حدیث پاک میں آیا ہے کہ "قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت نہ سمجھنے لگیں، اور جب کوئی بدعت کہیں چھوٹتی ہوئی دیکھیں تو واویلا مچانے لگیں کہ سنت چھوٹ رہی ہے،[۲] اور سنتیں چھوٹنے کا کوئی غم نہ کریں۔ (اعاذنا اللہ منہ)

۳۔ تیسرا مسئلہ ہر ترویحہ کے بعد دعا کرنا:

دعا عبادت کا مغز ہے،[۳] جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر خفا ہوتے ہیں،[۴] اور بیشمار فضائل ہیں اس مبارک عمل کے، لیکن شریعت میں دعا کی عمومی تعلیم تو ہر ہر کام کے وقت دی گئی ہے اور دعا کے خاص طریقے خاص موقعوں پر مشروع ہوئے ہیں، مثلاً نمازوں کے بعد دعا کی قبولیت کی زیادہ امید ہے اسلئے اس وقت سب لوگ دعا کا اہتمام کرتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے، لیکن دو باتیں اس جگہ سمجھنے کی ہیں۔

---

[۱] دیکھئے رسالہ مسائل شرعیہ ص:۷ [۲] دیکھئے اقوال سلف:۱۵ [۳] مشکوٰۃ:۲/۵ [۴] مشکوٰۃ:۲/۶

(الف) تراویح مکمل بیس رکعات مشروع ہوئی ہے، ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے،[۱] اور پڑھی بھی بیس ہی جاتی ہیں، اس لئے فقہاء نے اختتامِ تراویح پر دعا کو مستحب قرار دیا،[۲] ہر چار رکعت پر دعا کا ذکر کتبِ فقہ میں نہیں ملتا، اس لئے اس میں مصلیوں کو اختیار ہونا چاہئے کہ ترویحہ میں دوسرے اعمال کی طرح اپنے لئے خواہ دعا کو پسند کرلیں، مگر یہاں سوال اس کی عادت بنا لینے اور عملاً ایک مخصوص ڈھنگ سے لازم کر لینے کا ہے، اور اس کے لئے ثبوت چاہیے، جو ندارد ہے، صاحب فتویٰ نے اس کے ثبوت کے لئے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ ممانعت مصرح نہیں ہے،[۳] ہم کہتے ہیں کہ ممانعت اگر مصرح نہیں ہے تو استحباب بھی تو منقول نہیں ہے جبکہ انہوں نے استحباب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(ب) عام طور سے یہاں کے مسلمان حنفی ہیں اور احناف کے ہاں دعا میں "اخفا" افضل ہے،[۴] حتیٰ کہ نماز میں سورہ فاتحہ کی آخری آیت و لا الضالین کے بعد آمین کے بالجہر یا بالسر کہنے میں جو اختلاف ہے اس میں فقہاءِ احناف لانہ دعاء کہہ کر اس کے سراً ہونے کو راجح قرار دیتے ہیں، خود قرآن مجید میں اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّ خُفْيَةً[۵] فرمایا گیا ہے، یعنی اپنے پروردگار کو عاجزی وتضرع کیساتھ چپکے چپکے پکارا کرو اور حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر اس طرح فرمایا اِذْ نَادىٰ رَبَّهٗ نِدَاءً خَفِيّاً[۶] اور وہ وقت قابلِ ذکر ہے جب کہ انہوں نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا تھا، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں بعض صحابہؓ کو زور سے تکبیر پکارتے ہوئے سن کر فرمایا تھا کہ "لوگو! اپنے اوپر نرمی سے کام لو کیونکہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں سنا رہے ہو"۔[۷] معلوم ہوا کہ دعا کا ادب یہی ہے کہ اکثر تو چپکے سے ہی کرنی چاہئے۔ تعلیماً کبھی کبھی جہر سے کی جائے تو البتہ حرج کی بات

[۱] درس ترمذی:۲/۶۵۲ [۲] فتاویٰ محمودیہ [۳] مسائل شرعیہ:۱۱ [۴] فتاویٰ محمودیہ:۲/۳۵۹ [۵] الاعراف:۵۵ [۶] مریم:۳ [۷] مشکوٰۃ:۲/۶۲

نہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں ابن جریجؒ اور ابوبکر جصاصؒ کے حوالہ سے سورۂ اعراف آیت ۵۵ کے تحت نقل کیا ہے کہ دعا آہستہ کرنا افضل ہے، اور بآواز بلند مکروہ ہے[۱] اور جہاں تک حاکم کی روایت[۲] کا تعلق ہے ـــــ جو صاحبِ فتاویٰ نے نقل کی ہے ـــــ وہ اصولی اعتبار سے اس موقعہ پر حجت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اس موقع پر اس کا ذکر ضرور فرماتے، نیز اس روایت کے مقابلہ میں دوسری روایات بلکہ آیاتِ قرآنیہ موجود ہیں، اس زمانے میں تو اکثر ائمہ حضرات تک ان پڑھی جانے والی دعاؤں کے معنی سے بے خبر رہتے ہیں، مصلیوں کا کیا کہنا، یہ تو اللہ معاف فرمائے اکثر جگہوں پر بس ایک تماشہ سا ہو گیا ہے کہ امام جھوم جھوم کر اور راگیں نکال کر کچھ دعاؤں کی تلاوت کر دیتے ہیں اور مقتدی آمین پڑھتے رہتے ہیں، نہ انھیں کچھ خبر نہ انھیں کچھ احساس، کہیں دعا (اللہ کو حاجت برآری کے لئے پکارنا) ایسی ہوا کرتی ہو؟

حدیث پاک میں آتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ غفلت و لاپرواہی سے کی جانے والی دعاؤں کو قبول نہیں فرماتا"۔[۳] ایسی رسمی دعاؤں سے تو کچھ تلاوت کر لینا یا ذکر کر لینا بہتر ہیکہ اسمیں اللہ پاک کا کلام پڑھنے اور ان کا نام لینے کا ثواب تو مل جاتا ہے۔ ہماری اس تفصیل کا حاصل یہ نکلا کہ ہر ترویحہ میں دعا کا اہتمام ثابت نہیں، ختم نماز کے بعد منقول و معمول ہے اور موجودہ رواجی طریقہ تو فرض نمازوں کے بعد بھی قابل اصلاح ہے۔[۴]

۴۔ چوتھا مسئلہ نمازِ تراویح کے بعد مصافحہ کرنا:

مصافحہ ملاقات کے وقت بالاتفاق مسنون ہے اور رخصت کے وقت باختلاف جائز ہے،[۵] پھر اس میں وسعت و گنجائش بھی ہے کہ ہر کسی ملاقات پر کر لیا

[۱] معارف القرآن:۳/۵۷۶ [۲] مسائل شرعیہ:۱۱ [۳] ترمذی کذافی المشکوٰۃ:۲/۷ [۴] معارف القرآن:۳/۵۷۶ [۵] امداد الفتاویٰ:۴/۲۰۸

جائے ، لیکن نمازوں کے بعد ملاقات کی کوئی وجہ نہیں ہے، اور اگر مسجد سے باہر نکل کر آپس میں ایک دوسرے سے مل کر ملاقات ومصافحہ کر لیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔ اعتراض صرف اس پر ہے کہ نمازوں کے فوراً بعد (خواہ فجر وعصر یا تراویح وعیدین ہو) جس طرح بالتزام مصافحہ کا رواج ہے، وہ دیکھنے والے کو بظاہر نماز کا ایک جزو ورکن محسوس ہوتا ہے اور یہ نماز کی ہیئت میں ایک طرح کی زیادتی واضافہ ہے جو از روئے اصول شرعیہ "بدعت" قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ مصافحہ سلام کا تکملہ ہے، جب سلام ہی نہیں تو تکملہ کے کیا معنی؟ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم سلام بھی کرتے ہیں مصافحہ بھی، تب بھی یہی کہا جائیگا کہ سلام بھی ملاقات کے آداب اسلامی میں سے ہے اور اس وقت ملاقات تو نہیں ہوتی۔ اور ملاقات اکثر نماز سے پہلے ہو چکی ہوتی ہے، نیز اس رواج کے عادی لوگوں کے طرزِ عمل سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ نمازوں کے بعد مصافحہ بر بناء ملاقات نہیں کرتے بلکہ لاعلمی سے اس کو اس وقت کا عملِ شرعی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ دو آدمی جو ساتھ گھر سے چلے، ساتھ ہی مسجد میں آکر نماز میں شریک ہوئے وہ بھی بعد ختم نماز کے آپس میں مصافحہ کرتے ہیں جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اسے ان نمازوں ہی سے متعلق ایک مستحب عمل سمجھتے ہیں جس کا غلط اور بے بنیاد ہونا بالکل واضح اور ظاہر ہے۔ اب آپ ہی سوچیں کہ علماء کرام کا کام ایسے غلط اعمال وعادات کی اصلاح کرنا ہے یا انکی عرف وعادت کا بہانہ بنا کر غیر ضروری تاویلات کے ذریعہ حمایت کرنا؟

بنی اسرائیل کے علماء میں یہی کوتاہی تو تھی کہ وہ عوام کے مزاج اور سماج کی عادتوں کو احکامِ الٰہی کی حفاظت پر مقدم رکھا کرتے تھے آج بھی ایک طبقہ یہی کچھ کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نصیب فرمائے آمین

استدراک بررسالہ ''مسائل شرعیہ''

اسکے بعد آیئے کہ اب رسالہ ''مسائلِ شرعیہ'' مطبوعہ ''اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن ویلور'' کا سرسری جائزہ لیتے ہیں، ہمارے گذشتہ مضمون کے دوران بھی اس میں سے بعض جزئیات کا ذکر آچکا ہے، اور بعض کو نا قابلِ التفات ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا گیا ہے۔ چند امور درج ذیل ہیں

ا۔ اس رسالہ پر ناشر کی جانب سے کوئی وضاحت نہیں ہے، بلکہ مرحوم بادشاہ حسینی صاحب کے طبع اول کے وقت مرقومہ کلمات ہی سے رسالہ شروع ہوتا ہے، موصوف مرحوم اس مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا حکم ملا ہے، اور ''بنیان مرصوص'' ان کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن.....

''اس اتحاد و اتفاق میں ان متشددین کی طرف سے رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہے جن کے ہاں کفر و شرک اور بدعت کی مشین گن تیار ہے'' [1]

چنانچہ اسی لئے وہ جامعہ نظامیہ کے اس فتوے کو شائع کر رہے ہیں، سبحان اللہ! ایک طرف اتحاد و اتفاق کے گُن گائے جا رہے ہیں، اور تشدد پسندوں سے اتفاق کے عمل میں خطرات محسوس کر رہے ہیں، دوسری طرف ان ''مسائل'' پر جن کی شرعی حیثیت کو وہ خود اوسط سائز کے چودہ صفحات سیاہ کر کے بھی ''جائز'' سے بڑھ کر ثابت نہ کر سکے، عوام الناس کو تشدد و پختگی کی تعلیم فرما رہے ہیں، جبکہ ان مسائل کا اختلاف انکے نزدیک اتحاد کیلئے خطرہ ہے، اس کا صاف سیدھا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ اتحاد بس اس میں پوشیدہ ہے کہ سب مسلمان خواہی نہ خواہی اور جا بے جا ان کے فتاوی کی پیروی کریں جبکہ یہ مطالبہ عقلاً و نقلاً کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ یہ تو رہی تشدد کی بات، اور کفر و شرک و بدعت کی مشین گن کہاں تیار رہتی ہے

[1] ص:۲

اس کو جاننے کے لئے ہم کچھ کہنے کے بجائے ناظرین سے خواہش کریں گے کہ وہ دونوں طبقوں یعنی علماء دیوبند اور علماء بریلوی و جامعہ نظامیہ کے لٹریچر کا ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کو خود ہی پتہ چل جائیگا کا کہ تکفیر کی گرم بازاری کس کا مشغلہ حیات ہے؟ یا دونوں طبقوں کے جلسوں میں شرکت فرما کر دیکھ لیجئے کہ کون کفر کے نام کو بھی پسند نہیں کرتا اور کون مزے لے لے کر اور اچھل اچھل کر بڑے بڑے علماء و مشائخ کی تکفیر و توہین و تحقیر کا فریضہ انجام دیتا ہے، اور اگر اتنی زحمت بھی نہیں ہو سکتی ہے تو ذرا ۱۲۵/ سالہ جشن جامعہ نظامیہ کے موقع پر ان کے ہاں جو کچھ پیش آیا اور کس طرح صرف علامہ یوسف القرضاوی کو بلانے کے جرم پر تکفیر کے مشین گن اپنوں کی طرف سے اپنوں پر اٹھائے گئے اور کس طرح اخباروں میں رسوا کن بیانات جاری کئے گئے کس طرح سارے شہر میں پوسٹر لگائے گئے، اسی کو ملاحظہ فرمالیں تو فیصلہ خود بخود ہو جائے گا کہ کفر کی مشین گن تو کیا توپ خانہ انہی کے پاس تیار رہتا ہے۔

۲۔ نور مبین کا لفظ دین کی اصطلاح میں قرآن مجید یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استعمال ہوا ہے، لیکن رسالہ زیر تبصرہ میں اس لفظ کا استعمال اپنے نام نہاد فتویٰ کے لئے کیا گیا ہے، اگر یہی حرکت کوئی دیوبندی کر بیٹھتا تو اس کے حق میں علماء نظامیہ تکفیر سے کم کا فیصلہ تو ہرگز نہ کرتے، لیکن ان کی دیدہ دلیری کو کون پوچھ سکتا ہے؟ ملاحظہ فرماویں اسی مقدمہ میں ہے۔

"اور وہ (عامۃ المسلمین) اس "نور مبین" کی روشنی میں سیدھی راہ پر خود بھی چلیں اور دوسروں کو بھی لے چلیں"[۱]

آپ اس جرأتِ بے جا کا اندازہ فرمائیں کہ ایک عمل جسے کھینچ تان کر بمشکل تمام اسقدر ثابت کیا گیا کہ "بے شک وشبہ جائز ہے، ہرگز معصیت نہیں" جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عمل نہ فرض نہ واجب نہ سنت نہ مستحب و مستحسن۔ بس یہ کہ

---

[۱] ص:۲

معصیت نہیں، یعنی جائز ہے، اس عمل کو نور مبین قرار دیکر پوری امت کو خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کی تلقین کی جارہی ہے۔

ٹھنڈے کلیجے سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس "بے گناہی" کو "نور مبین" اور "صراط مستقیم" قرار دیکر قوم سے کیسا فریب کیا ہے، پورے رسالہ کو غور سے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سوائے ان بدعات پر قائم رہنے اور روش آبا کو نہ چھوڑنے کی تلقین کے ذرا بھی علمی مواد نہیں ہے، یعنی خواہ حق کتنا ہی واضح ہو مروجہ اعمال کو ترک نہ کیا جائے۔ **فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلاَّ الضَّلاَلِ**

۳۔ مقدمہ کے بعد سوالنامہ ہے، جس میں ان چار اعمال کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے جن کا اصل جواب پچھلے صفحات میں گذر چکا، مفتی صاحب جامعہ نظامیہ جواب کی ابتداء میں رقمطراز ہیں:

"دو رکعت پڑھ کر دو بار یا تین بار یا سو بار یا ہزار بار یا جس قدر چاہے تسبیح پڑھیں یا خاموش بیٹھیں کوئی گناہ و معصیت نہیں ہے کہ کسی کتاب فقہ میں اس کے حرام و گناہ و معصیت ہونے کی صراحت نہیں ہے" [۱]

عجیب بات ہے نماز تراویح جبکہ ایک عبادت مشروعہ ہے تو اس کا طریقِ ادا بھی مشروع ہوگا، چنانچہ فقہاء کرام سے جو طریقہ نماز تراویح کا منقول ہے اس میں کہیں بھی دو رکعت کے بعد وقفہ کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں چار رکعت کے بعد منقول و متوارث ہے عہدِ صحابہ کرامؓ سے تا ہنوز اسی پر عمل ہے، مگر فتویٰ میں نہ صرف وقفہ کو ثابت کیا جارہا ہے بلکہ اس وقفہ کا ایک ہزار بار یا اس سے بھی زیادہ تسبیح کے بقدر ہو سکنے کا دعویٰ کیا جارہا ہے، سبحان اللہ! "سکنے" میں تو بہت گنجائش ہے، سوال یہ ہے کہ مسنون و منقول طریقہ کیا ہے؟ جبکہ اس کا جواب ندارد! کیا یہی افتاء کا اصول ہوتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کوئی آپ سے پوچھے کھانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

[۱] ص:۴

اس کے جواب میں آپ بجائے طریق مسنون بتلانے کے یوں کہنے لگیں کہ کھڑے ہو کر کھانا ہرگز حرام و معصیت نہیں ہے۔ کسی کتاب فقہ میں اس کے حرام ہونے کی صراحت نہیں، ایسی بے تکی اور بے جوڑ باتوں کو اس رسالہ میں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ اتنی بڑی جامعہ کے دارالافتاء سے صادر ہوا ہے یا فرضاً اس کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے، مگر ہمارے سامنے اور بھی شواہد و توابع ہیں جن کی وجہ سے ہمارا شبہ زائل ہو جاتا ہے کیونکہ ان حضرات سے کچھ مستبعد نہیں ہے کہ ایسا فتویٰ دیں، آخر ایسے ہی لوگوں کے دم خم سے تو ایوان بدعت میں ابھی دم باقی ہے۔

۴۔ ترویحات میں خلفاء اربعہ کے اسماء گرامی پکارنے کی رسم کے لئے خطبات جمعہ و عیدین میں خلفاء راشدین کے ذکر اور سلاطین کے لئے دعا کے معمول پر استدلال کرتے ہوئے صاحبِ فتویٰ تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح جمعہ و عیدین میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر مستحسن ہے اور اس پر توارث جاری ہے۔ (یہ اعمال بھی جائز ہیں)"[1]

یہاں بھی وہی قیاس مع الفارق کی الجھن ہے، کیونکہ عالمگیری کی پیش کردہ عبارت میں خطبہ کے دوران خلفاء کے ذکر اور سلاطین کے لئے دعا کو **مستحسن بذالک جری التوارث** فرمایا گیا ہے اور مسئلہ زیر بحث کو فقہاء کرامؒ نے نہ مستحسن قرار دیا ہے نہ یہ عمل متوارث ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک متوارث اور مخترع میں کوئی فرق ہی نہیں۔

۵۔ یہی حال "ہدایہ" کی عبارت **ویستحب فی الجلوس بین الترویحتین .... لعادة اهل الحرمین** سے استدلال کا ہے، یعنی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جب "صاحبِ ہدایہ" نے اہل حرمین کی عادت کے حوالہ سے ترویحات میں جلوس کو مستحب کہا ہے تو اہلِ دکن کی عادت کی وجہ سے ان اعمال کو ہم

[1] ص:۴

جائز کیوں نہیں کہہ سکتے؟ ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ استدلال کس حد تک صحیح ہوسکتا ہے، موٹی سی بات ہے کہ اگر ہر جگہ کے رہنے والوں کی عادت کا عبادات میں اعتبار کیا جانے لگے تو اس دین کی شکل ہی مسخ ہوکر رہ جائے گی، اور اسلامی عبادات کا امتیاز ختم ہوجائیگا۔

۶۔اسکے بعد" عرف وعادت" کے شرع میں معتبر ہونے کو ثابت کیا گیا ہے، اوراس کیلئے" الاشباہ والنظائر" کی دوعبارات پیش کی گئی ہیں جن سے فقہاء کے ہاں عرف وعادت کا معتبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ہمیں بھی فی نفسہ اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے، تاہم اسکے ذریعہ ثبوت حکم کی کچھ شرائط ہیں نیز کس قسم کے احکام میں اس کا اعتبار کیا جاتا ہے اور کس میں نہیں اس کی طویل الذیل بحث ہے، ہم اس کی تفصیل میں گئے بغیر اس ایک شرط سے ان کے اس استدلال کو باطل قرار دیں گے جو خود اس رسالہ میں بھی "حاشیہ اشباہ" سے نقل کی گئی ہے، **المراد بالعرف عرف المؤ منین، مالم یخالف قواعد الشرع فان خالف فلا اعتداد به اصلاً**۔

اس عبارت میں عرف وعادت کے معتبر للاحکام ہونے کے واسطے دوشرطیں صراحۃً موجود ہیں، پہلی یہ کہ عرف "المؤمنین" کا ہو، یعنی مومنین کاملین کا، اسلئے کہ اصولاً جب کوئی قرینہ موجود نہو تو مطلق کا اطلاق فرد کامل پر ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ عادت قواعدِ شرع کے خلاف نہو، اب مسئلہ زیر تبصرہ میں غور فرمالیں، کہ مذکورہ اعمال کی عادت اولاً تو مخصوص علاقوں میں پائی جاتی ہے ہر جگہ نہیں، پھر وہاں بھی ان اعمال پر اصرار میں عوام الناس اوران پڑھ لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے، جو سال بھر بے نمازی ہوتے ہیں اور رمضان شریف میں مساجد میں جمع ہوجاتے ہیں، تلفظ سے تک اندازہ ہوتا ہے کہ دین سے کس قدر کورے ہیں، نیز راگ گانے کا لہجہ

اختیار کرتے ہیں، اسی طرح انبیاء کرام کو مخاطب کر کے صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں، اور ان کی حاضری کا اعتقاد رکھتے ہیں، وہ مخصوص الفاظ جہالت کی وجہ سے اکثر صحیح پڑھ نہیں پاتے ہیں تو ہنسی مذاق بھی ہونے لگتا ہے، جو لاؤڈ اسپیکر سے ہر جگہ سنائی دیتا ہے، اور لاؤڈ اسپیکر میں چلا چلا کے اور گلا پھاڑ پھاڑ کے چند انبیاء پر سلام پڑھے جاتے ہیں جسکی کوئی اصل شرع میں نہیں، غرض بے شمار امور قواعد شرع کی مخالفت کے پائے جاتے ہیں جو اس عادت کے غیر معتبر ہونے کے لئے کافی ہیں۔

۷۔ایک استدلال اس روایت سے بھی کیا جاتا ہے کہ۔**ما راه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن** یعنی جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔اس سلسلہ میں اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ "**المسلمون**" اس سے عوام مسلمین مراد نہیں ہو سکتے، ورنہ عوام الناس آج کس چیز کو اچھا نہیں سمجھتے؟ پھر کیا یہ علماء نظامیہ اس روایت کی بنیاد پر عوام الناس کی تمام پسندیدہ عادتوں کو دین میں شامل کرنے کی وکالت فرمائیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ اسکا صحیح مفہوم سمجھا نہیں گیا یا سمجھ کر تجاہل برتا گیا، اس حدیث کی شرح میں ہم خود کچھ لکھنے کے بجائے محدث دکن ابوالحسنات عبداللہ شاہ صاحبؒ کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کر دینے کو کافی سمجھتے ہیں، حضرتؒ اپنی مشہور تصنیف "زجاجۃ المصابیح" پر اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد حاشیہ میں ارقام فرماتے ہیں:

" حدیث مذکور میں "المسلمین" سے صرف صحابہ کرامؓ مراد ہیں یا پھر حضرات مجتہدین، کیونکہ یہی حضرات صفات اسلام میں کامل ہیں (عام مسلمان مراد نہیں) کیونکہ اصول ہے کہ مطلق کا اطلاق عدم قرینہ کی صورت میں فرد کامل پر ہوتا ہے، اور وہ فرد کامل مجتہد ہے، پس حدیث کے معنی ہونگے، "صحابہ کرامؓ" یا "اہل اجتہاد" جس عمل کو اچھا سمجھیں وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا سمجھیں وہ برا ہے"۔

۸۔تراویح کے اختتام پر انبیاء علیہ السلام پر درود وسلام کا جواز ثابت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

"جب کہ ہر ادنیٰ مسلمان کو سلام کرنا جائز ہے قبل تراویح بھی اور بعد تراویح بھی، تو پھر انبیاء علیھم السلام پر بعد تراویح سلام کرنے کی کس حدیث سے ممانعت ثابت ہوگی؟ معترض کا اعتراض باطل ہے"۔ [1]

ناطقہ سر بگریباں ہے اور خرد سر پیٹ رہی ہے کہ ان کو ہفوات کہا جائے یا استدلالات؟ ناظرین! مفتی صاحب تو اسکے ثبوت کے چکر میں نہ معلوم کیا کیا لکھ گئے ہیں، آپ تو کم از کم عقل خداداد کا استعمال کریں کہ یہ سلام ہے یا اذان؟ انبیاء علیھم السلام پر صلاۃ وسلام کی بحث گھسیٹ کے عوام الناس کے جذبات واحساسات کا استحصال کرنا بہت آسان ہے لیکن نفس مسئلہ کا ثبوت کھیل نہیں۔ ذرا رمضان المبارک کی راتوں میں کسی مسجد میں جا کر تراویح کے بعد دیکھ لیں کہ کیا ہوتا ہے، غضب ہے کہیں انبیاء علیھم السلام اور خصوصاً سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سلام یوں گذارا جاتا ہے؟ اگر ان کے عقیدہ میں انبیاء علیھم السلام خود سنتے ہیں تو اس صورت میں تو یہ سخت بدتمیزی کا طریقۂ سلام ہے۔ قرآن کہتا ہے: **لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ** ذرا کسی بزرگ کے گھر پر سلام کا یہ ہنگامہ کھڑا کر کے دیکھئے، پھر ادب اور بے ادبی کا فرق خود بخود سمجھ میں آجائیگا۔ اور اگر صلوٰۃ وسلام بطور دعا وذکر کے ہے تو قرآن کہتا ہے: **لَاتَجْهَرْ بِصَلٰوتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا** یعنی آپ اپنی نماز میں زیادہ جہر کیجئے اور نہ بہت اخفاء بلکہ درمیانی آواز اختیار کیجئے، ان سب سے بڑھ کر اسمیں جیسی بدتمیزی اور دل لگی ہوتی ہے وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ گھر بیٹھے سنائی دیتی ہے، آخر ادب احترام اور رعایت احکام بھی کوئی چیز ہے یا آپ کا حسن کرشمہ ساز جو کرے وہی دین ہے؟۔

[1] ص:۱۲

۹۔آخر میں ایک بات رہ جاتی ہے کہ مکہ مکرمہ کے چاروں مسالک کے مفتیان کرام نے ان اعمال کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، لہذا یہ اعمال بالاتفاق درست ہیں رسالہ میں اس کے لئے ایک سوالنامہ اور ایک جواب عربی میں نقل کیا گیا ہے، یہ سوال جواب کس کتاب سے نقل کیا ہے اس کا حوالہ نہیں لکھا گیا ہے۔(ویسے کسی بھی عبارت کا پورے رسالہ میں کوئی حوالہ نہیں ہے)۔اگر حوالہ ہوتا تو ہم مراجعت کر کے اس پر کچھ کہہ سکتے تھے، اس لئے اس کی صداقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیتے ہیں۔

اور جو صحیح مسئلہ ہے وہ ذیل میں درج کرتے ہیں، اہل علم حضرات بھی کتب فقہ سے رجوع فرما سکتے ہیں۔علامہ جزیری "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" میں لکھتے ہیں: تراویح پڑھنے والے کے لئے ہر چار رکعت پر ستانے کے لئے بیٹھنا مستحب ہے اور اس بیٹھنے میں کیا کرے اسکی تفصیل ذیل میں درج ہے:

☆ احناف کے نزدیک: نمازی کو اختیار ہے کہ ترویحہ جو (انفراداً) کوئی وظیفہ یا کلمہ طیبہ پڑھتا رہے یا خاموش بیٹھا رہے۔

☆ مالکیہ کے نزدیک: قیام طویل ہوا ہے تو ترویحہ میں بیٹھے ورنہ بیٹھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

☆ شوافع کے نزدیک: صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی اتباع میں بیٹھ تو جائے لیکن اس میں کوئی دعا یا ذکر منقول نہیں۔

☆ حنابلہ کے نزدیک: ترویحہ میں دعا مانگنا خلاف اولیٰ ہے، نماز بھی نہ پڑھے صرف آرام کے لئے جلسہ کرے۔

کاش کہ یہ حضرات اپنی صلاحیتیں بجائے ان غیر ضروری امور میں کھپانے کے امت کو فرائض واحکام کا پابند بنانے اور انسانیت کو راہ ہدایت دکھانے میں صرف کرتے............کاش!............کاش!!

قربانی......تعارف،فضائل و مسائل

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد !

اسلام کی تعلیمات واحکامات میں سے ایک حکم قربانی کا بھی ہے اور یہ قربانی کا عمل ہر زمانے اور ہر علاقے میں اسلامی شعار کی حیثیت سے ایک امتیازی مقام کا حامل رہا ہے، چنانچہ ساری دنیا میں لاکھوں مسلمان ایامِ نحر میں بڑے جوش وخروش اور جذبہ اطاعت کے ساتھ قربانی کا فریضہ ادا کرتے اور اس پر اپنی دولت وکمائی خرچ کرکے حد درجہ خوش ہوتے ہیں **فللّٰہ الحمد**

قربانی درحقیقت ، اللہ کے اُولو العزم پیغمبر سیدنا حضرت ابراھیم علیہ السلام کے ایثار و وفا، اور سیدنا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تسلیم ورضا کی یادگار ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے: **وَفَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ وَّتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ سَلَامٌ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ** یعنی اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ (اسمٰعیل علیہ السلام) کے عوض دے دیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات اُن کے لئے رہنے دی، سلام ہو ابراھیمؑ پر۔ نیز سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے قربانی کی حقیقت ونسبت کے بارے میں پوچھنے پر فرمایا: ’’**سنة ابیکم ابراھیم علیه السلام**‘‘ تمہارے باپ ابراھیم علیہ السلام کی سنت ویادگار ہے۔

قربانی کا یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بہت سی کتابوں میں مذکور ہے، مختصراً یہ کہ سیدنا حضرت ابراھیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ (جو انھیں بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد چھیاسی

برس کی عمر میں عطا کئے گئے تھے) کو ذبح فرما رہے ہیں ، اسی طرح تین دن تک یہ خواب دیکھتے رہے، تیسری مرتبہ صبح کو آپ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو بلا کر اس خواب کا ذکر خود ان کے سامنے کیا تا کہ ان کی تسلیم و اطاعت کا اندازہ فرما سکیں ، اور پھر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا: فَانْظُرْ مَاذَا تَرىٰ اسمٰعیل! کہو تمہارا کا خیال ہے؟ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے ذبح کے متعلق اشارۂ غیبی پاتے ہی شانِ تسلیم و رضاء کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اور نہایت اطمینان و ایقان کے ساتھ اپنے والد ماجد کو یہ بے مثال جواب دیا: یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْشَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ اُسے کر دیجئے، انشاءاللہ آپ مجھے سہار کرنے والوں میں سے پائیں گے ۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

چنانچہ حضرت ابراھیم علیہ السلام انھیں لے کر منیٰ تشریف لے گئے اور حکمِ رب کی تعمیل کرنی چاہی ، منجانب اللہ ایسا ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح نہ فرما سکے، پھر ان کے بدلے حق تعالیٰ نے آسمان سے نہایت فربہ دُنبہ بھیجا جو بجائے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کر دیا گیا، حق تعالیٰ کو باپ بیٹے کی فرمانبرداری کا یہ عمل اس قدر پسند آیا کہ ان کے بعد کی تمام شریعتوں میں اس کو جاری کر دیا ، اور اب شریعتِ محمدی میں بھی اسے مشروع کر کے اپنے خلیل کی اس سنت کے قیامت تک باقی رہنے کا اہتمام فرما دیا، چنانچہ ارشاد ہے: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ اے ابراھیم! تم نے خواب سچا کر دکھایا، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربانی کی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، مثلاً: ایامِ قربانی میں حق تعالیٰ کو نبی آدم کا کوئی عمل قربانی سے زیادہ

پسند نہیں ہے۔ جو قربانی کی وسعت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عید گاہ کو بھی نہ آئے ! نیز حضرات صحابہ کرامؓ نے اس کے اجر کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا: ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے، صحابہؓ نے پوچھا کہ اُون کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: اُون کے بھی ہر بال کے عوض ایک نیکی ملے گی۔ اس لئے یہ قربانی بڑی فضیلت کی چیز ہے اور اس قابل ہے کہ جن پر واجب نہیں وہ بھی اس فضیلت کو حاصل کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کریں۔

قربانی کا پس منظر اور اس کی ترغیب وتحریص ملاحظہ کر لینے کے بعد جن لوگوں پر قربانی واجب ہے ان کو تو پختہ ارادہ کر لینا چاہیے کہ جب تک اللہ تعالیٰ استطاعت دے کبھی اس سے غفلت نہیں کریں گے، ان ہی کے ساتھ جن پر واجب نہیں مگر کر سکتے ہیں انہیں بھی ہمت سے کام لیکر قربانی کر لینا چاہیے، اور غور کرنا چاہیے کہ آج کے اس دور میں جہاں ہم شادی بیاہ، ختنہ، بسم اللہ وغیرہ کے موقعوں پر سیکڑوں روپے فضول خرچیوں اور بے جا خواہشوں میں پانی کی طرح بہا دیتے ہیں اور ان رسومات کی تکمیل کیلئے قرض رہن وغیرہ تک کی ہمت کر لیتے ہیں تو کیا بگڑ جائیگا اگر ہم قربانی جیسی عظیم فضیلت وشعارِ اسلامی کی تکمیل کے لئے بھی تھوڑی ہمت کر لیں؟ مگر افسوس کہ یہاں ہم عدمِ وجوب یا مالی تنگی کا بہانہ کر کے رہ جاتے ہیں۔

قربانی کی حقیقت وروح، یار کی خاطر اغیار سے قلب کو پاک کر لینا اور اپنے جان ومال اولاد وخواہشات، تمام چیزوں کو آقائے نعمت کی مرضیات کے تابع بنا لینا ہے، اسلئے حضرت ابراھیم علیہ السلام کی قربانی کے اس تاریخی موقع پر جہاں ہم جانوروں کا خون بہا کر بارگاہِ رب العزت میں اپنی وفاداری وجان نثاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں، آیئے ہم اسی موقع پر حق تعالیٰ سے تمام بدعات وخرافات اور رسم ورواج (جو غیر شرعی ہونے کے علاوہ سوسائٹی کیلئے وبال بھی ثابت ہو چکے ہیں) کی

قربانی کا بھی وعدہ کرلیں، اور یہ طئے کرلیں کہ پوری زندگی قرآن وسنت کے موافق گذارنے کیلئے جس جس قربانی کی ضرورت پیش آئے اس سے دریغ نہ کریں گے۔

قربانی کے مسائل

مسئلہ (۱) ہر عاقل، بالغ، مقیم وآزاد پر جو نصاب کا مالک ہو، قربانی کرنا واجب ہے۔

مسئلہ (۲) ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے ساتھ تولہ سونا، یا اس کی قیمت یا اس قیمت کی مالیت کا ایسا سامان جو روزمرہ کی ضروریات اور قرض سے زائد ہو قربانی کا نصاب ہے، خواہ سال گذرے یا نہ گذرے۔

مسئلہ (۳) قربانی صرف اپنی طرف سے واجب ہے، نابالغ اولاد کی طرف سے صحیح یہی ہے کہ واجب نہیں ہے۔

مسئلہ (۴) اونٹ، بیل، بکرا، دُنبہ، اوران کے مادے، اِن جانوروں کی قربانی دُرست ہے۔

مسئلہ (۵) اونٹ پانچ سال، گائے دو سال، بکری ایک سال سے کم کی دُرست نہیں، البتہ بھیڑ، دُنبہ اگر اس قدر فربہ ہوں کہ سال بھر کے دُنبوں میں چھوڑ دیئے جائیں تو برابر ہوں، تو ایسی صورت میں چھ مہینہ کے بھیڑ، دُنبہ کی قربانی بھی درست ہے۔

مسئلہ (٦) اونٹ، گائے وغیرہ میں سات آدمیوں کی شرکت بھی جائز ہے، اگر کئی آدمی شریک ہوں تو ہر شریک کو ساتواں حصہ پہنچنا ضروری ہے، اگر ایک آدمی کو بھی ساتویں حصہ سے کم پہنچا تو کسی کی قربانی درست نہ ہوگی، بکری، دُنبہ وغیرہ کی قربانی صرف ایک آدمی کی طرف سے دُرست ہے۔

مسئلہ (۷) مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے۔

مسئلہ(۸) تمام شرکاء اگر باتفاق رائے گوشت اکھٹا تقسیم کردینا چاہیں یا اکھٹا پکوادینا چاہیں تو یہ بھی دُرست ہے۔

مسئلہ(۹) جن جانوروں کا عضو تہائی یا تہائی سے زیادہ ضائع ہوگیا ہو اس کی قربانی دُرست نہیں، البتہ اگر ایک پیر زخمی ہے مگر چلنے میں اس سے مدد لے سکتا ہے تو اس کی قربانی صحیح ہے، مریل، کمزور جانور اور جن جانور کے پورے یا آدھے دانت گر گئے ہوں، اس کی قربانی بھی دُرست نہیں۔

مسئلہ(۱۰) خصی بکرے یا مینڈھے کی قربانی دُرست بلکہ افضل ہے۔

مسئلہ(۱۱) قربانی کا وقت عید کے دن عید کی نماز کے بعد سے ۱۲/ذی الحجہ کے غروب تک ہے۔

مسئلہ(۱۲) اگر قربانی کے دنوں میں کوئی قربانی نہ کرسکا تو اگر جانور خرید لیا تھا تو بعینہٖ اس جانور کو صدقہ کردے ورنہ جانور کی قیمت صدقہ کرے۔

مسئلہ(۱۳) قربانی کا جانور خریدا پھر گُم ہوگیا تو دوسرا جانور خریدا، اب پہلا جانور مل گیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ وہ شخص اگر غریب ہے تو دونوں جانور قربان کرے اور اگر امیر ہے تو صرف ایک کی قربانی واجب ہے (یہ مسئلہ ایسا ہی ہے، بعض لوگوں کو بظاہر اشکال ہوتا ہے، اس کی تفصیل اہلِ علم سے سمجھ لیں۔)

مسئلہ(۱۴) جانور خریدنے کے بعد کوئی عیب نکلا یا عیب دار ہوگیا تو اس کے بدلے دوسرا جانور خرید کر قربانی کرے اور اگر ایسا غریب ہے کہ ایسا کرنے کی سکت نہیں ہے تو اسی کی قربانی کردے۔

مسئلہ(۱۵) قربانی کا گوشت مستحب یہ ہے کہ تین حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ خود کھائے، ایک حصہ فقراء وغُرباء میں بانٹ دے، اور ایک حصہ رشتہ داروں کو دیدے، لیکن کوئی ایسا نہ کرے بلکہ سب استعمال کرلے یا سب خیرات کردے تب

بھی کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ (۱۶) قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو دینا بھی جائز ہے۔

مسئلہ (۱۷) قربانی کا جانور افضل یہ ہے کہ خود ذبح کرے بشرطیکہ طریقۂ ذبح سے واقف ہو ورنہ کم ازکم وہاں موجود تو رہے۔

مسئلہ (۱۸) جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ پہلی ذی الحجہ سے قربانی کے دن تک اپنے بال اور ناخن نہ تراشے، قربانی ہو جانے کے بعد تراش لے۔

مسئلہ (۱۹) کسی کے ایصالِ ثواب کیلئے اپنی خوشی سے قربانی کرنا چاہے تو یہ بھی درست ہے، اور اس کے گوشت کا وہی حکم ہے جو اپنی قربانی کے گوشت کا ہے، البتہ اگر کسی کی وصیت کی وجہ سے اور اسی کے مال سے قربانی کی ہے تو پورے گوشت کا صدقہ کر دینا واجب ہے۔

مسئلہ (۲۰) قربانی کی کھال خود استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے ورنہ خیرات کر دے۔

مسئلہ (۲۱) قربانی کی کھال، گوشت وغیرہ سے کوئی چیز قصائی وغیرہ کو بطور اجرت دینا جائز نہیں۔

مسئلہ (۲۲) قربانی کی کھال یا اس کی قیمت، مساجد، مدارس، دواخانے وغیرہ کی تعمیر و مرمت کیلئے دینا جائز نہیں، اسی طرح کسی اور نیک کام میں خرچ کرنا بھی جائز نہیں، صرف مستحقین کی ضرورتوں ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔

مسئلہ (۲۳) حلال جانوروں کے درجِ ذیل اعضاء کھانا حرام ہے، بہتا خون، نر و مادہ کا عضوِ تناسل، خُصیے، غدود، پیشاب کی تھیلی، پتّا، حرام مغز (ریڑھ کی ہڈی کے درمیان کا مغز)۔

مسئلہ (۲۴) قربانی کے جانور کا دودھ نکالنا یا اسکے بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کرلیا تو دودھ اور بال یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

مسئلہ (۲۵) قربانی سے پہلے چھری کو خوب تیز کرے اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرے، اور ذبح کے بعد کھال اُتارنے اور گوشت کے ٹکڑے کرنے میں جلدی نہ کرے، جب تک پوری طرح جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

مسئلہ (۲۶) ماہِ ذی الحجہ کے دس دن بڑی ہی فضیلت کے ہیں، اس لئے اگر پہلی ذی الحجہ سے ۹/ ذی الحجہ تک کوئی روزہ رکھ لے تو بڑی بہتر بات ہے، اور یوم العرفہ یعنی ۹/ ذی الحجہ کے روزہ کی تو بڑی فضیلت ہے، کم از کم اس کا اہتمام تو ضرور کرلے۔

مسئلہ (۲۷) ماہِ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کی فجر سے ۱۳ اویں تاریخ کی عصر تک مردوں کیلئے ہر فرض نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے۔ عورتیں آہستہ آواز سے پڑھیں۔ تکبیرِ تشریق یہ ہے: **اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، و للّٰہ الحمد۔**

مسئلہ (۲۸) عید کی رات کو جاگ کر عبادت کرنا بھی بہتر ہے، حدیث میں ہے کہ اس کا دل اُس دن نہیں مرے گا جس دن سب کے دل مر جائیں گے۔

مسئلہ (۲۹) عید کے دن دو رکعت نماز بطور شکرانہ چھ زائد تکبیرات کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ (۳۰) مستحب ہے کہ عید کی نماز کے لئے جاتے اور آتے وقت کچھ آواز سے تکبیرِ تشریق پڑھتا رہے۔

مسئلہ (۳۱) عید کی نماز کے لئے ایک راستہ سے جائے دوسرے راستہ سے لوٹے، تاکہ ہر گلی کوچے میں اللہ کی تکبیر بلند ہو سکے۔

مسئلہ (۳۲) عید کے دن موجودہ کپڑوں میں سے بہتر کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، مسواک کرنا، صبح جلد اٹھنا، عیدگاہ جلد پہنچنا اور پیدل جانا مسنون ہے۔

مسئلہ (۳۳) اگر قربانی کر رہا ہو تو مستحب ہے کہ قربانی کے گوشت سے اس دن کھانے کی ابتداء کرے، آج کل یہ سہولت قصاب نہیں ملتے، اکثر قربانی میں تاخیر ہو جاتی ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ ایسا ہی کرے، ممکن ہو تو اس پر عمل کی فضیلت حاصل کر لے۔

ترکیب نماز عید

پہلے زبان یا دل سے یہ نیت کرے کہ دو رکعت واجب نماز عید مع چھ زائد تکبیروں کے اس امام کے پیچھے پڑھتا ہوں، پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لے، **سبحانک اللھم** پڑھے پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر دوسری تکبیر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر تیسری تکبیر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے پھر کانوں تک ہاتھ اٹھا کر چوتھی تکبیر کہے اور ہاتھ باندھ لے، اس کے بعد امام حسبِ معمول قرأت بالجہر کرے اور مقتدی توجہ سے سنیں، سورہ فاتحہ اور ضم سورہ کے بعد رکوع سجدہ عام نمازوں کی طرح دوسری رکعت کیلئے کھڑے ہو جائیں، دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور ضمِ سورہ کے بعد مقتدی اور امام دونوں تین مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہیں اور ہاتھ چھوڑ دیں، اس کے بعد چوتھی مرتبہ بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیر اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں چلے جائیں، باقی نماز حسبِ معمول پوری کر لیں۔

نماز کے بعد امام دو خطبے دے اور مقتدی غور سے سنیں۔

طریقہ ودعائے قربانی!

پہلے جانور کو قبلہ رخ لٹائے، پھر یہ دعا پڑھئے:

انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک اُمرت وانا من المسلمین اللھم منک ولک اس کے بعد **بسم اللّٰہ اللہ اکبر** کہہ کر ذبح کیجئے اور ذبح کے بعد یہ دعا پڑھیئے:

اللھم تقبل منی کما تقبلت من خلیلک ابراھیم وحبیبک محمد علیھما الصلوٰۃ والسلام

نوٹ: اگر دوسروں کی طرف سے قربانی کی جائے تو منی کے بجائے من کے بعد صاحبِ قربانی کا نام کہے۔

جمعہ وعید

ایک دن جمع ہو جائیں تو دونوں کا ادا کرنا واجب ہے!

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین اما بعد !

اگر عید جمعہ کے دن واقع ہو جائے تو کیا کریں دونوں نمازیں اپنی اپنی شان اوراحکام کے مطابق ادا کی جاویں یا ان میں سے کوئی ایک ادا کر لی جائے تو دوسری ساقط ہو جائے گی؟

یہ ایک مسئلہ ہے جو ایسے مواقع پر عوام میں موضوعِ گفتگو بن جاتا ہے، چند برس قبل کسی ایسے ہی موقع پر ایک عیدگاہ کے خطیب صاحب نے نمازِ عید کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ "اب عید کی نماز پڑھ لینے کے بعد آپ لوگوں کو اختیار ہے کہ جس کا جی چاہے جمعہ پڑھے جس کا جی چاہے ظہر پڑھ لے یعنی خطبۂ عید کی وجہ سے خطبۂ جمعہ ساقط ہو گیا"۔

اس کے بعد دین کی کچھ معلومات رکھنے والے طبقہ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور وہ تحقیق کیلئے مختلف علماء سے رجوع ہونے لگے، بعض احباب راقم السطور کے پاس بھی آئے اور مسئلہ کی صحیح صورت حال جاننی چاہی، راقم نے فقہ کی کتابوں میں جو مسئلہ مذکور تھا وہ انھیں بتلا دیا، ساتھ ہی ان لوگوں سے یہ خواہش کی کہ وہ ان خطیب صاحب سے اپنے بیان کردہ مسئلہ کی دلیل معلوم کریں، چنانچہ ایک صاحب کے مسلسل تقاضے پر انھوں نے "سنن ابنِ ماجہ" کی ایک حدیث اور اسکے ذیل میں "خطباتِ محمدی" کی یہ تشریح —— اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جمعہ نہ پڑھے

ظہر ادا کر لے تو بھی جائز ہے۔[1] ــــــ بطور دلیل پیش کی، ظاہر ہے کہ "خطباتِ محمدی" مولانا محمد جونا گڑھی کی تصنیف ہے جو مسلکاً غیر مقلد ہیں، جبکہ جمہور علماء اسلام وفقہاء کرام کا مسلک اس کے برخلاف ہے، ادھر نمازِ عید کے بعد نمازِ جمعہ کی چھٹی کر دینے والے خطیب صاحب اور عیدگاہ کے سب ہی مصلی چند ایک کو چھوڑ کر مقلد اور حنفی المسلک ہیں، اسلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلہ کو اس قدر مجمل اور خلافِ مسلک بیان کر دینے سے جو غلط فہمی اور تشویش پیدا ہوگئی ہے عوام الناس کے سامنے اس کی وضاحت اور صحیح مسئلہ کی نشاندہی کر دی جائے۔

اس مرتبہ بھی تواریخ کے اعتبار سے چونکہ اجتماعِ عیدین کی یہی صورت پیش آنے کا امکان ہے اسلئے موقعہ کی مناسبت سے اس کی اشاعت اور بھی ضروری معلوم ہوئی، ذیل میں اس مسئلہ کو تفصیل سے پیش کیا جارہا ہے:

سب سے پہلے تو یہ اصول ذہن میں رکھیں کہ نماز جمعہ کی فرضیت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اس لئے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، پھر کسی ظنی اور احتمالی دلیل سے اس کو ساقط نہیں کیا جاسکتا ہے، اور چونکہ اس ملک کے عوام کی اکثریت کسی نہ کسی امامِ مجتہد کی مقلد ہے، اس لئے پہلے مسئلہ کی فقہی نوعیت کو پیش کیا جاتا ہے، اس کے بعد انشاءاللہ حدیثِ مذکور کی تشریح سے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

ہدایہ میں جامع صغیر کے حوالہ سے لکھا ہے "اگر عید جمعہ کے دن واقع ہو تو دونوں میں سے کسی کا ترک درست نہیں"[2] اس لئے کہ دونوں کے دلائل ثبوت علاحدہ علاحدہ ہیں، اور یہی مسلک احناف کے علاوہ تھوڑی تفصیل وتغیر کے ساتھ شوافع اور مالکیہ کا بھی ہے، البتہ ان سب کے برخلاف ابن قدامہ حنبلیؒ نے سقوطِ جمعہ کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اس لئے احناف، شوافع اور مالکیہ کے لئے یہ بات طئے ہے کہ انہیں جمعہ کے روز عید آجانے کی صورت میں جمع وعید دونوں نمازیں ادا

[1] خطباتِ محمدی: ۳۳۲/۲، [2] ہدایہ: ۱۵۱/۱

کرنی ہوں گی، عصر حاضر کے عظیم المرتبت فقیہ ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ حنابلہ کا مسلک نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

جمہور (علماءِ اسلام) قرآن کریم کی جمعہ کو فرض کرنے والی آیت اور جمعہ کے وجوب پر دلالت کرنے والی احادیث کی وجہ سے ایسے وقت بھی جمعہ کے واجب ہونے ہی کے قائل ہیں، ان کا یہ توقف اسلئے بھی ہے کہ دونوں نمازیں مستقل دلائل سے ثابت وواجب ہیں، اسلئے ایک کی ادائیگی سے دوسری ساقط نہیں ہوسکتی، جس طرح جمعہ کے علاوہ دیگر ایام میں نماز عید پڑھ لینے سے نماز ظہر ساقط نہیں ہوتی۔[1]

جہاں تک اس کی تفصیل کا تعلق ہے تو جمہور کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کا ثبوت درحقیقت دلائل قطعیہ سے ہوا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد: **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ**[2] اس کی واضح دلیل ہے۔ اور جس حکم کا ثبوت "دلیلِ قطعی" سے ہو اس کے سقوط کیلئے بھی دلیل قطعی ہونا چاہیے اور چونکہ سقوط کی اجازت دینے والوں کے پاس دلیل قطعی تو کیا حدیثِ صریح وصحیح اور خبرِ مرفوع بھی نہیں ہے اس لئے کتاب اللہ اخبارِ متواترہ اور اجماع امت کے بر خلاف اس قسم کے دلائل سے سقوطِ جمعہ ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ ترمذی[3] میں حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ وعیدین کی نماز میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور **ھل اتاک حدیث الغاشیة** تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس معمول کو نقل کرکے آگے فرماتے ہیں کہ "اگر کبھی جمعہ وعید اکھٹے ہوجاتے تو اس دن بھی آپؐ دونوں نمازوں میں یہی سورتیں تلاوت فرماتے تھے"، امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو نقل کرکے اس کی تحسین وتصحیح بھی فرمائی ہے، اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ اور عید جمع ہوجانے کی صورت میں دونوں نمازیں پڑھی جائیں گی، جیسا کہ جمہور سلف

---

[1] موسوعۃ الفقہ: ۱۴۲۰/۲، [2] سورۃ الجمعۃ: ۹ [3] ترمذی: ۱۱۹/۱

وخلف کا مسلک ہے، رہ گئیں وہ احادیث جن سے علامہ ابن قدامہؒ اوران کے ہم مسلک حضرات استدلال کرتے ہیں، ان میں سے پہلی حدیث وہی ہے جس کا ذکر شروع مضمون میں آیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید کے بعد اعلان فرمایا: "آج کے دن دو عیدیں جمع ہوگئیں، پس جو چاہے اس کے لئے جمعہ کی طرف سے بھی یہ نماز کافی ہے، ہم تو جمعہ پڑھیں گے انشاء اللہ" [1] اس حدیث سے ان حضرات نے سقوطِ جمعہ پر استدلال کیا ہے، حالانکہ غور کیا جائے تو خود اسی حدیث کے الفاظ اسکے صحیح مفہوم متعین کرنے کیلئے کافی ہیں۔ "ہم تو جمعہ پڑھیں گے" اس میں واضح قرینہ اس بات کا موجود ہے کہ یہ اعلان ان دیہات والوں کیلئے کیا گیا تھا جو اطراف واکناف سے نمازِ عید ادا کرنے کیلئے جمع ہوئے تھے اوران پر اپنے علاقوں میں جمعہ واجب نہ تھا، ان کیلئے سہولت کوراہ دیتے ہوئے یہ اعلان فرمایا گیا کہ ہم اہلِ مدینہ تو جمعہ پڑھیں گے ہی کیوں کہ ہم پر واجب ہے، لیکن جن اہل دیہات پر جمعہ واجب نہیں وہ اگر ہمت محسوس کریں اور ٹھیرنا چاہیں تو جمعہ تک ٹھیریں اور اگر جانا چاہیں تو چلے جاویں، اور اپنے ہاں ظہر ادا کرلیں تو یہ ان کے لئے کافی ہے، یہ بھی یاد رہے کہ حدیثِ مذکور کا یہ مفہوم جو لیا گیا وہ محض اٹکل اور قیاس سے نہیں بلکہ اسی مضمون کی دیگر روایات میں موجود تصریح سے اخذ کیا گیا ہے، مثلاً یہی زیر بحث روایت کو لے لیجئے اس میں **انا مجمعون** ہم تو جمعہ پڑھیں گے کا لفظ ہے۔ اس میں "ہم" کا مصداق بعضوں نے امام کو متعین کیا کہ امام کو جمعہ پڑھنا ضروری ہے بقیہ کو نہیں، بعضوں نے تین آدمیوں کو مزید امام کے ساتھ ملا دیا اس لئے کہ **مجمعون** جمع کا صیغہ ہے اس کا اطلاق تین سے کم پر نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف ہم کہتے ہیں کہ اس تکلف بے جا کی ضرورت نہیں **انا مجمعون** کا مطلب "ہم اہل شہر" قرار دیا جائے اور نہ پڑھنے کی اجازت کو اہل دیہات کے

[1] اس حدیث کو ابن ماجہؒ کے علاوہ ابوداؤدؒ نے بھی روایت کیا ہے،

ساتھ مخصوص کیا جائے، خصوصاً جب کہ دیگر روایات میں صراحۃً **من اھل العالیۃ** یا **اھل العوالی** کے الفاظ موجود ہیں۔

چنانچہ وہ دوسری اہم روایت جس سے سقوطِ جمعہ کے قائلین استدلال کرتے ہیں جو بخاری شریف[1] میں حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے متعلق ہے کہ انہوں نے نماز عید پڑھانے کے بعد خطبہ دیا پھر یہ اعلان کیا "لوگو! آج تمہارے لئے دو عیدیں جمع کر دی گئی ہیں، پس اطراف سے آئے ہوئے لوگوں میں سے جو یہ چاہے کہ جمعہ کا انتظار کرے تو ضرور کرے جو لوٹ جانے کو پسند کرے تو میں اس کو اجازت دیتا ہوں"۔

اب اس حدیث میں **العوالی** —— جو عالیہ کی جمع ہے وہ بقول امام مالک مدینہ کی آبادی سے آٹھ میل کے فاصلہ پر مرتفع علاقہ میں آباد بستیاں تھیں —— کا لفظ اور **من شاء ان یرجع** یعنی جو لوٹ جانا چاہے کے الفاظ واضح ثبوت ہیں اس بات کا کہ سقوطِ جمعہ کا حکم صرف اہلِ دیہات کیلئے تھا جو اطرافِ مدینہ سے نماز عید کیلئے شہر میں آئے ہوئے تھے، نہ کہ اہلِ شہر کے لئے حتی کہ ایک حدیث میں یہاں تک صراحت ہے کہ اگر کسی کا حرج نہ ہو تو وہ جمعہ کا انتظار کرے اور جمعہ پڑھ کر جائے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ جمعہ کے دن عید واقع ہونے کی صورت میں جمعہ کا وجوب ساقط نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ قائم رہتا ہے، یہی جمہور علماءِ اسلام کا موقف ہے، جن حضرات نے اس کے برخلاف سمجھا ہے وہ اصولی اعتبار سے مرجوح ہے۔ فقط **واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم**

---

[1] بخاری: ۱۳۵/۷

مستورات کیلئے نماز کی افضل جگہ

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

رمضان المبارک کے اختتام پر کچھ دن بعد ایک صاحب نے مجھ سے وقت لیا کہ کچھ معلومات کرنی ہیں۔ احقر نے ملاقات کی اجازت دیدی، آنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ انگریزی روزنامہ ”دکن کرانیکل“ کے نامہ نگار ہیں اور ”ایڈیٹر“ نے انہیں ایک اہم مسئلہ پر آج ہی معلومات کر کے رپورٹ دینے کا پابند کیا ہے اس کی تفصیل بتلانے سے معلوم ہوا کہ وہ مسئلہ ”عورتوں کا نماز باجماعت کیلئے مسجد جانے کا ہے“ میں نے پوچھا کہ آخر اس مسلمانوں کے شخصی و مذہبی معاملہ سے آپ کے اخبار کو کیا دلچسپی ہے؟ عورتیں نماز کہاں پڑھیں، یہ نہ کوئی سیاسی مسئلہ ہے نہ اقتصادی، نہ ہی اس پر کسی تمدنی معاملہ کا دارومدار ہے، کہنے لگے: دراصل ”کیرالا“ میں اجازت دیدی گئی ہے اور ”مدراس“ کی مسلم عورتیں مانگ کر رہی ہیں، ہم آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آندھرا پردیش کی عورتوں کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا: کیا مسائل شرعیہ کسی کی مانگ اور چاہ کے پابند ہیں، یا اصولِ شرع اور مزاجِ اسلام کے تحت جانے جاتے ہیں؟ عورتوں سے یہ پوچھنا کہ وہ نماز کہاں پڑھنا چاہتی ہیں ایک مہمل اور لایعنی سوال ہے، ان کی چاہت معلوم کرنے کے بجائے اس سلسلہ میں جو حکم شرع ہے وہ اہلِ علم وفتویٰ سے معلوم کر کے ان تک پہنچا دیجئے، کیونکہ یہ پھر بھی کچھ صحیح خدمت سمجھی جاسکتی ہے، اس کے برخلاف اپنے اخبار میں جو بحث آپ اٹھا رہے ہیں اس کے ذریعہ اباحیت پسندوں اور آزاد خیالوں کیلئے اپنی ہفوات و

خواہشات کی اشاعت کرنے پھراس کے نتیجہ میں عوامی بے راہ روی وآزادی کے پیدا ہونے میں مدد ملے گی اور کچھ نہیں۔

انہیں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ یہاں آنے سے قبل دو کالجس میں وہاں کے لکچررز (مردوخواتین) سے انٹرویو لے چکے ہیں اور ایک آدھ قدامت پسند کے علاوہ سبھی یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کی اجازت ملنی چاہئے، اس میں کوئی حرج نہیں![1]

میں نے کہا" اجازت" ملنے کا لفظ ہی یہ بتاتا ہے کہ اب تک ممانعت ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ روکنا کسی جبر وتسلط اور ظلم وتشدد کے ذریعہ نہیں ہوا، بلکہ احکام واصول شریعت کے مطابق خیر القرون ہی سے چلا آرہا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امت کی خواتین باوجود جائز سمجھنے اور کہنے کے بھی اجماعاً مسجد آنے سے بچتی رہیں اور اہل علم انہیں اس کی اہمیت بتلاتے رہے۔ اور بلاشبہ اسی میں ان کی بلکہ پوری امت کی خیریت ہے اور یہی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا مسلک ہے۔

نفسِ جواز اور مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھی گئی نماز کے ہوجانے کی بات علاحدہ ہے، اس سے کسی صاحبِ علم کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب عورتوں کے لئے نماز پڑھنے کے واسطے ان کا گھر بلکہ خلوت کی جگہ افضل ترین جگہ ہے اور ثواب کے اعتبار سے بھی ارفع ہے، ادھر کتاب وسنت میں بھی انہیں اس کی کوئی ترغیب نہیں دی گئی ہے، دوسری جانب ان کے مساجد میں جمع ہونے سے موجودہ فیشن پرستی و بے حیائی کے دور میں سراسر فتنہ ہے، تہذیب وشرافت کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے تو ایسے حالات میں عقل ودانش کا تقاضہ کیا ہے؟ انہیں صرف جواز واباحت کا سہارا لے کر خطرہ میں پڑنے کا مشورہ دیا جائے یا پھر فضیلت

---

[1] ابھی سے قارئین کرام جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دینی بے خبری اور فکری گمراہی کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ مسائلِ دینیہ میں بھی شرع کے بجائے عقل ہی کو امام مانتے ہیں۔

وبزرگی کا پہلو اختیار کرنیکی ترغیب دیکر احتیاط وحفاظت کی راہ دکھلائی جائے؟ خود ہی اپنی عقلِ خداداد سے فیصلہ کر لیجئے۔علماء عوام کی چاہتوں کے نہیں دین کے تقاضوں کے پابند ہیں۔

اس کے بعد میں نے ممکنہ خطرات کا جن کا فقہاء نے اس باب میں لحاظ فرمایا ہے چند پیش آمدہ مثالوں کے ذریعہ انہیں اندازہ کرایا،اور کچھ تفصیل بتلائی۔

موصوف میری بات سنتے رہے، درمیان میں ترکی اور سعودی عرب کی مسجدوں میں عورتوں کے جانے کا حوالہ بھی دیتے رہے،لیکن بالآخرانہوں نے اعتراف کیا کہ بات آپ کی ٹھیک ہے اور یہ شکوہ کیا کہ ان تفصیلات سے علماء کرام امت کو آگاہ کیوں نہیں کرتے؟ تاکہ عوام باخبر رہیں اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے اس قسم کے مسائل میڈیا میں اٹھنے نہ پائیں۔میں نے کہا: کہ علماء کرام احقاقِ حق کا اپنا کام کررہے ہیں اور عوام بھی اطاعت کا فریضہ ادا کررہے ہیں۔لیکن آپ اسے ایک طبقہ کی ناسمجھی سمجھ لیجئے یا سوچی سمجھی سازش کہ وہ ان مسائل کو خواہ مخواہ موضوعِ بحث بنا کر مسلمانوں کی مذہبی پختگی وتصلب کو توڑنا اور اس کے نظامِ عفت وپاکدامنی کو داغدار کرنا چاہتا ہے،اس طبقہ کی تعیین اوراس کے مرض کی تشخیص قرآن کریم نے دیڑھ ہزار برس پہلے کردی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:"وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِنْ عِنْدِاَنْفُسِهِمْ" ترجمہ:اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کا ایک بڑا طبقہ اپنے دلوں میں چھپے حسد کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ کس طرح تم لوگوں کو ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنادے،اورظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کفرِ صریح کی دعوت دینا تو ممکن نہیں اور نہ کسی گنوار سے گنوار مسلمان سے تک اس کو قبول کرنیکی توقع کی جاسکتی ہے،اس لئے انہیں عملی زندگی سے دھیرے دھیرے

ہٹا کر عقیدہ کی خرابی تک پہنچانے کا راستہ انہیں اختیار کرنا پڑتا ہے، اور یہ ایسا حربہ ہے کہ جس کے جاہل مسلمان تو کیا بڑے بڑے اور پڑھے لکھے مسلمان بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب جب بھی ایوان کفر سے اس قسم کی صدائیں گونجتی ہیں تو اہلِ اسلام کے بعض گوشوں اور حلقوں سے بھی" آفرین و تحسین" کے نعرے بلند ہونے لگتے ہیں، اور لے میں لے ملا کر نعرے لگانا، قلم سے قلم جوڑ کر آرٹیکلس لکھنا شروع کر دیتے ہیں، انہیں اسلام اور اس کے مزاج و منہاج کو سمجھنے اور پیش کرنے سے زیادہ جدید نظریات اور آزاد خیالات کی حمایت سے دلچسپی ہوتی ہے، مسلمانوں کی اس یورپ نواز اور مغرب زاد طبقے نے اپنے کو دہریت کے الزام سے بچانے کے لئے اسلام اور ملاّ ازم کی ایک زبردستی تقسیم عمل میں لا کر یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام ایک الگ مذہب ہے جو —— نعوذ باللہ —— دشمنوں کے عین چاہت کے مطابق ہے اور علماء کی تشریح ان کے اغراضِ نفسانیہ ہیں، جن کا گویا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، البتہ ان نام نہاد دانشوروں کی مغرب نواز تشریحات ہی حقیقی اسلام ہے۔ شاید ایسے ہی لوگ اور یہی زمانہ ہوتا ہے کہ جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ طیبہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر پناہ مانگی تھی: اے اللہ! میں ایسے زمانے سے اور مسلمانوں کے لئے آپ سے پناہ چاہتا ہوں جس زمانہ کے لوگ بزرگوں سے حیاء اور علماء کی اتباع نہیں کریں گے، ان کی زبانیں عربوں کی طرح شیریں اور ان کے دل عجمیوں کی طرح سخت ہوں گے۔ **اللّٰھم آمین**

اس کے بعد وہ اخبار کے نمائندہ صاحب تو رخصت ہو کر چلے گئے اور اسے مرتب کر کے اخبار میں شائع بھی کر دیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ مسئلہ کی نوعیت صحیح ڈھنگ سے پیش نہ کر سکے یا اخبار کی پالیسی کے خلاف نہ جا سکے، اور وہ بیچارے کیا

پیش کرتے اس کے بعد جن اصحاب علم وفہم کے متضاد بیانات اخباروں میں شائع ہوئے وہ بھی افراط وتفریط سے پاک نہیں تھے، میں نے جمعہ کے بیان میں اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس کر کے اس پر بیان کیا، اس کا خلاصہ احباب کے تقاضے پر ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو امید ہے کہ متلاشی حق کیلئے بہت کافی اور شافی ثابت ہو۔

بُیُوْتُهُنَّ خَیْرٌ لَّهُنَّ

سب سے پہلے ہم اس سلسلہ کی چند احادیثِ مبارکہ نقل کرتے ہیں۔ پھر ان کی روشنی میں مسئلہ زیر بحث کا جائزہ لیں گے تاکہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جائے اور کسی قسم کا شبہ نہ رہ جائے۔

امام بخاریؒ نے مختلف ابواب کے تحت اس مسئلہ سے متعلق چھ احادیث ذکر فرمائی ہیں دیگر اصحابِ حدیث نے بھی متعدد روایات نقل کی ہیں۔ ہم ان میں سے مکررات کو حذف کر کے باقی روایات پیش کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کسی کی عورت اگر مسجد جانیکی اجازت مانگے تو اسے چاہیے کہ منع نہ کرے"۔ ۱؎

۲۔ حضرت عروہؒ حضرت عائشہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ "مسلمان عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نمازِ فجر میں اپنی چادروں کو اچھی طرح لپیٹ کر آپ کے پاس (مسجد) حاضر ہوتی تھیں اور (نماز کے فوراً بعد) اپنے گھروں کو لوٹ آتی تھیں۔ ۲؎

۳۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱؎ بخاری: ۱۶۰/۲، ۲؎: ایضاً

نمازعشاء میں (اچھی خاصی) تاخیر فرمائی۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے اطلاع کی کہ یارسول اللہ! بچے اورعورتیں سوگئی ہیں۔ ۱

۴۔عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے معاً بعد مردوں کے اٹھنے سے قبل ہی گھروں کولوٹ جاتی تھیں۔ ۲

۵۔حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورتوں کومسجد جانے سے منع نہ کرو۔البتہ ان کے گھر (نماز پڑھنے کے واسطے) ان کےحق میں زیادہ بہتر ہیں'' ۳

۶۔حضرت ام حمید ساعدیہؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکرعرض کیں کہ میری خواہش ہے کہ آپ کے پیچھے نماز پڑھا کروں آپ نے اس کے جواب میں ارشادفرمایا'' میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں میری اقتداء میں نماز پڑھنے کا کس قدر شوق ہے مگر (صورتِ مسئلہ یہ ہیکہ)تمہاری وہ نماز جوتم گھر کی کوٹھری میں پڑھو دالان (اور ہال) کی نماز سے بہتر ہےاور ہال کی نمازصحن کی نماز سے بہتر ہے،صحن کی نمازتمہارے لئے محلّہ کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے،اورمحلّہ کی مسجد کی نماز میری مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔۴

۷۔حضرت زینبؓ سے مروی ہیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' جب تم میں کوئی عورت مسجد جائےتو اسے چاہیے کہ خوشبواستعمال نہ کرے'' ۵

۸۔حضرت ابوہریرۃؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نےفرمایا'' جس کسی عورت نے خوشبولگارکھی ہووہ ہمارے ساتھ نمازِعشاء میں حاضر نہ ہو'' ۶

۹۔حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہےفرماتے ہیں کہ میں نے اپنے محبوب

---

۱ بخاری: ۲/۲۷۷، ۲ بخاری:۲/۲۶۲، ۳ مشکوٰۃ ص:۹۶، ۴ مسنداحمد:۶/۳۷۱، ۵ مسلم ۶ مسنداحمد۲/۳۰۴

اسے یہ بات سنی ہے کہ ”جس کسی عورت نے مسجد جاتے وقت خوشبو استعمال کی ہو تو اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ غسل جنابت کی طرح (غایتِ اہتمام سے) غسل کر کے اس خوشبو کو زائل نہ کر لے“ [۱]

۱۰۔ حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”مردوں کی سب سے بہترین صف صف اول ہے اور بدترین صف آخری صف ہے۔ عورت کیلئے سب سے بہترین صف آخری صف ہے اور بدترین پہلی“ [۲]

۱۱۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ”اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں میں پیدا شدہ حالات (تکلف تساہل اور ضعف عمل[۳]) کو دیکھ لیتے تو انہیں مسجد میں آنے سے ضرور روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھیں“ [۴]

یہ کل گیارہ حدیثیں ہیں۔ اور بھی متعدد روایات ذخیرہ احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن حاصل اور خلاصہ سب کا ایک ہی ہے۔ اسلئے یوں سمجھ لیجئے کہ نفس مسئلہ سے متعلق تمام روایات سامنے آ گئیں۔ اب آپ ان میں غور فرمائیں اور دیکھیں کہ ان سے بہ حیثیت مجموعی کیا بات سمجھ میں آتی ہے۔ قرآن وحدیث سے احکام کے استخراج واستنباط کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق تمام نصوص کو بہ یک وقت سامنے رکھ کر غور کیا جائے۔ یہ نہیں کہ کوئی ایک روایت لے لی اور اس پر اصرار کرنے لگے۔ اسی لئے پہلے ان احادیث سے نکلنے والے مسائل پر غور کیجئے۔

الف: حدیث (۱) اور (۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں جانا ضروری نہیں ہے اگر ان کا جی جانے کو چاہے تو وہ شوہروں سے اجازت لے کر جائیں بغیر اجازت نہیں، نیز شوہروں سے سفارش[۵] کی گئی ہے کہ وہ اقتداءِ نبی کی اس خواہش کو قبول کر کے اجازت دیدیں۔

---

[۱] ابوداوٴد، نسائی، احمد: ۳۶۵/۲، [۲] صحیح سنن ترمذی: ۷۲/۱، [۳] یہ تشریح ہم نے اسلئے کی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے دور تک عورتوں میں جو کمی آئی تھی اسے بے حجابی، بے حیائی اور فیشن پرستی سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ [۴] بخاری: ۱۲۰/۱، [۵] سفارش اسلئے کہ اس حکم کو قرائن واضحہ سے تمام علماء نے استحباب پر محمول کیا ہے، وجوب پر نہیں۔ بعض علماء نے منسوخ بھی سمجھا ہے، اس بحث کو مسند طحاوی اور حجۃ اللہ البالغہ میں اہل علم دیکھ لیں۔

ب: حدیث (۲) اور (۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفارش پر لوگ عورتوں کو مسجد جانے کی اجازت دینے لگے اور خواہشمند عورتیں مسجد آنے لگیں حتیٰ کہ صبح اور عشاء کی نماز میں بھی۔

ج: حدیث (۲) اور (۴) سے واضح ہوتا ہے کہ اگر عورتوں کا یہ مسجد جانا بڑے اہتمامِ دیانت اور التزامِ حیا وحجاب کے ساتھ ہوتا تھا چادریں اچھی طرح لپیٹ لیتی تھیں کہ بے پردگی نہ ہونے پائے اور مردوں سے قبل اٹھ کر گھروں کو لوٹ آتی تھیں کہ مردوں سے اختلاط نہ ہونے پائے۔

د: حدیث (۷) (۸) اور (۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکیمانہ اسلوب میں ان پر روک لگانے کا نظم فرماتے ہوئے ان کے مسجد آنے کے لئے قیود وحدود مقرر فرمانے شروع کئے، خوشبو کے استعمال، تبرجِ جاہلی یعنی نسوانی کمالات کا اظہار اور پرکشش اداؤں پر پابندی لگائی، خوشبو کے ازالہ کیلئے غسل میں مبالغہ کا حکم دیا بصورتِ دیگر نماز قبول نہ ہونیکی وعید سنائی۔[۱] مردوں کو حکم دیا کہ ان کے فیشن پر کنٹرول کریں۔

ہ: حدیث (۱۰) سے پتہ چلا کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ـــــ خواہ وہ نماز پڑھنے کیلئے مسجد میں باپردہ طور پر ہی کیوں نہ ہو ـــــ موجبِ فتنہ اور محلِ خطرہ ہے، اسی لئے مردوں کی پچھلی صفوں اور عورتوں کی اگلی صفوں کو بری صفوف قرار دیا بہ نسبت عورتوں کی آخری صفوف مردوں کی اگلی صفوف کے کیونکہ ان میں عورت ومرد ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔

و: حدیث (۵) اور (۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خطرات سے حفاظت وبچاؤ کے لئے تعلیم دی گئی کہ عورتیں اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیں اور گھروں میں بھی حتی المقدور تنہائی کی جگہ اختیار کریں حتیٰ کہ اقتداءِ نبیؐ کے شرف پر

---

[۱] یہ ابن ماجہ کی ایک اور روایت سے مستفاد ہے۔

بھی گھر کی نماز کو زیادہ فضل والی سمجھیں۔ کیونکہ یہی عورت کے مطابقِ فطرت ہے جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے، نیز اسی میں عورت اور سماج دونوں کی حفاظت کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ مستورات اس حکم پر عہدِ نبوی ہی سے عملدرآمد کرتی رہیں۔ اگرچہ بعض اقتداءِ نبیؐ کی خواہشمند مستورات مسجد بھی جاتی رہیں مگر یہ آپؐ کے دور میں بھی تمام مستورات کا معمول نہ تھا۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں مسجد حاضر نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا دینے کے خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے اسکے اخیر میں یہی ہے۔ مگر آپ کو عورتوں اور بچوں کے خیال نے اس ارادہ سے باز رکھا، اگر عورتوں کے لئے مسجد میں جانے کا حکم ہوتا تو وہ اس سزا سے مستثنیٰ کیوں رکھی جاتیں؟

ز: حدیث (۱۱) سے رہبری ملتی ہے کہ اگر معاشرہ کے حالات از قابو رفتہ ہوجائیں اور ہوا وہوس اتباع شرع پر غالب آجائے تو علماءِ امت کو چاہیئے کہ وہ مستورات کو مسجد جانے سے ـــــ جو کہ ان کے لئے نہ فرض ہے نہ واجب نہ ہی سنت وفضلیت ـــــ روکدیں حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کے بقول یہ معاملہ ایسا ہے کہ اگر اللہ کے نبیؐ ان حالات کا ملاحظہ فرمالیتے تو بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح اپنی امت کی عورتوں کو بھی منع فرمادیتے۔

مذکورہ بالا وضاحتی بیان کے بعد آپ خود غور فرمالیں کہ ان تمام احادیث میں کہیں بھی عورتوں کے لئے مسجد جانے کی ترغیب وتشویق ملتی ہے؟ ان تمام روایات سے زیادہ سے زیادہ جو ثابت ہوسکتا ہے وہ "اجازت واباحت" ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پھر اس سلسلہ کو اوران روایات کو لے کر عامیانہ استدلال کے ذریعہ عوام الناس کو لے ڈوبنے کے کیا معنیٰ؟ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ معمول اس مسئلہ میں بھی اپنی حکیمانہ تدریجی طریقہ تربیت کی راہ اختیار فرمائی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام میں آج تک کوئی اس بات کا قائل نہیں ہوا کہ عورتوں کیلئے مسجد جا کر نماز پڑھنا کوئی فضیلت کی بات ہے۔جس کی ترغیب دی جائے اور اسے عورتوں کے حقوقِ واجبہ کا مرتبہ دیکر اسکے لئے تحریک چلائی جائے۔

چنانچہ ماضی قریب کے عظیم محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

اس سلسلہ کی تمام روایات کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کیلئے مسجد جانے کا مسئلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجاً حل فرمایا ہے، ابتداء تعلیم و تربیت نیز ان کے ذوق وشوق کے مدنظر اجازت دیدی پھر حسبِ معمول آہستہ آہستہ احکام میں شدت پیدا فرمائی، پابندیاں ایسی لگائیں کہ خود مستورات مسجد جانے سے رک جائیں۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی کوئی ترغیبی بات ارشاد نہیں فرمائی، بلکہ اس کے برعکس گھر میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان فرمائی، گھر کی نماز کے لئے البتہ ترغیبی ارشادات فرمائے،آپ کی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ ”اباحت“ ثابت ہوسکتی ہے، پسندیدگی بھی ثابت نہیں ہوتی۔ [۱]

بلکہ موجودہ حالات میں جبکہ ان پابندیوں کو عورتیں عار محسوس کررہی ہیں اور دن بہ دن دور ہوتی جارہی ہیں، یہ اباحت بھی کراہت سے خالی نہیں رہ گئی، چنانچہ فقہاءِ احناف نے اسی کے مطابق احکام خداوندی فرمائے ہیں۔

سعودی عرب کے موجودہ جلیل القدر علماء میں شیخ محمد بن صالح العثمین بھی ہیں۔وہ وہاں کی سب سے بڑی جماعت علماء ”**ھیئۃ کبار العلماء**“ کے رکن بھی ہیں۔اپنے ایک فتوے میں فرماتے ہیں:” میں عورتوں کا مسجد میں جانا گناہ نہیں کہتا جبکہ وہ خوشبو اور تصنع وتکلف سے بچتی رہیں اور اگر ایسا کریں تو اس صورت میں تو ان کا مسجد جانا حرام ہے۔اسلئے کہ عورتوں کو مسجد آنے کی ترغیب شریعت نے کبھی

[۱] فیض الباری:۲/۳۲۲

بھی نہیں دی۔صرف جائز رکھا ہے وہ بھی بڑی شرائط کے ساتھ۔ [۱]

اور خود حضرات صحابہ کرامؓ میں حضرت عمرؓ کا اپنی اہلیہ کو مسجد جانے سے روکنا، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا جمعہ کے دن عورتوں کو مسجد سے اہتمام کے ساتھ واپس کروانا کتبِ حدیث میں منقول ہے، جو فتنہ کے خوف اور شرعی مصلحت سے کسی جائز کام سے امت کو روکنے کے معقول ومشروع ہونے کی کافی دلیل ہے۔

آخر میں خود قرآن کریم کے اس ارشاد میں امہات المؤمنین کو دی گئی ہدایات میں ذرا غور کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھروں میں اطمینان سے رہنے اور وہیں اپنی عبادات انجام دیتے رہنے کا حکم دیتے ہوئے نماز کو بھی اس میں شامل فرمایا، ”وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ“ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نمازیں فرض ہوں یا نفل، جمعہ ہو یا تراویح، ان کا بہتر و پسندیدہ مقام عورتوں کیلئے ان کے گھر ہی ہیں۔

اور تجربہ یہ ہے کہ وہ احتیاط اور پابندیاں جو عہدِ صحابہؓ میں رائج تھیں، آج اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں، بلکہ الٹا فیشن اور بناوٹ وسجاوٹ پھر اس کے مظاہرے کا مزاج اس قدر عام ہو گیا ہے کہ دینداروں کے گھرانے تک محفوظ نہ رہ سکے۔کالجوں اور درگاہوں میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط کے کیا نتائج سامنے آرہے ہیں وہ آنکھ والوں سے پوشیدہ نہیں ہیں، نہ معلوم کس عدل ودیانت نے ہمارے غیر مقلد بھائیوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ باقاعدہ تحریر وتقریر کے ذریعہ عورتوں کو اُبھار اُبھار کر مسجدوں تک پہونچانے کی سعی میں مشغول ہیں اور کرنے کے سینکڑوں ضروری کاموں کو چھوڑ کر جب بھی کوئی بحث چھیڑتے ہیں تو بس ایسی ہی غیر ضروری بحث

[۱] من الاحکام الفقھیۃ ص:۴۱

لے کر بیٹھتے ہیں، کیا آج کے حالات میں یہی قوم کے ساتھ وفاداری و ہمدردی کا تقاضہ ہے؟ کیا یہی ہمارے ان اسلاف کا وطیرہ تھا جو سلفی کہلوا کر یہ حضرات اختیار کئے ہوئے ہیں؟

ارادہ تو یہی تھا کہ جو خطوط اور جو مطبوعہ مضامین میرے پاس آئے ہیں ان کے اور ابھی قریب ہی اخبارات ورسائل میں شائع شدہ مضامین کے حوالہ سے بھی کچھ گفتگو قارئین سے کی جائے مگر وہ اس قدر سطحی اور غیر سنجیدہ قسم کے مضامین ہیں کہ ان کے جواب میں وقت کا ضائع کرنا اپنا اور قارئین دونوں کے وقت کا نقصان کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ تمام فقہاء اسلام کے نزدیک عورتوں کا نمازوں کے لئے مسجد جانا "محض ایک جائز عمل" ہے۔ وہ بھی انتہائی کڑی شرائط کے ساتھ، ان شرائط کی تکمیل نہ کی جائے تو پھر "ناجائز اور حرام" ہے اور اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھ لینا افضل اور بہتر ہے۔ موجودہ حالات میں عورتوں سے ان پابندیوں کی نہ توقع ہے نہ ان کا مزاج، تو اسلم یہی ہے کہ سداً للذریعہ انہیں مسجد جانے سے روکا جائے، نہ کہ اس کی ترغیب دی جائے، اس کے علاوہ جو کچھ کہا سنا جارہا ہے وہ حقیقت سے بعید، کورفہمی اور کم علمی کا نتیجہ ہے۔ **واللّٰہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم**

مسئلہ تین طلاق اور سپریم کورٹ کا ایک استفسار

(الف) ہمارے یہاں شریعت کے تمام احکام باقاعدہ مدون اور مرتب ہیں، صدیوں قبل سے ہماری جامعات میں صبح وشام پڑھے پڑھائے بھی جاتے ہیں، ان میں سے بہت سے موٹے موٹے مسائل واحکام تو ایسے ہیں کہ ان کو عوام بھی اچھی طرح جانتے ہیں، بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن میں ہمارے فقہاء کے درمیان شروع ہی سے اصولی وفروعی اختلاف پایا جاتا ہے، اس لئے یہ اختلاف کا ہونا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے، اور اس اختلاف کی وجہ ہی سے سب مسلمان (بجز غیر مقلدین کے) کسی نہ کسی فقیہ مجتہد کی اتباع میں بلا شک وشبہ لگے ہوئے ہیں، مسلمانوں میں جب بھی کوئی قضیہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے اپنے ملک میں موجود اپنے مسلک کے مفتیوں سے رجوع ہوتے ہیں، اور ان کے فتویٰ پر بے چوں وچرا مخلصانہ عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ یہ روایت اور ترتیب اسلام کے صدرِ اول سے اب تک بتواتر چلی آرہی ہے اور اب بھی قائم ہے۔

(ب) ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کی تعمیر جمہوریت اور ہمہ قومیت کے بلند بانگ نعروں سے کی گئی ہے، اس کے دستور میں تمام قوموں کو شہری حقوق میں یکسانیت دی گئی ہے، اسی کی روشنی میں ہر قوم کے خاص مذہبی امور کا ان کے مذہبی مسلّمہ احکام کے تابع ہونا اور حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہونا قانوناً تسلیم شدہ ہے، ایسے ہی چند خالص مذہبی امور میں ”نکاح وطلاق“ کا مسئلہ بھی ہے، حکومت اور عدلیہ اسے ”مسلم پرسنل لاء“ کا جز سمجھتی ہے، اسی وجہ سے وہ دستوری طور پر اس کی

پابند ہے کہ مسلمان فریقین ان سے اگر رجوع ہوں تو وہ ان کے مذہب کی روشنی میں فیصلہ صادر کریں چنانچہ کرتی بھی ہیں۔

(ج) ہمارے ملک کی موجودہ فضاء قومی عصبیت کی بدترین شکار ہے، اکثریتی فرقہ جو اگر چہ اندرونی اختلافات اور ذات پات کے اعتبار سے سیکڑوں فرقوں میں منتشر و منقسم ہے، مگر بمقابلۂ مسلم ایک نام پر مجتمع اکثریت کہلاتا ہے، اس میں سے ایک ایسا کٹر پسند گروہ پیدا ہوگیا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ ہندو قومیت ہی ملک کی پہچان ہو، مذاہب کو پنپنے کی دستوری آزادی ختم ہوکر پورے ملک میں یکساں سیول کوڈ نافذ ہوجائے، اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لئے یہی ایک قانون واجب التسلیم ہو، اس کام کی راہ میں انہیں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان نظر آتے ہیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے "مسلم پرسنل لا" کو کسی طرح ناقابلِ عمل قرار دیا جائے، اس کیلئے وہ "مسلم پرسنل لا" کو مسلمانوں خصوصاً ان کی عورتوں کے حق میں ظلم وزیادتی ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، کیوں کہ اگر اس کی ڈگر گرجائے گی تو اور کوئی "لاء" ایسا نہیں ہے جس کے ختم کرنے میں کچھ دیر لگے، اس مقصد کو پورا کرنیکی خاطر آئے دن نئے نئے ہتھکنڈے اختیار کئے جارہے ہیں اور غیر ضروری مباحث کو ہوا دیکر اسے سب سے بڑا مسئلہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، خصوصاً "حقوقِ نسواں" کا مسئلہ کسی نہ کسی عنوان سے اور وقفہ وقفہ سے موضوعِ بحث بنایا جارہا ہے، خواہ وہ نفقۂ مطلقہ کا شاہ بانو کیس ہو، یا کم سنہ کے نکاح کا آمنہ بی کیس ہو، یا ایک مجلس کی طلاقوں کا خاتون النساء کیس ہو، ان سب کے پیچھے ایک ہی ذہن اور ایک ہی قوت کارفرما ہے۔

(د) ہندوستان کے ایک عظیم عالم دین اور مفکر کے بقول "جب کوئی وباء عام ہوتی ہے تو اس کے وبائی اثرات سے کوئی نہیں بچتا" صورتحال یہ ہے کہ ہندوتوا کے

اس ظالمانہ نظریئے کی زد میں ہمارے ملک کے سیاسی حلقے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ حتیٰ کہ وکلاء اور جسٹس تک آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، جن کی مثالیں اس قدر سامنے آچکی ہیں کہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس میں ایک مسئلہ "ایک مجلس کی تین طلاق" کا بھی ہے، ابھی کچھ دنوں پہلے اس مسئلہ میں سپریم کورٹ کے ایک استفسار نے موضوعاتی ہنگامہ برپا کر دیا تھا، جس کے بعد پورے ملک کے ہمہ لسانی اخبارات میں جو بحث ومباحثے ہوئے اور اہل وناا ہل کے قلم سے غیر ضروری بلکہ مضر ومفسد مضامین کا جو سلسلہ چلا اور جسے بڑی مشکل سے ملت کے دردمند ودانشور اہلِ علم نے قابو میں لے کر ختم کیا، ان کے ناگوار نقوش ابھی ذہنوں سے مٹے بھی نہیں تھے کہ اب الہ آباد ہائی کورٹ نے ایک دفعہ اور اس مسئلہ کو ہوا دیدی۔

(ہ) کیا اتنے اونچے منصب پر فائز ہونے والے اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر مذہب کا جو "پرسنل لا" ہوگا اس کی کلیات وجزئیات کوئی اور نہیں بلکہ اس مذہب کے ماہرین ومحققین ہی صحیح معنوں میں حل کر سکتے ہیں، عدالت ان کے طئے کردہ فیصلے کو قوتِ عدلیہ کے ذریعہ صرف نافذ وجاری کر سکتی ہے، پھر جب ایک مجلس میں دی جانے والی تین طلاقوں کا واقع ہوجانا حضراتِ صحابہؓ کے دور سے لیکر آج تک کہا جاسکتا ہے کہ امت کے ۹۹/فی صد علماء وفقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے تو اسے چھوڑ کر ایک فی صد کے اختلاف کی بنیاد پر اس اختلاف کی حمایت وتائید میں فیصلے کرنا سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کے پیچھے کون سا جذبۂ انصاف کارفرما ہے؟ بجز اسکے کہ اختلاف کی اس رائی کو پربت بنا کر ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں جو مسلم پرسنل لا کے ناقابلِ عمل ہونے کی باتیں کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دستور میں دی گئی آزادئ مذہب کو ختم کر کے ان کے عقلوں کے مطابق ایک "یکساں عوامی قانون" بنا کر تمام اقوام پر زبردستی تھوپ دیا جائے۔

(و)اس سب کے باوجود قصور صرف اربابِ اقتدار کا نہیں، ہمارا اپنا بھی ہے، ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں سے راضی کیوں نہیں ہیں؟ ہم اپنے نزاعی مسائل اور نکاح وطلاق کی پیچیدگیوں کو خود علماءِ اسلام، شرعی پنچایتوں اور دار القضاء سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ بلکہ ترغیب دینے کے باوجود "کورٹ کچھری" ہی کی ضد کیوں لیکر بیٹھ جاتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی مسائل اور مخصوص شرعی احکام — پرسنل لا — کے سلسلہ میں علماء اسلام اور کتاب وسنت کی جانب رجوع کرنے کے بجائے قومی عدالتوں کا رخ وہی لوگ کرتے ہیں جو صاحبِ غرض ہوتے ہیں، جن کی دال میں کالا ہوتا ہے، اور مقصد حصول انصاف کے بجائے حصولِ اغراض ہوتا ہے، چونکہ آج کل محض حبِ مال اور خواہشِ نفس کی بنیاد پر طلاق دینے کا سلسلہ بڑھتا جارہا ہے، جبکہ اسلام نے ناگزیر حکمتوں اور اہم مصلحتوں کی بناء پر اس کی گنجائش رکھی ہے، پھر اس گنجائش کے بے جا استعمال کو روکنے کیلئے اس کو "ابغض المباحات" یعنی ناپسندیدہ جائز قرار دیا، اور ازدواجی زندگی کے ناموافق حالات پر صبر وثبات کے ساتھ راضی برضا رہنے والوں کیلئے بڑے بڑے اجر وثواب کے وعدے فرمائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ شریف وسنجیدہ لوگ باوجود اختلافِ طبائع کے اس کے نام سے ہچکچاتے ہیں اور زبان پر لانے سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔ لیکن اب خودغرضی ونفس پرستی کی صورتحال یہ ہے کہ مرد "مال" کی خاطر طلاق کا استعمال کررہے ہیں اور عورتیں "مال" ہی کی خاطر عدالتوں سے استمداد کررہی ہیں۔

غرض یہ کہ مسلمان جب تک حتی المقدور ان ناپسندیدہ امور سے اجتناب کے لئے آمادہ نہ ہوں گے اور ناگزیر صورتوں میں اہل علم ودین کے مشورہ وہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو باہمی رضامندیوں کے ذریعہ حل کرنے کا رواج نہیں

ڈالیں گے، تب تک یہ فتنے رہ رہ کر کھڑے کیئے جاتے رہیں گے۔جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدام دین کی وہ صلاحیتیں اور توانائیاں جو اقدامی وتعمیری میدانوں میں استعمال ہونی چاہیں وہ دفاعی میدانوں میں کھپتی رہیں گی، جس سے امت کا جو نقصان ہوگا وہ کسی سمجھدار پر مخفی نہیں!

خدا کرے کہ ملتِ اسلامیہ طلاق کے اس رستے ہوئے ناسور کی خطرناکی کو سمجھیں اور ہمت وحوصلہ افہام وتفہیم کے ذریعہ اس کی اصلاح کی کوششیں کریں۔

(آمین)

نماز جنازہ کہاں پڑھنی چاہئے؟

یہ مسئلہ کہ نماز جنازہ مسجد کے اندر ہونی چاہیے یا خارجِ مسجد؟ حضراتِ صحابہ اکرامؓ کے دور ہی سے مختلف فیہ رہا ہے اسی وجہ سے اس سلسلہ میں واردشدہ احادیث شریفہ میں بھی بظاہر اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے، اور اسی وجہ سے اس سلسلہ میں فقہاءِ متقدمین اور ائمہ مجتہدین بھی اپنی اپنی اجتہادی مساعی اور صحیح ترین موقف کی تلاشِ واقعی کے نتیجہ میں تین مختلف مواقف میں منقسم نظر آتے ہیں چنانچہ: امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک مسجد میں نمازِ جنازہ ممنوع اور مکروہ تحریمی ہے، امام احمد بن حنبلؒ جنازہ کی وجہ سے مسجد کے ملوث ہونے کا اندیشہ ہو تو ممنوع بصورتِ دیگر جائز سمجھتے ہیں اور امام شافعیؒ علی الاطلاق مندوب قرار دیتے ہیں۔[۱] لیکن انکے نزدیک بھی خارجِ مسجد پڑھنا ہی افضل ہے۔

لیکن ہمارے علاقوں میں عوام الناس باوجود حنفی ہونے کے دعوئے کے بھی اس مسئلہ میں تسامح برتتے ہیں اور باوجود کوئی خاص مجبوری نہ ہونے کے بھی مسجد ہی میں نمازِ جنازہ پر اصرار کرتے ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص سنت کے مطابق عمل کررہا ہو تو اس پر اعتراض کرتے ہیں، خود دین کے بنیادی احکام سے ناواقف ہیں دوسروں پر تنقید اور جہالت وجدت کا الزام لگاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر لوگوں کی زبان سے طرح طرح کی باتیں سننے کو ملتی ہیں، حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ جو مسئلہ کتابوں میں صاف لکھا ہوا ہے، اس کے سلسلہ میں احادیث موجود

---

[۱] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ

ہیں، محدثین کی تصریحات موجود ہیں، فتاویٰ موجود ہیں اس کو جہل و بے دینی کہتے ہوئے ذرا باک محسوس نہیں کرتے ـــــ واضح رہے کہ اگر کسی کا مسلک ہی جواز کا ہے اور وہ اپنے علماء کی تحقیق پر عمل کررہے ہوں مثلاً شافعی حضرات تو الگ بات ہے ـــــ لیکن جو لوگ خود حنفی ہونے کا اور امام اعظمؒ کی تحقیق پر بھروسہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اس کے باوجود ایسے بے جا اعتراضات بلکہ ناروا کلمات زبان سے نکالتے ہیں تو یہ انکی کس قدر افسوسناک صورتحال ہے۔

ابھی چند دن قبل ایک جنازہ میں شرکت کا موقع ملا، میت کے اولیاء کو علم تھا کہ مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہ تحریمی ہے ان لوگوں نے طے کیا تھا کہ نماز کے بعد خارج المسجد جنازہ رکھ کر نماز جنازہ ادا کی جائیگی جب فرض نماز ہو چکی تو بعض لوگوں نے حسبِ معمول مداخلت کرتے ہوئے مسجد میں جنازہ لے آنے کیلئے اصرار شروع کیا، جب متعلقہ لوگ اپنے نظام کے مطابق باہر ہی صفیں بنانے لگے اور بقیہ مصلی بھی باہر آنے لگے تو ایک صاحب خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں "یہ نئے نئے طریقے نکالنے والوں کی گردن ماردینی چاہیے" سبحان اللہ! خود جہالت میں سرتاپا ڈوبے ہوئے ہیں اور احکام کے مطابق عمل کرنیوالوں کو موجب گردن زدنی سمجھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آج کل لوگ دین کو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے زمانہ کے رسم ورواج سے جوڑ کر دیکھتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے کو عالم اور امت کا راہنما بتلاتے ہیں پھر بھی عوام الناس کے سامنے صحیح مسئلہ کی وضاحت نہیں کرتے ایسے مواقع پر یا تو خاموشی اختیار کرتے ہیں یا ان کی تائید کرتے ہیں جبکہ یہی حضرات بعض بدعات ورسومات کے ترک کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوتے اور گھن گرج کے ساتھ اس کو ثابت

کرنے کی زبردستی کوشش میں لگے رہتے ہیں، خدا جانے حق کے اظہار کے وقت انکی یہ غیرت وحمیت کہاں چلی جاتی ہے۔ **نعوذ باللہ من المداھنة و کتمان الحق فی الدین .**

اسلئے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مسئلہ کو مفصلاً تحریر کردیا جائے تاکہ متلاشیانِ حق کو فائدہ ہو اور جہلاء اپنی جہالت سے رجوع کریں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اس فقہی اختلاف کی وجہ اس مسئلہ میں منقول روایات کا اختلاف ہے، ذیل میں وہ روایات کو درج کیا جاتا ہے اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے موقف ومسلک کی وجوہِ ترجیح واسبابِ صحت کو واضح کیا جائے گا۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی اس کیلئے کچھ بھی (ثواب) نہیں ہے“ [۱]

اس روایت کی الفاظ کے اختلاف کے ساتھ امام احمد امام طحاوی امام ابن ماجہ اورامام ابن ابی شیبہ نے بھی اپنی اپنی کتب میں تخریج کی ہے کسی میں **”فلا شئی له“** کسی میں **”فلا صلوٰۃ له“**، کسی میں **”فلا اجر له“** اور کسی میں **”فلیس له شئی“** کے الفاظ ہیں۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہودی لوگ ایک زناکار جوڑے کو لیکر آئے تو آپ نے ان کے حق میں ”رجم“ کا فیصلہ فرمایا: چنانچہ انھیں مسجد کے باہر جو جنازہ گاہ تھی اس کے قریب سنگسار کردیا گیا۔ [۲]

(۳) ابن بطالؒ نے ابنِ حبیبؒ سے روایت کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں جنازہ کیلئے ایک جگہ مسجد سے باہر متصلاً مشرقی گوشہ میں متعین تھی۔ [۳]

---

[۱] ابوداؤد ۲/۹۸، [۲] بخاری: ۲/۹۰ [۳] فتح الباری ۳/۳۵۶

(۴) محمد بن عبداللہ بن جحشؓ سے ایک واقعہ کے ضمن میں روایت ہے کہ ہم لوگ مسجد کے سامنے اس جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں جنازے رکھے جاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔[۱]

(۵) حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نجاشی شاہ حبشہ کے انتقال کی خبر پہونچی تو آپ نے عیدگاہ میں لوگوں کی جماعت بنوا کران کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔[۲]

(۶) حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ اگر جنازہ گاہ میں جگہ تنگ ہوتی صحابہ کرامؓ نماز پڑھے بغیر ہی لوٹ جاتے تھے۔[۳]

(۷) کشف الغمہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ وہ حضرات اگر جنازہ گاہ میں جگہ تنگ ہوتی اور جگہ نہ ملتی تو واپس لوٹ جاتے تھے (مگر مسجد میں نہ پڑھتے تھے)۔[۴]

(۸) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے انتقال پر انکے جنازہ کو مسجد میں لانے کا حکم دیا تا کہ وہ ان کیلئے دعا کریں۔اس پر لوگوں نے اعتراض کیا (کہ جنازہ کو مسجد میں کیوں طلب فرما رہی ہیں؟) حضرت عائشہؓ کو صحابہ کرامؓ کے اس انکار واعتراض کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا لوگ اتنی جلدی بھول گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل بن بیضاء کی نمازِ جنازہ مسجد ہی میں پڑھی تھی۔[۵]

(۹) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہیکہ حضرت عمرؓ کی نمازِ جنازہ مسجد میں ادا کی گئی (۸) اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بھی مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے انکی نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھائی تھی۔[۶]

---

۱ مسند احمد، ۲ بخاری: ۹۰/۲ ۳ اوجز المسالک ۴ مؤطا امام مالک: ص۱۲۶، ۵ ایضاً ۶ مصنف ابن ابی شیبہ، دیکھئے فیض الباری ۴۷۳/۲

مذکورہ بالا روایات میں سے پہلی روایت سے مسجد میں نمازِ جنازہ کی صراحۃً ممانعت معلوم ہوتی ہے یہ حدیث فنی اعتبار سے معتبر ہے۔[۱]

دوسری، تیسری اور چوتھی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نمازِ جنازہ کے لئے مسجدِ نبویؐ سے متصل اور باہر ایک جگہ مختص تھی جہاں نمازِ جنازہ ادا کی جاتی تھی۔

پانچویں روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نماز جنازہ عیدگاہ میں ادا فرماتے تھے بلکہ بقولِ حضرت عطاؒ کے اکثر نماز جنازہ عیدگاہ ہی میں ہوتی تھی۔[۲]

چھٹی اور ساتویں روایت سے واضح ہے کہ حضراتِ شیخین اور عام صحابہؓ بھی جنازہ گاہ میں اگر جگہ نہ ملتی تو مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کے بجائے واپس ہوجانے کو ترجیح دیتے تھے۔

آٹھویں روایت مشترک الالزام ہے جس میں حضرت عائشہؓ کے جنازہ کو مسجد میں لانے کے مطالبے اور صحابہؓ کے اعتراض پر ابن بیضاء کی نماز کے واقعہ سے استدلال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں نمازِ جنازہ درست ہے، اور صحابہ کرامؓ کے انکار واعتراض سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اس زمانہ میں دستور خارجِ مسجد نمازِ جنازہ پڑھنے کا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہوں نے علی العموم مسجد میں نمازِ جنازہ سے اجتناب کرتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔

نویں روایت میں اگرچہ حضراتِ شیخین پر نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی جانیکی خبر ہے مگر اس میں یہ احتمال ہے کہ چونکہ ان کی حجرۂ عائشہؓ میں تدفین ہونی تھی اور اس کے لئے جنازہ کو مسجد میں بہرحال لانا ہی تھا، اسلئے انتظاماً وضرورۃً نماز بھی وہیں پڑھ لینے کو مناسب سمجھا گیا۔[۳]

---

[۱] تفصیل فیض الباری، اوجز المسالک وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، [۲] اوجز المسالک ۴/۲۳۵، [۳] فیض الباری،

بہر حال اس باب میں بنیاد حضرت ابو ہریرۃؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات کو بنایا گیا ہے قائلین جواز حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں اور مانعین حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں کی حدیث سے۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو خود حضرت عائشہؓ کی روایت بھی ممانعت ہی کی تائید کرتی ہے۔ اسلئے کہ ان کی ہدایت پر عام صحابہ کرامؓ مہاجرین وانصار سب کو اعتراض ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہؓ میں جنازے علی العموم مسجد میں نہیں لائے جاتے تھے اور ان کی نمازیں خارجِ مسجد ادا کی جاتی تھیں۔ چنانچہ خود حضرت عائشہؓ نے بھی ان کے اعتراض کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ حضورؐ کے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا تھا، بلکہ صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا جس کا مطلب یہی ہے کہ علی العموم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی تھی، رہ گیا وہ واقعہ جسکی جانب انہوں نے اشارہ فرمایا تو ایک آدھ واقعہ کی عام معمول کے مقابلہ میں تاویل کی جاسکتی ہے کہ کسی وقتی ضرورت اور عارضی مصلحت کے ماتحت پیش آیا ہوگا چنانچہ شمس الائمہؒ نے تاویل فرمائی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت معتکف تھے خود باہر نہیں آسکتے تھے۔[1] اس لئے جنازہ کو مسجد میں طلب فرما کر نماز پڑھادی، خود باہر تشریف نہیں لے گئے۔

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض جنازوں کے اندرونِ مسجد پڑھنے کے واقعات کسی عارض کی بناء پر پیش آئے ہونگے یا پھر بیانِ جواز کے لئے آپ نے ایسا کیا ہوگا۔[2]

اسی طرح حضرت عائشہؓ والی حدیث میں مؤطا امام مالک کی روایت میں **لتدعو به** کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کے جنازہ کو نماز کے

---

[1] اوجز المسالک ۲۳۲/۴، [2] فتح الباری ۳۵۶/۳،

لئے نہیں بلکہ دعا کیلئے طلب کیا تھا چونکہ ان کا مکان داخلِ مسجد تھا اسلئے مسجد میں لایا گیا اس پر بھی صحابہؓ کو اعتراض ہوا۔

غالبًا یہی وجہ ہے کہ خود امام بخاری نے اس باب کے تحت حضرت عائشہؓ کی روایت کی تخریج نہیں فرمائی بلکہ واقعہ نجاشی کا ذکر فرمایا۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی مسجد میں نمازِ جنازہ کے ثبوت میں متردد ہیں اور اس مسئلہ میں ممانعت کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتے ہیں۔[۱] اسلئے کہ نجاشی کے وصال کی اطلاع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ کو لیکر عیدگاہ جانا اور وہاں نماز ادا کرنا نبی کریم ﷺ کے خارجِ مسجد نمازِ جنازہ ادا کرنے کے اہتمام کو ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح ابن رشدؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف کا اصل سبب حضرت عائشہؓ اور ابو ہریرۃؓ کی روایات کا اختلاف ہے حضرت عائشہؓ کی روایت حکم کو ثابت کرنے والی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت غیر ثابت ہے یا غیر متفق علی الثبوت ہے تاہم صحابہ کرامؓ کا حضرت عائشہؓ کے اس عمل پر نکیر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے دور میں جنازوں کا مسجد میں لے جانا غیر معروف اور خلافِ معمول تھا اس کی مزید تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نجاشی کی نمازِ جنازہ کیلئے عیدگاہ تشریف لیجانے سے بھی ہوتی ہے۔[۲]

خود امام ابن قیمؒ اس مسئلہ میں طویل کلام کے بعد فرماتے ہیں: خلاصہ کلام وہی ہے جو ہم نے شروع میں کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ان کا معمول شریف نمازِ جنازہ خارجِ مسجد پڑھنے کا ہی تھا، سوائے کسی عذر کے، پس (اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ) جائز تو مسجد میں بھی ہے لیکن افضل خارجِ مسجد پڑھنا ہی ہے۔

---

[۱] فیض الباری ۲/۴۷۳، [۲] اوجز المسالک ۴/۲۳۴

امام زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ابی ہریرۃؓ کے علاوہ وہ حدیث بھی مسجد میں نماز جنازہ کی ممانعت کی دلیل ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناسمجھ بچوں اور پاگلوں سے مسجد کو محفوظ رکھنے کا حکم دیا ہے (کیونکہ ان سے غیر اختیاری طور پر مسجد میں گندگی ہوسکتی ہے)اور ظاہر ہے کہ نادانی ولاشعوری اور مسجد کے تلوث کے خطرہ میں میت بدرجہ ٔ اولیٰ داخل ہے۔[۱]

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جب روایات میں اختلاف ہوگیا تو ہم نے اس تنقیح کی ضرورت محسوس کی کہ ان میں سے کونسی روایت مقدم ہے اور کونسی مؤخر۔ تاکہ مؤخر کو مقدم کیلئے ناسخ قرار دیکر مقدم کو منسوخ سمجھا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے عمل کی خبر دے رہی ہے جس میں اباحت پائی جاتی ہے اور اس سے قبل ممانعت ثابت نہیں ہے برخلاف اس کے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسجد میں نمازِ جنازہ کی ممانعت ثابت کررہی ہے۔ جس سے قبل اباحت موجود ہے لہذا حصرت ابو ہریرہؓ کی حدیث حضرت عائشہؓ کی حدیث کے حق میں ناسخ ،اور حدیثِ عائشہؓ منسوخ قرار پائی بالخصوص جبکہ حضرت عائشہؓ کے عمل پر صحابہ کرامؓ کی نکیر واعتراض بھی ثابت ہے۔[۲]

خلاصہ یہ ہیکہ احادیث وآثار اور شارحینِ حدیث کی توجیہات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام فرمایا تھا کہ نماز جنازہ خارجِ مسجد ہی ہوا کرے اور اس کے لئے مسجد کے باہر جگہ بھی متعین فرمادی تھی یا پھر عیدگاہ میں ادا کرلی جاتی تھی۔ کبھی کبھار ضرورۃً یا بیانِ جواز کے لئے آپ نے مسجد میں بھی نمازِ جنازہ پڑھادی تھی مگر ایسا دو تین مرتبہ سے زائد نہیں ہوا، نیز صحابہ

---

[۱] اوجز المسالک ۳۴۵/۴، [۲] ازجاجۃ المصابیح ۴۶۳/۱ نقلاً عن شرح الہدایۃ

کرامؓ بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے بلکہ جنازہ گاہ میں جگہ تنگ ہوتو نماز جنازہ میں شرکت کے بغیر واپس ہو جایا کرتے تھے۔ اسلئے صحیح یہی ہے کہ بلا واقعی ضرورت کے مسجد میں نمازِ جنازہ کی ادائیگی مکروہِ تحریمی ہے ہمارے فقہاء نے یہی موقف اختیار کیا ہے چنانچہ ردالمحتار میں ہے: "مسجد میں نمازِ جنازہ مکروہِ تحریمی ہے" ۱

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: جن مسجدوں میں پنجوقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے انمیں نمازِ جنازہ مکروہ (تحریمی) ہے، خواہ میت اور نمازی دونوں مسجد میں ہوں خواہ میت باہر رکھ کر نمازی مسجد میں ہوں۔ ۲

امام محمدؒ فرماتے ہیں: نماز جنازہ مسجد میں نہیں پڑھی جائیگی حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت میں ممانعت کی وجہ سے، اور اسلئے بھی کہ آپؐ کے زمانہ میں جنازے خارجِ مسجد رکھے جاتے تھے، اور آپؐ نے جنازہ گاہ خارجِ مسجد متعین فرمائی ہوئی تھی وہیں نمازِ جنازہ پڑھاتے تھے اور اسلئے بھی کہ اگر مسجد میں نمازِ جنازہ کو آپؐ بہتر سمجھتے تو اکثر مسجد میں پڑھاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ ۳

یہی موقف محدثِ دکن ابوالحسنات حضرت عبداللہ شاہؒ کا ہے جو ان کی تصنیف "زجاجۃ المصابیح" میں انکے حاشیہ سے واضح ہے اور یہی "جامعہ نظامیہ" میں مسلم معروف کتاب "نصاب اہلِ خدماتِ شرعیہ" میں لکھا ہوا ہے۔ (نماز جنازہ مسجد ہی کے اندر پڑھنا چاہے (تو مکروہِ تحریمی ہے اس کے ثواب جاتا رہتا ہے) اگر بارش وغیرہ عذر ہوتو درست ہے۔)

مذکورہ بالا احادیث شریفہ، اخبار وآثار، شراح حدیث کی صراحتوں اور فقہا کی وضاحتوں کا خلاصہ یہ ہی کہ:

☆ نماز جنازہ کا مسجد میں بلاضرورت ادا کرنا علماء احناف کے نزدیک مکروہ

۱ ردالمحتار ۳/۱۲۶، ۲ فتاویٰ عالمگیری: ۱/۱۶۵، ۳ مرقاۃ: ۴/۴۹

تحریمی ہے۔اورسوائے امام شافعیؒ کے تمام علماءامت کے نزدیک مکروہ وناپسندیدہ ہے یاکم ازکم خلاف اولیٰ ضرور ہےاورایک روایت کے مطابق خودامام شافعیؒ کے نزدیک بھی افضل مسجد کے باہرادا کرنا ہی ہے۔

☆ضرورت اور مجبوری (مثلاً بارش ،یاشدیدگرمی ،یاصحن والی مسجد کاقریب میں نہ ہونااورکوئی میدان عیدگاہ وغیرہ بھی نہ ہونا) پیش آجائے تواندرون مسجد پڑھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

☆مسجد سے مراد" جماعت خانہ" ہے جہاں پنجوقتہ باجماعت نمازادا کی جاتی ہے۔

☆ میت کےاولیاء کی طرف سےخودکوشش کی جانی چاہئے کہ محلّہ کی مسجد میں خارجاً گنجائش نہ ہوتو قرب وجوار میں کسی مناسب جگہ کاانتخاب کریں،مثلاً عیدگاہ، کوئی میدان ،یاکوئی دینی مدرسہ،آخرالذکر میں تو یہ فائدہ بھی ہے کہ علماء وطلبہ دین کی شرکت بھی ہوجاتی ہے۔

☆مساجدتعمیرکرتے وقت مسجد کے متصل جنازہ گاہ بھی بنانے کالحاظ کرنا چاہئے۔تاکہ سنت پرعمل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

☆عوام الناس کوچاہئے کہ کوئی عالم دین اس سلسلہ میں مسئلہ بتائے یااپنے مقتداہونے کی وجہ سے امامت سے معذرت کرےتو اس کے عذرکوخندہ پیشانی اوراخلاق سے قبول کریں،ممکن ہوتو خودبھی عمل کی صورت نکالیں ۔نہیں تواپنی مجبوری ومشکل بتلادیں۔مگرصحیح بات بتلانے والے کی مخالفت نہ کریں۔

☆اس سب کے باوجوداگرکسی جگہ مسجدمیں نماز جنازہ ہورہی ہوتو جولوگ مسئلہ کاعلم رکھتے ہیں مگرعمل نہیں کراسکتے انہیں ایسے موقع پرنماز میں شرکت کرلینی چاہئے اورسخت موقف نہ اختیارکرنا چاہئے ۔کیونکہ جومسائل قطعی حرام وناجائزنہیں

ہیں ان پر نکیر کرنے میں بہت ہی حکمت سے کام لینا چاہئے ۔ بالخصوص جذباتی مواقع پر ایسے مسائل کا چھیڑنا اکثر بے سود بلکہ مضر ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

واللہ الموفق وھو الھادی وصلی اللہ علی النبی الکریم

مسئلہ سود

سود (ربا) کسے کہتے ہیں:-

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر وہ قرض جو نفع حاصل کرے، سود ہے“ [۱]

”ربا کے معنیٰ لغت میں زیادتی کے ہیں، تحریم ربوا والی آیت میں لفظ ربا سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابل میں کوئی عوض نہ ہو“ [۲]

امام جصاصؒ نے فرمایا: ”ربا وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کیلئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال سے زائد بھی کچھ رقم ادا کرے گا“ [۳]

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: قرآن مجید میں جو ربوا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو ادھار قرض پر لیا جائے اور اسی کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے ربا کی دوسری قسم کا علم ہوا یعنی خاص خاص اقسام بیع وشراء میں کمی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیث متواتر آتی ہیں۔ [۴]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ”ربوا کی ان دو قسموں میں سے پہلی قسم (یعنی قرض ادھار پر نفع) جو ربا القرآن کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری امت محمدیہ میں کبھی اختلاف نہیں ہوا، اور آج کل جو ربا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے اور مسئلہ سود میں جو زیر بحث ہے وہ یہی ربا ہے جس کی حرمت قرآن مجید کی سات آیتوں، چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع امت سے ثابت ہے۔“ [۵]

---

[۱] الجامع الصغیر، [۲] معجم لغۃ الفقہاء: ۲۱۸، [۳] احکام القرآن للعثمانی: ۱/۶۶۶، [۴] شرح معانی الآثار: ۲/۲۳۴، [۵] معارف القرآن: ۱/۶۰۸

اب سود سے متعلق آیات واحادیث مطالعہ فرمائیں۔

سود کی حرمت آیات قرآنیہ کی روشنی میں

سود حرام ہے

یَـااَیُّهَـا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَأْکُلُوْا الرِّبوٰ اَضْعَافاً مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوْا الـلّٰـهَ لَـعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاتَّقُوْا النَّارَالَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ

اے ایمان والو مت کھاؤ سود کو بڑھا چڑھا کر (کہ اصل سے کئی گنا زائد ہو جائے) اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اصل سے ایک پائی بھی زیادہ لینا حرام ہے، دوسری آیات سے مطلقاً حرمت ثابت ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تھوڑا سا کھا سکتے ہیں زیادہ نہیں کھا سکتے۔

جہنم میں سودخود کفار کے ساتھ ہونگے

سود کی حرمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے[2]

مفسرین نے فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ سودخود جہنم کے اس طبقہ میں ہوں گے جن میں کفار رہیں گے۔

سودخود قبر سے صحیح نہیں اٹھ پائے گا

اَلَّذِیْنَ یَأْکُلُوْنَ الرِّبوٰ لاَ یَقُوْمُوْنَ

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اپنی قبروں

---

[1] سورۂ آل عمران: ۱۳۰، [2] ایضاً، [3] مرقاۃ: ۴۹/۴

اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَاالۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَیۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰی فَلَهٗ مَاسَلَفَ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ

سے نہیں کھڑے ہونگے مگر اس شخص کیطرح جسے جنات نے لپٹ کر بدحواس بنادیا ہوایسا اس لئے ہوگا کہ ان لوگوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو مثل سود ہی کے ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اورسود کوحرام کیا ہے پھر جس کے پاس نصیحت پہونچی اور وہ باز آ گیا تو اس کیلئے ہے وہ جو ہو چکا اوراس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اور جوکوئی پھراس جرم کا ارتکاب کرے تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس ہمیشہ رہیں گے۔[۱]

یعنی جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو اٹھائیں گےتو سب لوگ محشر کی طرف دوڑ پڑیں گے،سوائے سودخوروں کے وہ کھڑے ہونا چاہیں گے مگرآسیب زدہ کی طرح گر پڑیں گے،اس لئے کہ جب انہوں نے سود جیسی حرام چیز کواللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود کھایا تو اس حرام غذاکوان کے پیٹوں میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر بھاری اوروزنی بنادیں گے کہ اس کا بوجھ نہ اٹھاسک کر وہ بار بارگر پڑیں گے، اوران کی یہ کیفیت سرمحشر ایک علامت ہوگی جس کے ذریعہ سے سب پہچانیں گے کہ یہ سودخور ہیں۔

---

[۱] سورۃ البقرۃ:۲۷۵

سود خوری اللہ سے جنگ ہے

يَـاَيُّهَـا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اتَّقُوۡا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَـابَـقِـىَ مِـنَ الرِّبٰوٓا اِنۡ كُـنۡتُـمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَـأۡذَنُـوۡا بِـحَـرۡبٍ مِّـنَ اللّٰـهِ وَرَسُـوۡلِـهٖ وَاِنۡ تُبۡتُـمۡ فَـلَـكُـمۡ رُءُوۡسُ اَمۡـوَالِكُمۡ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور مابقیہ سود چھوڑ دو اگر تم واقعی ایماندار ہو پھر اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تیار ہو جاؤ اللہ اور اس کے رسول کیساتھ جنگ کرنے کے لئے، اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے نہ تم کسی پر ظلم کر پاؤ گے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائیگا۔[1]

یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے ہو وہ لے چکے، اور اب جو بقایا رہ گیا ہے اس کا مطالبہ مت کرو، ایمانداری اور وفاداری کا یہی تقاضہ ہے اور اگر تم اس کو نہیں چھوڑو گے تو یاد رکھو تم اس نافرمانی کی وجہ سے تم اللہ کے نزدیک وفاداروں کی فہرست سے نکل کر باغیوں کی فہرست میں داخل ہو گئے، جس کے نتیجہ میں تمہیں اللہ ورسول کی طرف سے ان نتائج کو بھگتنا ہوگا جو بغاوت کی پاداش میں تمہارے لئے تجویز ہوں۔

یہود کی سزاؤں کا ایک سبب سود خوری بھی تھا

فَبِـظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَـلَيۡهِـمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِـلَّـتۡ لَهُـمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ

سو یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے

[1] سورۃ البقرۃ: ۲۷۸، ۲۷۹

كَثِيْراً وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰو وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَاباً اَلِيْماً

حلال تھیں ان پر حرام کردیں، اور بہ سبب اسکے وہ بہت سے آدمیوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ سے مانع بن جاتے تھے اور بہ سبب سود کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی، اور بہ سبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ سے کھاتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے۔[۱]

سودخوری تمام شریعتوں میں حرام ہے

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ سود تمام شریعتوں میں حرام کیا گیا ہے، چنانچہ تورات میں بھی سود لینے کی ممانعت اور بلاسودی قرضوں کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔

سود کی حرمت احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

(۱) سودخور ملعون ہے

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے، اور گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے، اور فرمایا ہے کہ اپنے جرم کی قباحت میں یہ سب برابر ہیں۔[۲]

[۱] سورۃ النساء: ۱۶۰، [۲] رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۲/۱۳۹

(۲) سودخوری زنا سے بدتر ہے

حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جان بوجھ کر سود کا ایک درھم کھالینا ۳۶ ر مرتبہ زنا کرنے سے بدتر ہے۔ [۱]

(۳) سودخود کے لئے جہنم ہی بہتر ہے

اسی حدیث کو ابنِ عباسؓ سے بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ جس شخص کا گوشت حرام سے پرورش پایا ہے جہنم اسکے لئے بہتر ہے۔ [۲]

(۴) سودخوری گھناؤنا جرم ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود میں ستر برائیاں ہیں ان میں ادنیٰ یہ ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے زنا کرے۔ [۳] (عیاذاً باللہ)

(۵) سود کی کثرت بھی قلت ہے

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ سود چاہے دیکھنے میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اپنے انجام کے اعتبار سے بہت کم ہو جاتا ہے۔ [۴]

(۶) سودخور کا پیٹ سانپوں کا گھر ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے شب معراج میں ایک ایسی جماعت کو دیکھا جن کے پیٹ رہایشی مکانوں کی طرح بڑے تھے، اور ان میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو باہر علانیہ نظر آرہے تھے، آپؐ نے جبرئیلؑ سے ان کی بابت دریافت فرمایا تو انھوں نے بتلایا کہ یہ سودخور ہیں۔ [۵]

[۱] رواہ احمد، مشکوٰۃ:۲/۱۴۲، [۲] ایضاً، [۳] ایضاً، [۴] ابن ماجہ، [۵] رواہ احمد، مشکوٰۃ:۲/۱۴۳

(۷) سود مہلکات میں سے ہے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو (۱) شرک (۲) جادو (۳) قتل (۴) یتیم کا مال کھانا (۵) سود کھانا (۶) میدانِ جہاد سے بھاگنا (۷) پارسا عورتوں پر تہمت لگانا۔ [۱]

(۸) سود خوری نزولِ عذاب کا ذریعہ ہے

حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی بستی میں زنا اور ربوٰ (سود) عام ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بستی والوں کا ہلاک کرنے فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ [۲]

(۹) سود خوری سے جنون عام ہو جاتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم میں سود عام ہو جائے تو ان میں ضرور جنون (پاگل پن) عام ہو جائے گا۔ [۳]

(۱۰) سود خور خون کی نہر میں تیرے گا

حضرت سمرہؓ ایک لمبی حدیث کے ذیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "سود خوروں کو مرنے سے لے کر قیامت تک اس طرح عذاب دیا جائیگا کہ خود جیسی سرخ نہر میں انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور جب وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو اس سودی مال کو پتھر میں تبدیل کر کے ان کے منہ پر اس سے مارا اور پیچھے ڈھکیلا جاتا رہے گا۔ [۴]

(۱۱) سود خور جنت کی نعمتوں سے محروم رہے گا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ چار لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے

---

[۱] بخاری و مسلم، [۲] ابویعلیٰ مثلہ رواہ ابوحاکم وصححہ، [۳] ابن ماجہ، [۴] بخاری،

اپنے ذمہ بطورحق کے لازم کرلیا ہے کہ انھیں نہ جنت میں داخل فرمائے گا نہ جنت کی نعمتوں کا مزہ چکھائے گا۔(۱) شراب پینے والا (۲) سود کھانے والا (۳) ناحق یتیم کا مال کھانے والا (۴) والدین کی نافرمانی کرنے والا۔[۱]

(۱۲)سودخوری ناقابلِ معافی جرم ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ عوف بن مالکؓ سے فرمایا ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کیئے جاتے ،ان میں سے ایک مال غنیمت میں چوری کرنا اور دوسرے سود کھانا ہے۔[۲]

(۱۳)سوداورشرک برابر ہیں

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سود کے مفاسد ستر سے بھی زائد ہیں اور شرک اس کے برابر ہے۔[۳]

(۱۴)سودخوری خشک سالی کا سبب ہے

حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس قوم میں سود عام ہوجاتا ہے اس کو ضرور خشک سالی میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔[۴]

(۱۵)سودخورخنزیر بنادیے جائیں گے

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میری امت کے کچھ لوگ غرور،تکبر،لہولعب کی حالت میں رات گذاریں گے،صبح ہوگی تو وہ خنزیر بنادیئے جائیں گے کیوں کہ انھوں نے حرام کو حلال ٹھیرایا تھا،گانے والی عورتیں رکھیں، شراب پی،سود کھایا،اور ریشم کا لباس پہنا تھا۔[۵]

---

[۱] کتاب الکبائر بحوالہ حاکم، [۲] ایضاً، [۳] ایضاً، [۴] رواہ احمد، [۵]

(۱۶) سود ہلاکت کا پیش خیمہ ہے

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس میں سود کو عام کر دیا جاتا ہے۔[۱]

(۱۷) سود خوری قرب قیامت کی علامت ہے

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب کی کثرت ہو جائیگی۔[۲]

سود آثارِ صحابہ و تابعین کی روشنی میں

☆ حضرت عمرؓ نے امت مسلمہ کو نہ صرف یہ کہ سود خوری سے بچنے کی تاکید فرمائی بلکہ شبہ سود بھی بچے کی خاص تاکید فرمائی ہے، نیز آپ نے خود اپنا اور صحابہ کرامؓ کا عمل لوگوں کی عبرت کے واسطے بیان فرمایا ہے کہ ہم حلال کے نو حصے اس اندیشہ سے چھوڑ دیتے تھے کہ حرام میں نہ پڑ جائیں۔

☆ مشہور محدث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حرام کے ایک درہم کا چھوڑ دینا حلال کے ایک لاکھ درھم خیرات کرنے سے زیادہ پسند ہے۔[۳]

اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے حلال وحرام کے معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور اشتباہ کی صورت میں حرام کے پہلو کو غالب رکھا ہے۔

اس پوری تفصیل سے سود کا شریعتِ اسلامی میں حرام ہونا اچھی طرح سمجھ میں آ گیا جو عین عقلِ انسانی اور تقاضائے انصاف کے مطابق ہے۔

سود اور بینک انٹرسٹ

سود کی تعریف آپ جان چکے ہیں کہ یہ وہ زیادتی ہے جو بلا معاوضہ حاصل ہو

---

[۱] دیلمی، [۲] طبرانی، [۳] کتاب الکبائر،

یا بقول امام غزالی صرف پیسوں کے کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے زمانے کا عالمی بنکنگ سسٹم علی العموم پیسوں سے پیسوں کے کاروبار ہی پر مبنی ہے ــــــ یعنی سودی نظام پر ــــــ اسی لئے ہمارے زمانے کے فقہاء نے صرف حفاظتاً اور ضرورتاً بنک میں رقم رکھنے کی اجازت دی ہے، کسی نفع کیلئے بینکوں میں رقم رکھنا بھی گناہ میں تعاون کی وجہ سے گناہ کا سبب ہے۔تو اب بینکوں سے رقم کے مالک کو جو زائد رقم بلا معاوضہ حاصل ہوتی ہے، اس کے سود ہونے میں کیا تردد ہے؟ چنانچہ آج تک اسے سود ہی کہا جا تا رہا ہے، کیوں کہ نام کے تبدیل کر دینے سے حقیقت و ماہیت نہیں تبدیل ہوتی بلکہ وہ بدستور قائم رہتی ہے۔

اس لئے ان تمام آیات، احادیث واقوال کے ہوتے ہوئے اہل تحقیق علماء تو کجا اہل علم ودانش بھی بینک سے حاصل شدہ زیادتی "یعنی سود" کے مطلقاً حلال ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

دارالحرب میں سود

بعض حضرات "دارالحرب" کے حوالہ سے ہندوستان میں بینک انٹرسٹ کے حلال ہونے کی بات کرتے ہیں۔لیکن یہ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ ہندوستان کا دارالحرب ہونا خود اختلافی مسئلہ ہے اور فی الواقع محقق علماء کے نزدیک ہندوستان پر اپنی موجودہ آئینی وعملی صورت حال کے ساتھ ہرگز "دارالحرب" کی تعریف صادق نہیں آسکتی۔ ماضی میں بعض علماء کا یہ خیال ہوا کہ ہندوستان دار الحرب ہونا چاہئے لیکن اسے جمہور علماء ہند نے تسلیم نہیں کیا، اور فقہاء کے نزدیک یہ اصول مسلم ہے کہ کسی ملک کے دارالحرب ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہو تو نہ ہونے کو ترجیح دی جائیگی۔ بہرحال اولاً تو ہندوستان "دارالحرب" کی تعریف میں

شامل نہیں ہوسکتا، ثانیاً اگر مان بھی لیا جائے تب بھی دار الحرب میں صرف کافر حربی سے "سود" لینے کا جواز ہے نہ کہ مسلمان سے اور بنکوں سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس کے بارے میں اس کی کوئی طمانیت نہیں ہے کہ صرف کافر حربی سے موصول ہو رہا ہے، جبکہ ارکان بنک میں اب مسلمان بھی حصہ دار ہیں خصوصاً ہندوستان کے اکثر بنک کے قومیائے جانے کے بعد تو حکومت کے واسطے سے عوام الناس کی ملکیت بن گئے ہیں جن میں قابل لحاظ تعداد خود مسلمانوں کی ہے، پس اس صورت میں "بنک انٹرسٹ" بلا شبہ "سود" ہی ہے۔ جس کی حرمت و شناعت آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

شئیرز مارکٹ

آج کل شئیرز مارکٹ کا بھی خوب زور ہے، اسمیں بعض صورتیں درست ہیں اور بعض خالص حرام، اور جو درست ہیں ان کی معاملت بھی اکثر اسلامی اصول شراکت کے مغائر ہوتی ہے، ان کی بڑی تفصیل ہے، اس لئے اگر کسی کو ایسی کسی کمپنی میں حصہ دار بننا ہے تو اس کی تفصیلات حاصل کر کے کسی مستند عالم دین سے رجوع ہو کر شرعی نوعیت معلوم کر لے پھر قدم اٹھائے، تاکہ غلط فہمی یا نادانی سے کسب حرام کا مرتکب نہ ہو جائے۔

اسکیمیں

اسی طرح اخبارات کے ذریعہ نئی نئی اسکیمیں آج کل سامنے آرہی ہیں۔ جن میں بہت سے پر کشش منافع اور انعامات بتائے جاتے ہیں، بعض لوگ تو ڈھٹائی سے "غیر سودی" کی وضاحت بھی محض اپنی عقل سے کر بیٹھتے ہیں، ان اسکیموں میں حصہ لینے کے خواہشمند حضرات کو بھی چاہیئے کہ اہل علم سے پوری صورتحال بتلا کر ان کی شرعی نوعیت معلوم کریں۔ پھر اگر جائز ہو تو اختیار کریں ورنہ احتراز کریں۔

راقم نے بعض مشہور اور رائج الوقت اسکیمات کے بارے میں ایک بڑے عالم دین سے معلوم کیا تو انھوں نے کئی کئی وجوہ سود کی واضح کیں، اور یہ بھی بتلایا کہ ان کے بدلے بعض ایسی صورتیں کی جاسکتیں ہیں کہ یہی کاروبار شرعی اور غیر سودی بن جائے، اس لئے جو حضرات اس قسم کے کاروبار کرتے ہیں انہیں بھی چاہئے کہ پہلے اہل علم سے رجوع کر کے اسے شرعی بنائیں پھر اس کے اشتہار دیں ورنہ اپنے ساتھ دوسروں کی حرام خوری کا وبال بھی اٹھائیں گے، جو بڑے خسارہ کی بات ہے۔

یادرکھئے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یمحق اللّٰہ الربو اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، محق کرنے کا عذاب مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے، اسلئے اگر کسی شخص کے پاس کسب حرام کے ذریعہ بہت دولت اور عیش وعشرت نظر آرہی ہو تو اس سے دھوکہ مت کھائیے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی اور کڑی آزمائش ہے، اس کا انجام بھی کسی دن بہت برا سامنے آجاتا ہے، اور دنیا ہی میں اس دولت کی بربادی کا سامان ہو جاتا ہے، پھر ہائے ہائے کرتے ہوئے پھریں گے اور کوئی ترس کھانے والا نہ ہوگا، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔

پھر جب انہوں نے ہمارے احکام شرع جو انہیں یاد دلائے گئے تھے کو بھلا دیا تو ہم نے ان کے لئے (آمائش کے طور پر) ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ اپنی ان نعمتوں میں بدمست ہو گئے تو ہم نے اچانک ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

پھر اگر دنیا میں ایسی کوئی آفت نہ بھی آئی تو قیامت میں بہر حال سب ہی کو اللہ کے حضور پیش ہونا اور اپنے کئے کا بدلہ پانا ہے، اسلئے اللہ کے واسطے اپنے آپ کو سود اور اس کے متعلقات سے بچائے۔ خواہ کچھ تکلیف ہی اٹھانی پڑے۔

رشوت کی لعنت

رشوت کی تعریف

"الرشوۃ" جو عربی میں را کے زبر، زیر اور پیش تینوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور جس کی جمع "رشا" آتی ہے، ہر اس شئی کو کہتے ہیں جو کسی حاکم یا صاحب امر کو اس لئے دی جائے کہ اسکی وجہ سے اس کی مقصد برآری ہو، یا فیصلہ اس کے حق میں ہونے کا سبب بنے۔[1] رشوت کی یہ تعریف اور سہل ہے، "رشوت" کہتے ہیں دوسرے سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے اس پر مال صرف کرنا۔[2] اس لئے کہ حق ادا کرنا اس کا فریضۂ منصبی و مذہبی ہے اور ایسے واجبات کے ادا کرنے پر کوئی معاوضہ لینا جائز نہیں لہذا ایسے ہدایا سب رشوۃ میں داخل ہیں، "خواہ وہ دفع ظلم کے لئے لیے گئے ہوں یا ادائے حق کے لئے"۔[3]

رشوت اور ہدیہ میں فرق

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ ہدیہ اور رشوت کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہدیہ بغیر کسی شرط کے (محض از دیادِ محبت و اظہارِ تعلق کے لئے) دیا جاتا ہے، برخلاف رشوۃ کے کہ (اس کے دینے سے کوئی مقصد اور غرض وابستہ ہوتی ہے اسلئے) وہ مشروط ہوتی ہے اعانت و مدد کے ساتھ۔[4]

رشوت کی مذمت و برائی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: "آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے

---

[1] ردالمختار: ۸/۳۴، [2] البحرالرائق: ۶/۲۶۲، [3] حلال وحرام بحوالہ شامی: ۴/۳۰۳، [4] البحرالرائق: ۶/۲۶۲

سے مت کھاؤ اور نہ لیجاؤ انھیں حکام کے پاس اس غرض سے کہ تم اسکے ذریعہ لوگوں کا مال ناجائز ہڑپ کرلو جانتے بوجھتے۔[۱]

یعنی جب تم احکام شرع کو جانتے ہو پھر جانتے بوجھتے تمہارے لئے یہ بات کیسے مناسب ہوسکتی ہے کہ حکام اور آفیسرز کے پاس رشوتوں کو مختلف صورتوں سے پیش کرنے لگو، تاکہ اس طرح وہ دوسرے کا حق مار کے تمہیں دے دے، یہ سب صریح ظلم و ناجائز کام ہے، رہ گیا اپنا حق طلب کرنے یا دوسرے کے ظلم سے بچنے کیلئے ایسا کرنا تو وہ بھی رشوت ہی ہے مگر اس کے حکم کی تفصیل بعد میں بیان کی جائیگی۔ انشاء اللہ

آیتِ شریفہ سے معلوم ہوا کہ مال حاصل کرنے کا ہر ناجائز اور خلاف شرع طریقہ ممنوع و مذموم ہے پس رشوت بھی چونکہ غیر شرعی طریقہ کمائی ہے اسلئے وہ بھی آیت کے عموم میں داخل ہوکر حرام و ناجائز قرار پائی۔ چنانچہ مشہور محدث حافظ شمس الدین الذھبیؒ نے مذکورہ آیت شریفہ کو رشوت کے عنوان کے تحت درج فرما کر اس کی حرمت پر اس سے استدلال فرمایا ہے۔[۲]

امام ترمذیؒ نے بہ سند حسن حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے راشی اور مرتشی پر لعنت فرمائی۔[۳] ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں رائش کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔[۴]

علماء نے صراحت فرمائی ہے کہ راشی رشوت دینے والے کو مرتشی رشوت لینے والے کو اور رائش رشوت کے معاملہ میں دلالی کرنے والے (یعنی درمیانی آدمی) کو کہتے ہیں۔

اس حدیث میں کس قدر شدید وعید ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ایسے شخص پر لعنت فرمائی گئی ہے، اور لعنت کی تعریف میں علماء نے فرمایا ہے کہ لعنت اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی بدترین صورت کو کہتے ہیں یعنی یہ کوئی

---

[۱] سورۃ البقرۃ: ۱۸۸، [۲] کتاب الکبائر: ص: ۱۳۱، [۳] ترمذی، ابوداؤد: ۳/۳۰۰، [۴] دیکھئے کتاب الکبائر حاشیہ

معمولی قسم کا گناہ نہیں ہے۔ چنانچہ بعض علماء نے کبیرہ کی تعریف یہ کی ہے کہ جس عمل پر قرآن وحدیث میں لعنت وغضب کا اظہار فرمایا گیا ہو وہ گناہ گناہِ کبیرہ ہے۔[۱] ظاہر ہے کہ جب رشوت لینے دینے والے پر لعنت فرمائی گئی ہے تو وہ بھی کبیرہ ہے، بلکہ ایک روایت میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت کو" سود کا بڑا دروازہ" قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابوداؤد نے حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی کی کوئی سفارش کہیں کردی (اور اس کا کام بن گیا) اس پر اس کو کوئی ہدیہ دیا گیا (اور اس نے اس کو قبول کرلیا) تو وہ سود کے بڑے دروازے پر پہونچ گیا۔[۲] **اعاذنا اللّٰہ منه** وہی سود جس کا ادنیٰ درجہ ماں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کسی بھائی مسلم کا حق طلب کیا گیا اور تم نے ادا کردیا پھر اس کے بعد اس شخص نے ہدیہ پیش کیا اور تم نے قبول کرلیا تو یہ "سحت" ہے۔ یعنی حرام وخبیث چیز ہے، اسی طرح یہ بھی انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی مسلمان بھائی سے کسی ظلم وزیادتی کو دور کیا پھر اس پر اس شخص سے کوئی عطیہ قبول کرلیا تو یہ" سُحت " ہے۔ کسی نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! ہم تو صرف فیصلوں اور قضیوں کے ضمن میں رشوت دینے کو حرام اور گناہ سمجھتے ہیں، آپ نے فرمایا وہ تو "کفر" ہے۔[۳]

اللہ اکبر! کس قدر مذمت وشناعت بیان کی گئی ہے اس بری خصلت کی۔

چند سبق آموز واقعات

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور اسلام عظام اس بدترین عادت سے بہت دور رہا کرتے اور سختی کے ساتھ اس سے بلکہ اس کے شبہ سے بھی اجتناب کرتے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے ابن زیاد

[۱] تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۶۰، [۲] ابوداؤد، کذافی المشکوٰۃ: ۲/۳۵۲، [۳] طبرانی

کے پاس ایک مظلوم کی سفارش کر کے اسے نجات دلائی اس خوشی میں اس مظلوم نے ان کے پاس کچھ ہدیہ بھیجا، آپ نے واپس فرما دیا، اس لئے کہ اس میں شبہ رشوت تھا، اور اس کی علامت جیسا کہ فقہاء نے صراحت فرمادی ہے کہ جن لوگوں کی طرف سے پہلے ہدایا اور تحائف کا معاملہ نہیں ہے، اور وہ کسی ایسے موقع پر دیں تو اسے رشوت سمجھنا چاہئے۔[۱]

حضرت امام اوزاعیؒ سے ایک دفعہ کسی نے درخواست کی کہ اس کے کسی مسئلہ میں والی بعلبک سے سفارش فرمادیں اور ساتھ ہی اس نے شہد کا ایک مٹکہ بھی تحفہ میں پیش کیا، آپ نے فرمایا تمہیں دو میں سے ایک بات کا اختیار دیتا ہوں جسے چاہو پسند کرلو، اگر شہد قبول کرونگا تو سفارش نہیں کروں گا اور اگر سفارش کروں گا تو شہد قبول نہیں کروں گا، چنانچہ اس نے شہد اٹھالیا، تب آپ نے سفارش لکھ کر دی۔

بے شمار واقعات ہیں شبہ رشوہ سے تک احتراز کرنے کے چہ جائیکہ صراحۃً جو رشوت ہو اس کو قبول کرلیا جائے۔

اس آخری دور میں ہمارے اکابر کے واقعات بھی نمونہ عبرت ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو اگر کوئی صاحب ہدیہ پیش کرتے اور اگر اس کے ساتھ ہی دعا کی درخواست کرتے تو اس کا ہدیہ رد فرما دیتے تھے، خواہ کتنا ہی خطیر اور وقیع ہو، اسلئے کہ دعا حق مسلم ہے اور اسکے حاصل کرنے کے ساتھ تحفہ پیش کرنا چہ معنی دارد؟ اسی طرح میرے شیخ ومرشد محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ نے تو مدرسہ میں اعلان لکھ کر آویزاں فرمادیا کہ ”جن حضرات کے بچے یہاں زیر تعلیم ہیں ان سے کسی قسم کا ہدیہ قبول کرنے سے معذرت ہے، ہدیہ کے بجائے ادعیہ کافی ہیں“ اسلئے کہ یہ لوگ نہ تو پہلے سے کوئی واقفیت وتعلق رکھتے ہیں اور نہ عموماً بعد میں باقی رکھتے ہیں، محض بچہ کی تعلیم کے زمانہ میں مہتمم اور اس کے گھر والوں سے رابطہ قائم

[۱] البحر الرائق وغیرہ کتاب ادب القاضی

رکھتے اور ہدایا وتحائف پیش کرتے ہیں، اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے بچے کے ساتھ اعتناء اور توجہ میں اضافہ کیا جائے یا عفو ودرگذر سے کام لیا جائے، یہ کھلی ہوئی رشوت نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر آہ! کہ مدرسوں میں —— جو کہ مراکزِ دینیہ ہیں —— یہ فساد وحرام اب عام ہے، دھیان بھی اسکی جانب نہیں ہو پاتا۔ **فالی اللہ المشتکی**

رشوت کی قسمیں اور احکام

فقہاء نے رشوت کے احکام کے اعتبار سے چار صورتیں بیان کی ہیں۔

ان میں سے پہلی دو صورتیں ایسی ہیں جن میں رشوت جانبین کے حق میں حرام یعنی دینے والے کے لئے بھی اور لینے والے کے لئے بھی۔

(۱) قضا یا یعنی کسی عہدہ کی تحصیل کے لئے رشوت دینا۔

(۲) قاضی اور حاکم کو اپنے حق میں فیصلہ کرنے کے لئے رشوت دینا۔

دوسری دو صورتیں ایسی ہیں جن میں ”رشوت“ دینے والے کے لئے تو ضرورۃً جائز ہے مگر لینے والے کے حرام و ناجائز ہے۔

(۳) کسی حاکم سے اپنے کام نکلوانے کے لئے کسی کو رشوت دینا، خواہ دفع مضرت ومظلمۃ کے لئے یا حق واجب کی وصولی کے لئے (یعنی ظلم ونقصان سے بچنے کے لئے ہو یا فائدہ حاصل کرنے کے لئے)

(۴) کسی شخص کو خود اسکے ضرر اور ظلم سے بچنے یا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا۔[۱]

ظاہر ہے کہ اس میں دینے والا مجبور اور مظلوم ہے، اپنا حق بغیر اس کے وصول نہیں ہوسکتا یا زیادتی وظلم سے بچ نہیں سکتا تو اس کی مجبوری اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء کرام نے اجازت دی ہے کہ وہ بادلِ نخواستہ اپنی حاجت براری کی

[۱] ردالمحتار: ۸/۳۵،

خاطر رشوت دیدے، بشرطیکہ اسکے بغیر کام نکلنے کی کوئی صورت نہو یا نا قابل تحمل تاخیر کا اندیشہ ہو۔

"رائش" یعنی دلال کا حکم بھی یہی ہے کہ اس نے کسی مظلوم کو ظلم سے بچانے یا اس کا جائز حق دلانے میں مدد کی تھی تو وہ گنہ گار نہ ہوگا ورنہ وہ بھی گناہ وبال یعنی "لعنت" کا مستحق ہوگا۔[۱]

رشوۃ کے ذریعہ کے گئے اعمال صالحہ

اگر کسی نے رشوت لے کر اس رقم سے کچھ اچھے کام کیئے تو یہ کام عنداللہ قبول نہیں ہوتے، جیسے کسی نے مسجد بنوادی، مدرسہ بنوادیا، کسی غریب کی مدد کردی، حج کیا، قربانی کی یا اور کوئی اچھا کام کیا تو وہ ہرگز قبول نہیں ہوتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی ادھر ادھر سے گندگی اور غلاظت جمع کر کے کسی بادشاہ یا بزرگ کی خدمت میں تحفہ پیش کردے، جس طرح وہ بدتمیزی ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: حرام کمائی کا صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی نادان ایسے مال سے خیرات کرے اور پھر ثواب کی امید رکھے تو یہ اس سے زیادہ سخت گناہ کی بات ہے۔ مولانا یوسف لدھیانویؒ نے تو بعض اکابر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "حرام مال کے خیرات پر ثواب کی نیت کرنے سے ایمان سلب ہوجاتا ہے، **اللّٰھم احفظنا**

نیز ایسی رقوم سے کوئی اگر تحفہ دے تو اس کا قبول کرنا بھی جائز نہیں ہے اگر کسی وجہ سے قبول کرنا مناسب ہو تو اس سے لے لے لیکن استعمال نہ کرے۔ کسی مستحقِ صدقہ کو دیدے، اسی طرح سودی اور ناجائز کاروبار کرنے والے ادارے کلینڈر ڈائریز وغیرہ تحفہ دیں تو ان کا قبول کرنا بھی درست نہیں ہے۔[۲]

[۱] البحرالرائق: ۶/۲۶۲، [۲] آپ کے مسائل اوران کا حل: ۶/۱۷۷

رشوت بنام تحفہ

آج کل رشوت عام ہوگئی ہے، بے دین اور فساق وفجار تو بڑی ڈھٹائی و بے حیائی سے رشوت لیتے اور مزے لے لے کر کھاتے ہیں، دیندار کہلائے جانے والے حضرات کچھ ہوں ٹوں کر کے حاصل کرتے ہیں، دینے والوں نے بھی اپنی خودغرضی اور کار برآری کے لئے اس کے طرح طرح کے نام رکھے ہوئے ہیں، یاد رکھئے نام چاہے کتنا ہی خوشنما رکھ لیا جائے، حرام حرام ہی رہے گا، ''زہر'' کو ''شکر'' کہنے سے وہ شکر بننے سے رہا، بلکہ اندیشہ ہے کہ اس میں مزید شناعت وخباثت پیدا ہوجائیگی اس لئے کہ اس میں ایک طرح سے دین کے احکام کا مذاق اور اللہ کے ساتھ مکر وفریب پایا جاتا ہے، اور قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: قیامت کے قریب ایسے لوگ پیدا ہوجائیں گے جو شراب کو شربت کہہ کر اور رشوت کو تحفہ کا نام دیکر اپنے لئے حلال کرنے کی کوشش کریں گے۔ (عیاذاً باللہ)

اسی طرح امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنی ازد کے ایک شخص کو عامل صدقات بنا کر روانہ فرمایا تھا، جب وہ واپس آئے تو انہوں نے مال پیش کیا اور عرض کیا (اس میں سے) اتنا آپ کا اور اس قدر میرا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (یہ شخص) اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھ رہے پھر دیکھے کہ کون اس کو ہدیہ دیتا ہے؟ معلوم ہوا کہ عامل کو جو ہدیہ دیا جاتا ہے وہ ہدیہ نہیں رشوت ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے، ہدیہ تو وہ تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا جاتا تھا، آج کل ہدیہ کہاں؟ بس رشوت ہوتی ہے یعنی اغراض کے بغیر کوئی ہدیہ اس زمانے میں عام طور سے نہیں ہوتا۔ (یہ حال حضرت عمر بن

عبدالعزیزؒ پہلی صدی کا بیان کر رہے ہیں، آج کا تو کہنا کیا؟)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو عاملِ صدقات بنا کر روانہ کیا انہوں نے کسی مال کے بارے میں فرمایا کہ یہ مجھے تحفۃً ملے ہیں، تو حضرت عمرؓ خفاء ہوئے اور ارشاد فرمایا: اے اللہ کے دشمن! تو ذرا اپنے گھر میں بیٹھ کر تو دیکھ کون تجھے ہدیہ لا کر دیتا ہے، یہ کہہ کر وہ مال ان سے لے لیا اور بیت المال میں محفوظ کرا دیا (تاکہ مستحقین تک پہونچا دیا جائے)

یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ صاحب منصب کے پاس جو ہدایا آتے ہیں وہ عموماً ہدیہ نہیں "رشوت" ہوتے ہیں۔[1]

بہر حال اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ عام طور سے لوگ اپنے مفوضہ فرائض کو انجام دینے کے سلسلہ میں متعلقہ لوگوں سے جو انعام تحفہ وغیرہ وصول کرتے ہیں وہ رشوت ہے اور سخت ناجائز وحرام کمائی ہے۔ اس میں ججس، کلکٹرس، آفیسرس، حکومت کے کارندے خواہ وہ کس شعبہ سے متعلق ہوں داخل ہیں۔ اور حرام خوری کی نحوست وانجام ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ قرآن وحدیث میں حرام کمائی اور اس کے استعمال پر سخت ترین وعیدیں آئی ہیں حد یہ ہے کہ ان کی عبادت اور دعاؤں کے تک نامقبول ومردود ہونے کی وعید شدید سنائی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت میں ایسے لوگوں کے اعمال صالحہ اگر "جبل تہامہ" کے برابر بھی ہوں تو وہ گرد و غبار بنا کر بے وزن وبے حیثیت کر دیے جائیں گے، اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جو لوگ معمولی معمولی امور میں رشوت دہی کے ذریعہ کام نکالنے کو پسندیدہ مشغلہ سمجھے ہوئے ہیں اور فخر سے لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں، انہیں اس سے باز آنا چاہئے، سخت ضرورت پر دینا پڑے تو بدرجہ مجبوری دیدیں اور جو لوگ رشوت خور ہیں اور انہیں اس کی لت پڑی ہوئی ہے وہ لوگ بھی

[1] آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۱۸۵

اپنی اس گندی حرکت سے ان تفصیلات کے معلوم ہو جانے کے بعد تو کم از کم باز آجائیں اور آئندہ کے لئے سچی پکی توبہ کرلیں، اور امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ ضرور قبول فرمائیگا۔

تلافی وتوبہ کی صورت

علماء نے قبولیتِ توبہ کی تین شرطیں لکھیں ہیں۔ اگر وہ حق اللہ سے متعلق ہے اور اگر حق العبد سے متعلق ہے تو ان تین کے علاوہ چوتھی شرط بھی ہے۔

(۱) گناہ کے ارتکاب پر ندامت وشرمندگی

(۲) اس گناہ کو علی الفور ترک کردینا

(۳) آئندہ نہ کرنے کا ارادہ کرلینا

(۴) صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کرنا یا اس سے معافی کرالینا

جس رشوت چونکہ حقوق العباد سے متعلق ہے اس لئے واجب ہے کہ جس جس سے رشوت لی ہے اسے واپس کرے، اور اس کا طریق علماء کرام سے معلوم کرلے، اللہ کے بعض بندوں کو توبہ کی توفیق ہوئی تو انہوں نے بڑے اہتمام سے یہ رقمیں ان کے مالکوں کو واپس کیں۔ پختہ ارادہ اور سچی نیت ہو تو اللہ تعالیٰ خود راستے پیدا فرمادیتے ہیں۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجاً۔[۱]

---

[۱] ردالمحتار: ۸/۴۸

مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم

موضوع کا تعارف:-

آج کل مساجد میں ”جماعتِ ثانیہ“ کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اور عام مسلمان احکام شرعی سے ناواقف ہونے کے باوجود محض دوسروں کی دیکھا دیکھی زیادہ ثواب کی بات سمجھ کر اُسے اختیار کرتے جارہے ہیں، عرب میں تو عام عادت ہی بن گئی ہے، ہمارے علاقوں میں بھی ادھر کچھ عرصہ سے مسجدوں میں یہ سلسلہ چل پڑا ہے، اوراس کو ہوا دینے والا وہ ”سعودی ریٹرن“ طبقہ ہے جس کے ہاں کسی بات کے صحیح ہونے کیلئے بس اس قدر کافی ہے کہ اس کا ذکر ”بخاری شریف“ میں موجود ہو یا ”سعودی عرب“ میں اس پر عمل ہوتا ہو،اس سے آگے ”علم وتحقیق“ کے میدان سے اور علماء وفقہاء کی تحقیقات سے اُنہیں کوئی واسطہ ہی نہیں ہے ، بلکہ ان کے نزدیک ”سعودی عرب“ کے رواج اور ”بخاری شریف“ کے حوالہ کے بعد اس مسئلہ میں زبان کھولنا جرمِ عظیم اور شرکِ جلی سے کم درجہ کی بات نہیں ہے۔ **فیاحسرۃ علی علمھم وعقلھم!**

چونکہ ”جماعتِ ثانیہ“ کا یہ سلسلہ اپنی جگہ بہت سی خرابیوں اور مفسدات کا سبب ہے ،اورعوام الناس اس سے بالکل ناواقف ہیں،اُنھیں اسی وجہ سے منع کرنے والوں سے مخلصانہ شکایت بھی ہوتی ہیکہ اچھے کام سے کیوں منع کیا جارہا ہے؟ اسلئے ذیل میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے کلام کیا جارہا ہے تاکہ حق کے متلاشی اور علمِ صحیح کے قدردانوں کیلئے وسیلۂ علم ذریعۂ عمل ثابت ہو، **والتوفیق بیداللہ**

جماعتِ مسجد کی اہمیت وفضیلت:-

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: والذی نفسی بیدہ لقد هممت ان آمر بحطب لیحطب ،ثم امر بالصلوٰۃ فیؤذن لھا، ثم امر رجلا فیؤم الناس ثم اخالف الی رجالٍ فاحرق علیھم بیوتھم[1]

اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، میرا جی یوں چاہتا ہے کہ ایندھن اکھٹا کرواؤں، پھر نماز کے لئے حکم دوں پس اذان کہہ دی جائے پھر کسی سے کہوں کہ وہ جماعت کی امامت کرے، پھر میں ان مردوں کیجانب جاؤں (جو مسجد کی جماعت میں نہیں پہونچے) اور ان کے اوپران کے گھروں کو آگ لگادوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بستی میں اذان ہوجانے کے بعد بھی بلا عذرشرعی کے مسجد کی جماعت میں حاضراور شریک نہ ہونا اتنا سنگین گناہ ہے کہ نبی رحمت ﷺ ان کو "زندہ درنار" کردینے کی وعید سنارہے ہیں، اور وہ بھی "قسم" کی تاکید کے ساتھ! چنانچہ بعض دیگر روایات سے صحابہؓ کا یہ تأثر معلوم ہوتا ہے کہ اگر بےقصور عورتوں اور بچوں کی رعایت مدنظر نہ ہوتی تو آپ ﷺ اپنے اس ارادہ پر عمل بھی فرمادیتے۔اس کے باوجود بھی بعض لوگوں کو مسجدوں میں دیر سے پہونچ کر بالقصد "جماعتِ ثانیہ" کرنا "جماعتِ اولیٰ" میں شرکت کے اہتمام سے بھی زیادہ نہ معلوم کیوں پسند ہے؟ اور کیسے اس کو حصولِ فضیلت اور ثواب کا ذریعہ سمجھتے ہیں؟ کیونکہ "اذان" متفرق اور متعدد جماعتیں بنا کر نماز پڑھنے کیلئے نہیں دی جاتی ، ایک جگہ اکھٹے ہو کر شوکتِ

[1] باب وجوب الصلوٰۃ، الموسوعۃ ص:۵۲

اتحاد کے مظاہرہ کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ جیسا کہ تمام علماء نے "مقاصدِ جماعت" میں اس کی وضاحت کی ہے۔

حدیث مذکور میں "ثم اخالف الی رجال" سے اور اس کی دیگر روایات میں مذکور عورتوں اور بچوں کی رعایت میں ایسا نہ کرنے کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز با جماعت مردوں کے لئے مشروع ہوئی ہے، عورتوں کے لئے نہیں، ورنہ وہ عدمِ شرکت میں معذور نہ سمجھی جاتیں۔

☆عن عبد اللّٰہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال من سرہ ان یلقی اللّٰہ تعالیٰ غدا مسلما، فلیحافظ علی ھؤلاء الصلوٰت الخمس حیث ینادی بھن، فان اللّٰہ شرع لنبیکم سنن الھدی، وانھن من سنن الھدیٰ ولو انکم صلیتم فی بیوتکم کما یصلی ھذا المتخلف فی بیتہ لترکتم سنۃ نبیکم ولو ترکتم سنۃ نبیکم لضللتم . . . . .لقدرأیتنا مایتخلف عنھا الا منافق معلوم النفاق، ولقد کان الرجل یوتی بہ یھادی بین الرجلین حتی یقام فی الصف [1]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ کل وہ اللہ تعالیٰ سے حالتِ اسلام میں ملے تو اس کو چاہیے کہ ان پانچوں نمازوں کی جماعت کا اہتمام کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کو ہدایت والے طریقے دیئے ہیں، یہ نماز با جماعت بھی انہی ہدایت والے طریقوں میں سے ایک ہے......اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جیسا کہ یہ فلاں اپنے گھر میں نماز پڑھ لیتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت کو چھوڑنے والے ہوگے اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔

[1] رواہ مسلم: ۲۳۲/۱

میں تو صحابہؓ کے ماحول میں دیکھتا تھا کہ اذان کے بعد نماز باجماعت میں مشہور منافقوں کے علاوہ کوئی غیر حاضر نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ ایک شخص اگر دو آدمیوں کے ذریعہ گھسٹتے پیروں کیساتھ لایا جاسکتا تو اُسے بھی لاکر صف میں کھڑا کردیا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے اس تاکیدی خطاب سے معلوم ہوا کہ اذان کے بعد مسجد میں جو جماعت قائم کی جاتی ہے یا جس جماعت کے لئے اذان کہی جاتی ہے اس کی پابندی ضروری ہے، اور صحابہ کرامؓ اس کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ مشہور منافقوں کے علاوہ کسی شخص کو جماعتِ مسجد ترک کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، حتیٰ کہ کوئی شخص اگر دو آدمیوں کے سہارے پیروں سے گھسٹتے ہوئے بھی مسجد کی جماعت میں پہونچ سکتا تھا تو وہ بھی جماعت میں حاضری سے دریغ نہ کرتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس خبر میں "جماعت" سے مراد "جماعتِ اولیٰ" ہی ہے۔

عن ابی هریرةؓ اتی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم رجل اعمیٰ، فقال یارسول اللّٰه! انه لیس لی قائد یقودنی الی المسجد، فسأل رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم ان یُرخّص له فیصلی فی بیته،

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک نابینا صحابیؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے پاس کوئی ایسا رہبر نہیں ہے جو مجھے مسجد پہونچا دیا کرے، یعنی انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گھر میں

فرخص لہ، فلما ولّی دعاہ فقال ھل تسمع النداء بالصلوٰۃ ؟ فقال نعم! فقال فاجب [۱]

نماز پڑھنے کی گنجائش مانگی، آپؐ نے انہیں اسکی اجازت دیدی، پھر جب وہ جانے لگے تو واپس بلا کر پوچھا کہ کیا تمہیں اذان کی آواز سنائی دیتی ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو پھر آپؐ نے فرمایا ایسا ہے تو مسجد ہی میں آکر نماز پڑھا کرو۔

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ اذان کے بعد مسجد پہونچنا اور جماعتِ مسجد میں شریک ہونا اس قدر ضروری امر ہے کہ ایک نابینا کو اسکے پاس کوئی رہبر نہ ہونے کے باوجود بھی نبی کریم ﷺ نے انہیں "ترکِ جماعت" کی اجازت نہیں دی۔

اس جگہ صرف ان تین حدیثوں پر اکتفاء کیا گیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث ہیں جو جماعتِ مسجد کی فضیلت واہمیت کو اور اس کے بلا عذر ترک پر سخت وعیدوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ **اللھم وفقنا اھتمامہ واتباعہ** . یہ روایات جہاں جماعتِ مسجد کی فضیلت واہمیت کو ثابت کرتی ہیں، وہیں مسجد میں متعدد جماعتوں کی کراہت کو بھی واضح کرتی ہیں، اسکی تفصیل ہم آگے ذکر کریں گے۔

جماعتِ مسجد کا فقہی حکم:-

اسی وجہ سے تمام فقہاء کرام نے اذان کے بعد مسجد پہونچنے اور جماعت کو پانے کی تیاری کو واجباتِ دین میں شامل کیا ہے۔

چنانچہ امام احمدؒ کے نزدیک اذان سننے کے بعد جماعت میں شامل ہونا "فرضِ عین" ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک "فرضِ کفایہ اور سنت علی العین" ہے،

[۱] رواہ مسلم : ۱/ ۲۳۲

امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول ”وجوب“ کا ہے، (یا کم از کم ”سنتِ موکدہ“ کا) جبکہ کوئی عذر شرعی نہ ہو، عذر کی تفصیل علاحدہ ہے۔

نظامِ جماعت کے مقاصد وفوائد:-

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ دینِ اسلام کے احکام اور انکی حکمتوں کے بڑے عالم و عارف گذرے ہیں، ان کی کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ“ اس خصوصیت کے ساتھ علماءِ دین میں معروف ومشہور ہے، ذیل میں ہم اسکی شرح ”رحمۃ اللہ الواسعہ“ کی مدد سے نماز باجماعت کی مشروعیت کی حکمتیں نقل کرتے ہیں شاہ صاحبؒ کے بیان کا ترجمہ شارحِ کتاب حضرت مفتی سعید احمد صاحب مدظلہ‘ کے الفاظ میں اسطرح ہے:

چند مصالح کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ الٰہی جماعت سے نماز ادا کرنے کا نظم بنایا، اور متنوع ثواب بیان کر کے اسکی ترغیب دی، اس میں کوتاہی کرنیوالوں کو سخت تنبیہ فرمائی، وہ فوائد ومصالح یہ ہیں۔

الف: ”رسم“ یعنی دنیا کی آفات سے حفاظت میں اس سے زیادہ کوئی چیز نافع نہیں کہ عبادات میں سے کسی عبادت کو رواجِ عام دیا جائے، جو ہر کہ ومہ کے سامنے ادا کی جائے، اور اس کو سب شہری اور دیہاتی ادا کریں، کوئی مسلمان اس سے مستثنیٰ نہ ہو، اور لوگ اس عبادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں، اور اس عبادت کو اتنا عام کیا جائے کہ وہ ”ضروری معاشی امور“ کا درجہ حاصل کر لے، جس طرح کھانا پینا اور سونا جاگنا زندگی کے ایسے لوازم ہیں کہ ان کے بغیر چارہ نہیں، نہکوئی شخص ان سے بے اعتنائی برت سکتا ہے۔ اسی طرح اس عبادت کو بھی لوگوں کی ”عادتِ ثانیہ“ بنا دینا چاہیے تاکہ وہ عبادت دوسری عبادتوں کا لوگوں میں شوق پیدا کرے، اور دنیا کے ہر معاملہ میں اور زندگی کے ہر موڑ پر دین کی

طرف لوگوں کو دعوت دیتی رہے تا کہ وہی دنیا جس کے ضرر کا ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا تھا وہ لوگوں کو دین کی طرف بلانے والی بن جائے۔ ایسی عبادت جو ان مقاصد کو اس طرح پورا کرے نماز ہی ہوسکتی تھی، کیونکہ وہ عظیم الشان اور قوی البرہان عبادت ہے، اس لئے شریعت نے اس کو با جماعت ادا کرنے کا حکم دیا، تا کہ اس کی اشاعت عام ہو، اس کے لئے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور سب مل کر اس کو ادا کریں تا کہ اس کی برکت سے غفلت کا پردہ چاک ہو۔

ب: ملت تین طرح کے لوگوں پر مشتمل ہے ۱۔ علماء جو مقتدا ہیں ۲۔ نیکو کاری کے خواہشمند لوگ جن کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ شوق دلانا کافی ہو جاتا ہے ۳۔ نیت اور جذبے کے کمزور لوگ، جنہیں اگر سب کے ساتھ ملکر اور سب کے سامنے عبادت پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ سستی و کاہلی میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ پس ان سب لوگوں کے حق میں اس سے زیادہ مفید اور ان مصالح سے ہم آہنگ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوسکتی تھی کہ سب کو ایک ساتھ مل کر ایک دوسرے کے سامنے عبادت کرنے کا حکم دیا جائے، تا کہ نمازی اور بے نمازی کا پتہ چل جائے، اور عبادت کا شوق رکھنے والے اور بدشوق جدا ہو جائیں، اور جماعت میں جو علماء ہیں عوام ان کی پیروی کرسکیں، اور جو بے علم ہیں علماء ان کی تعلیم و اصلاح کرسکیں، تا کہ اللہ کی عبادت لوگوں میں سونے کی مثال بن جائے کہ جب اس کا کھرا کھوٹا جاننا ہوتا ہے تو وہ مختلف سناروں کو دکھایا جاتا ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ کونسا سونا کھرا ہے اور کونسا کھوٹا ہے؟ اسی طرح جب سب ملکر ایک دوسرے کے سامنے عبادت کریں گے تو جو عبادت میں غلطی کرے گا اس کی اصلاح کی جائے گی اور جو صحیح طریقہ پر عبادت کرے گا اس کو بنظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔

ج: اسی طرح مسلمانوں کا ایک ساتھ جمع ہونا، اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف راغب ہوں، اس کی رحمت کے امیدوار ہوں، اس کے عذاب سے خائف ہوں، اس کے سامنے سر اطاعت جھکانے والے ہوں، تو یہ منظر اور یہ حال اللہ تعالیٰ کی برکتوں اور رحمتوں کے نزول میں عجیب تاثیر و خاصیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جماعت کی نماز کی مشروعیت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

د: امتِ مسلمہ کو روئے زمین پر اس لئے جلوہ گر کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ اسلام کا بول بالا ہو، یعنی زمین میں کوئی دین، دینِ اسلام سے اعلیٰ نہ رہے، اسلام ہی تمام ادیان پر غالب آجائے، جیسا کہ "سورۃ الصّف" میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا، تاکہ وہ دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دے، گو مشرکین کیسے ہی ناخوش ہوں" اور غلبۂ اسلام کی جہاں بہت سی صورتیں ہیں، ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اعمالِ اسلام کا عام مظاہرہ ہو، اور یہ بات اسی وقت متصور ہو سکتی ہے جبکہ مسلمانوں کے عوام و خواص، شہری و دیہاتی، چھوٹے اور بڑے ایک ساتھ جمع ہو کر اور مل جُل کر وہ عبادت بجالائیں جو اللہ کے دین کا سب سے بڑا اشعار اور اس کی بندگی کا مشہور ترین طریقہ ہے، یعنی "نماز"۔

ہ: با جماعت نماز کا ایک عجیب فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر مقتدی نماز میں کچھ بھی نہ پڑھے، صرف نیت کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر آخر تک تمام ارکان میں امام کے ساتھ شریک رہے، تو بھی اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اقوال میں سے نماز میں صرف قراءت فرض ہے، اور جماعت کی نماز میں وہ امام کے ذمہ ہے۔ باقی تکبیرات، تسبیحات، اور ادعیہ وغیرہ یا تو مستحب ہیں یا سنت یا واجب، جن کے ترک سے بھی نماز ہو جاتی ہے۔ (یہ آخری فائدہ شارح نے بڑھایا ہے)

بس انہی فوائد و مقاصد کی خاطر شریعتِ اسلامی نے جمعہ اور جماعت کو مشروع کیا، اسکی ترغیب دی اور اس کی خلاف ورزی کو سختی سے منع کیا ہے۔[1]

[1] رحمۃ اللہ الواسعہ ۳/ ۵۷۱ تا ۵۷۳

ان حکمتوں اور مقاصد کا عام فہم خُلاصہ:۔

حاصل یہ نکلا کہ شریعت اسلامی میں پنجوقتہ نمازوں کیلئے جماعت کی مشروعیت، اس کی پابندی پر بے شمار فضائل وانعامات اور اس کی خلاف ورزی پر سخت ترین وعیدیں اسلئے رکھی گئی ہیں کہ اس کے ذریعہ (۱) اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے (۲) دینِ اسلام کے ماننے والوں میں توحید وعبودیت کے اظہار واعلان کی جرأت پیدا ہوتی ہے (۳) اجتماعِ عام کے ذریعہ شوکتِ اسلام اور عددی قوت کا اظہار ہوتا ہے (۴) پانچ وقت اہلِ محلّہ کے اکھٹا ہونے اور مل جل کر عبادت کرنے سے ان کے درمیان محبت ومودت، اخوت وبھائی چارہ کی فضا قائم ہوتی ہے (۵) تمام امور میں امیر کی اطاعتِ کاملہ کا مزاج بنتا ہے اور اسکا مظاہرہ ہوتا ہے (۶) عوام وخواص کے اجتماع سے عوام کو علماء سے استفادہ کرنے اور علماء کو عوام کے اعمال واخلاق کی اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے (۷) ایک دوسرے کے جسمانی، ایمانی اور معاشی احوال سے واقفیت اور ان کے مداوا کی توفیق ہوتی ہے (۸) اہلِ ایمان کا یہ اجتماع اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے نزول کا سبب بنتا ہے (۹) غیر مسلمین پر مسلمانوں کی جمعیتِ متحدہ اور عباداتِ الٰہیہ کی دھاگ بیٹھتی ہے (۱۰) ان کے قلوب کے اسلام کی طرف مائل وراغب ہونے کا سبب بنتا ہے (۱۱) افضل العبادات کا یہ عملی واجتماعی مظاہرہ بندوں پر "عبادتِ رب" کے حق کو پہچاننے کا وسیلہ وذریعہ بن جاتا ہے (۱۲) نمازی وبے نمازی، عمل کا شوق رکھنے والے اور بدشوق ایک دوسرے سے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ **وغیرھا ما لا یعد ولایحصیٰ**

ان مقاصد کا حصول ایک ہی جماعت ہونے سے ہوتا ہے:۔

جب یہ بات ہے تو جماعت کے یہ "فوائد ومقاصد" اسی وقت حاصل ہوں

گے جب مسجد میں ہر نماز کے لئے ایک ہی اذان اور ایک ہی جماعت ہو، جب اذان ہوجائے تو سب لوگ اس اجتماع کی تیاری شروع کردیں، اور بلا لحاظِ مسلک ومشرب، امیر وغریب، رئیس وفقیر، عالم وجاہل، خویش واجنبی، اور صغیر وکبیر کے سب مسلمان مسجد میں اکھٹے ہوجائیں۔ اور امامِ واحد کی اتباع واقتداء میں نماز ادا کرکے اپنے اپنے مشاغل کی طرف لوٹ جائیں۔ یہ نہیں کہ ہر نماز کے وقت پورے وقت میں متعدد اذانیں ہوتی رہیں اور جماعتیں بنتی رہیں، یا اذان تو ایک ہی ہو مگر لوگ وقفہ وقفہ سے آتے رہیں اور علاحدہ علاحدہ جماعتیں بنا کے نماز ادا کرتے رہیں، کیونکہ ایسا کرنا "نظامِ جماعت" کے مذکورہ بالا مقاصد کو فوت کردیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد کے زمانوں میں بھی ـــــ سوائے اِکّا دکّا جزوی واقعہ کے ـــــ مساجد میں ایک نماز کیلئے دو یا دو سے زائد جماعتوں کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ بقول بعض محققین کے "جماعتِ ثانیہ" کا یہ رواج چھٹی صدی ہجری تک کہیں نہیں تھا۔

جماعتِ ثانیہ ان مقاصد کو ختم کردیتی ہے:-

"جماعتِ ثانیہ" جماعت کے ان منافع ومقاصد کو ختم کردیتی ہے، جس کے لئے جماعت مشروع ہوئی ہے۔ چنانچہ (۱) جماعتِ ثانیہ کی اجازت جماعتِ اولیٰ سے غفلت کا سبب ہے۔ (۲) اس کی وجہ سے جماعتِ اُولیٰ میں مصلیوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے جو منشائے شرع کے خلاف ہے۔ (۳) تفریق بین المؤمنین کا سبب ہے جب کہ جماعت اجتماع واتحاد کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ (۴) دوسری جماعت کی اجازت تیسری، چوتھی اور اس سے بھی زیادہ جماعتوں کا سبب ہو کر نظمِ جماعت کا مذاق بن جاتی ہے جیسا کہ عرب علاقوں میں اور جہاں بھی لوگ اس کے قائل ہیں ان مسجدوں میں روز روز کا مشاہدہ ہے۔ (۵) امامت جو ایک باوقار وذمہ دار

منصب ہے اور اسکے لئے متدین ومتشرع ، احکام سے واقف اور صحیح التلاوت آدمی کا انتخاب ہونا چاہیے، اس کے بجائے کوئی بھی احکام سے واقف وناواقف، صالح وفاسق امام بن جاتا ہے، بسا اوقات انشرٹ کیا ہوا، برہنہ سر، قرآن کریم صحیح نہ پڑھ سکنے والا شخص بھی امام ہوجاتا ہے، جس سے دیکھنے والوں کی نگہ میں ''منصبِ امامت'' بے حیثیت ہوکررہ جاتا ہے۔(٦) لوگ مسلکوں کی بنیاد پر قصداً جماعتِ مقررہ سے رُک کر علاحدہ جماعت کرنے پر جری ہوجاتے ہیں۔ جو باہمی نزاع واختلاف کو ہَوا دینے کا سبب ہوجاتا ہے۔ جبکہ مسجد ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پہونچ کر سب اختلافات ختم ہوجاتے ہیں۔

جماعتِ ثانیہ کے یہ اوران جیسے بہت سے نقصانات ہیں جو ادنیٰ تأمل سے سمجھ میں آسکتے ہیں، غالبًا انہی وجوہ سے نبی کریم ﷺ، صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، ائمہ مجتہدینؒ، اور علماء دین نے نہ صرف یہ کہ ''جماعتِ ثانیہ'' کی ترغیب نہیں دی بلکہ قولاً وعملاً اسے مکروہ وناپسندیدہ ہی قرار دیا جس کی تفصیل اگلی سطروں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

جماعتِ ثانیہ اوراشارات قرآنیہ :-

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَاراً وَّكُفْراً وَّتَفْرِيْقاً بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ	اور جن لوگوں نے ایک مسجد ضرار، کفر، تفریق بین المؤمنین اور اللہ ورسول کے دشمنوں کو پناہ دینے کیلئے بنائی ہے، اور قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اس سے ہمارا مقصد اچھا ہے، جبکہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اے نبی! آپ

لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَداً [۱] اس میں ہرگز نماز نہ پڑھیں۔

ابن العربی ؒ فرماتے ہیں : یعنی مسلمان ایک جماعت تھے ، ایک مسجد کے مصلی تھے، منافقین نے اس مسجد کے ذریعہ چاہا کہ ان کی اجتماعیت کو توڑ دیں، تا کہ وہ ان سے علاحدہ ہو جائیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت کے نظام کا حقیقی مقصد مسلمانوں کے قلوب کو جوڑنا، عبادت کے نظام کو مستحکم کرنا اوران کے درمیان مودت و محبت پیدا کرنا ہے۔ امام شاطبیؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو نقل کر کے اس تفسیر کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ [۲]

"مسجد ضرار" کے قیام کو اللہ تعالیٰ نے جن وجوہ سے ناپسند فرمایا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ڈھادینے کا حکم دیا تھا، ان میں سے ایک وجہ "و تفریقاً بین المؤمنین" بھی فرمائی ہے، جماعتِ ثانیہ کی اجازت بھی جماعتِ اولیٰ سے تہاون وغفلت اور جماعت کی کثرت ٹوٹنے کا سبب ہے، چنانچہ جن علاقوں میں اس کا عام رواج ہو گیا ہے، وہاں جماعتِ اولیٰ کا کوئی خاص اہتمام نظر نہیں آتا، لوگ آتے رہتے ہیں اور جماعتیں بناتے رہتے ہیں، جبکہ اذان و جماعت کا اسلامی نظام بستی کے مسلمانوں کو جوڑنے اور اکھٹے کرنے کیلئے قائم کیا گیا ہے۔

امام قرطبیؒ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ارشاد: "تفریقاً بین المؤمنین'' سے معلوم ہو گیا کہ منافقین کی مسجدِ ضرار بنانے سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو جائے اور مسجدِ نبوی کی جماعت گھٹ جائے (جس پر اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضگی ظاہر فرمائی) یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں جماعت کی نماز کے نظام کا سب سے بڑا مقصد اور اسکی واضح غرض و غایت مسلمانوں کو ظاہراً و باطناً اطاعتِ الٰہی پر جوڑنا، اور دین کے ایک اہم عمل کے ذریعہ ان میں اجتماعیت اور باہمی محبت پیدا کرنا، اور قلوب کو

[۱] سورۃ التوبۃ: ۱۰۷ ، [۲] القول المبین فی اخطاء المصلین ص: ۲۷۰

"کینہ وکدورت" کی گندگی سے پاک کرنا ہے، چنانچہ امامِ مالکؒ نے اس آیتِ شریفہ میں اس "دقیق ولطیف نکتہ" کو بھانپتے ہوئے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ ایک مسجد میں ایک ہی نماز کی دو جماعتیں نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ جماعت کا مقصد مسلمانوں کو جوڑنا ہے اوراس جوڑ میں رخنہ ڈالنا منافقوں کا کام ہے، جب کہ "جماعتِ ثانیہ" اتحادِ ملی کے اس عظیم مقصد کو ضائع کرتی اوراس نظام کی برکت کوختم کردیتی ہے، اس کی وجہ سے غافلوں کو بہانہ مل جاتا ہے کہ جماعت چھوٹ جائے گی تو دوسری جماعت کرلیں گے،(اس لئے وہ بھی **تفریقاً بین المؤمنین** میں داخل ہوکر ممنوع ومکروہ قرار پائیگی)[1]

☆اسی طرح سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۰۲ میں اللہ تعالیٰ نے جنگ کی خوفناک صورتحال کے دوران اگر نماز کا وقت ہوجائے اور فریقین میں اسطرح ٹھنی ہوئی ہو کہ دشمن کی طرف سے تھوڑی دیر کیلئے بھی توجہ ہٹانی مشکل ہوتو نماز کا ایک خاص طریقہ نازل فرمایا ہے،جس کوفقہاء "صلوٰۃ الخوف" کہتے ہیں،اس میں بھی مجاہدین کو ایک ہی جماعت پر جمع فرمایا ہے،اللہ تعالیٰ اگر چاہتے تو ایسے وقت انہیں علاحدہ علاحدہ جماعت بنا کر پڑھنے کی بھی اجازت دے سکتے تھے،لیکن ایسانہیں فرمایا گیا۔ اس سے بھی "جماعتِ ثانیہ" کی کراہت کا صریح اشارہ ملتا ہے۔

جماعتِ ثانیہ اور اسوۂ نبویؐ:-

☆ حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقبل من نواحی المدینۃ یرید الصلوٰۃ، فوجد الناس قد صلّوا، فمال الی اھلہ فجمع	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی نواحی محلّہ سے مسجدِ نبوی کو واپس آئے ،نماز کا ارادہ فرمایا تو دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہیں،

[1] الجامع لاحکام القرآن: ۱۴۵/۸

اھلہ فصلّی بھم .اخرجہ الطبرانی برجال ثقات [1]

یعنی مسجد میں نماز ہو چکی ہے تو آپ اپنے گھر تشریف لے گئے اور گھر والوں کو لے کر جماعت بنائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسجد میں ''جماعتِ ثانیہ'' کو پسند نہیں فرماتے تھے، کیونکہ اگر پسند فرماتے تو گھر جا کر جماعت کرنے کے بجائے مسجد میں ہی جماعت فرما لیتے اور مسجد کی فضیلت کو ترک نہ فرماتے۔

☆اسی طرح ''بخاری و مسلم'' کی وہ روایت جو پیچھے حضرتِ ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے گذر چکی ہے کہ آپؐ نے اذان کے بعد مسجد نہ آنے والوں کے گھروں کو جلا دینے کا حتمی ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ غور کرنا چاہیے کہ اگر آپؐ کے نزدیک ''جماعتِ ثانیہ'' کی گنجائش ہوتی تو آپؐ یہ بات کیسے ارشاد فرما سکتے تھے؟ اس لئے کہ پہلی جماعت میں نہ پہونچنے والوں کے پاس یہ عذر ہو سکتا تھا کہ ہمارا ارادہ دوسری جماعت بنا لینے کا تھا، ایسی صورت میں آپؐ کی یہ تنبیہ و تہدید بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جماعتِ ثانیہ اور صحابہؓ و تابعینؒ:-

☆''امام طبرانیؒ'' نے سند حسن کے ساتھ ابراھیم نخعیؒ سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ: ایک دفعہ وہ نماز کے لئے مسجد پہونچے تو لوگ نماز سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے، ان کے ساتھ حضرت علقمہؒ اور حضرت اسودؒ بھی تھے حضرتِ ابن مسعودؓ گھر لوٹ آئے اور ان دونوں کے ساتھ گھر پر جماعت بنا کے نماز ادا فرمائی، غور کرنے کی بات ہے کہ جب وہ مسجد پہونچ ہی گئے تھے تو وہاں پر بھی ان لوگوں کیساتھ جماعت کر سکتے تھے، ایسی صورت میں کچھ اور لوگ بھی جماعت میں شریک ہو جاتے، لیکن چونکہ یہ حضرات مسجد میں جماعتِ

[1] مجمع الزوائد: ۲/ ۴۵

ثانیہ کو پسند نہیں فرماتے تھے، اسلئے گھر واپس آ کر جماعت بنالی، اس جگہ یہ بھی یاد رہیکہ حضرت ابن مسعودؓ فقہاءِ صحابہؓ میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔

☆ عبدالرحمٰن بن مجبرؒ کہتے ہیں کہ میں سالمؒ بن عبداللہؓ کے ساتھ نماز کے لئے جامع مسجد میں داخل ہوا، اس وقت لوگ نماز سے فارغ ہو چکے تھے، تو بعض لوگوں نے ان سے کہا، کیوں نہ آپ دوسری جماعت کر لیں؟ آپ نے فرمایا: ایک نماز کی ایک ہی مسجد میں دومرتبہ جماعت نہیں کی جاتی۔ یاد رہے کہ سالمؒ بن عبداللہؓ مشہور تابعی اور عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادے ہیں نیز امامِ مالکؒ نے "مدوّنۃ الکبریٰ" میں ابن وہبؒ سے قابلِ اعتماد سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جماعتِ ثانیہ کے بارے میں یہی رائے ابن شہاب زہریؒ، یحییٰ بن سعیدؒ، ربیعہؒ، اورلیث بن سعدؒ کی بھی ہے۔

بہر حال سالمؒ بن عبداللہؓ کے اس ارشاد میں کہ "ایک نماز کی جماعت ایک ہی مسجد میں دومرتبہ نہیں کی جاسکتی" جماعتِ ثانیہ کی کراہت پر صریح دلیل موجود ہے بالخصوص جب کہ متعدد تابعین اس کی تائید وتصویب بھی کر رہے ہوں۔[1]

☆ مصنف ابن ابی شیبہؒ اور مصنف ابن عبدالرزاقؒ میں حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد مروی ہے کہ: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ مسجد میں کبھی ایسے وقت پہونچتے کہ جماعت ہو چکی ہوتی تو اپنی نماز تنہا پڑھ لیا کرتے تھے، (جماعتِ ثانیہ نہیں کرتے تھے) یہی بات امام شافعیؒ نے "کتاب الام" میں فرمائی ہے کہ "ہم کو یہ بات احادیث اور سلفِ صالحین کے ذریعہ اچھی طرح محفوظ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اگر کچھ لوگوں کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت چھوٹ جاتی تو وہ لوگ یعنی صحابہ کرامؓ جماعت پر قدرت کے باوجود دوسری جماعت نہیں کرتے تھے، تنہا پڑھ لیا کرتے تھے، کیونکہ صحابہ کرامؓ مسجد میں (ایک نماز کی) دو جماعتوں کو مکروہ سمجھتے تھے۔" جنکی جماعت چھوٹ گئی انہیں مسجد میں "جماعتِ ثانیہ" نہ کرنے اور تنہا

[1] اعلاء السنن ۴/۲۷۹

پڑھ لینے کی ہدایت دینے کے بعد امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔اگر کچھ لوگوں نے مسجد میں جماعتِ ثانیہ کرلی تو اگر چہ نماز صحیح ہوجائیگی مگر وہ لوگ مکروہ کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ ہمارے متقدمین اور سلفِ صالحین جماعتِ ثانیہ نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض سلف تو ایسا کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔[۱]

اہلِ علم جانتے ہیں کہ مجتہدین کے کلام میں ''سلف'' سے مراد صحابہؓ وتابعینؒ ہی ہوا کرتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ صحابہؓ وتابعینؒ اور ائمہ مجتہدین سب کے نزدیک ''جماعتِ ثانیہ'' مکروہ وناپسندیدہ ہی تھی، اور یہ حضرات کسی عمل کو اس وقت تک مکروہ ومعیوب نہیں سمجھتے تھے جب تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے قول وفعل سے ثابت نہ ہوجاتا۔ چنانچہ ذخیرۂ احادیث میں صحابہ کرامؓ اور تابعینِ عظام کے زمانوں میں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد میں جماعتِ ثانیہ کا ذکر ——اکا دکّا واقعہ کے علاوہ—— نہیں ملتا، جبکہ جماعت دن میں پانچ مرتبہ قائم ہوتی ہے، اور ہزارہا مسلمانوں میں سے چند ایک کی جماعت کا چھوٹ جانا فطرۃً یقینی بات ہے۔

جماعتِ ثانیہ اور ائمہ مجتہدین:-

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء امت نے نہ صرف یہ کہ ''جماعتِ ثانیہ'' کی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ صراحتاً اسے مکروہ اور ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے، ہاں! اگر وہ مسجد، محلّہ کی مسجد نہ ہو، اس میں با قاعدہ اور بروقت جماعت کا انتظام نہ ہو، بلکہ مسافروں اور راہ گیروں کیلئے بنادی گئی ہو، جہاں ہر وقت لوگ آتے جاتے نماز پڑھ لیا کرتے ہوں تو ایسی مسجد میں تکرارِ جماعت کی ممانعت وکراہت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ تمام علماء نے ایسی مسجدوں کو ''جماعتِ ثانیہ'' کی کراہت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

---

[۱] الام: ۱/۱۵۴

☆ عبدالرحمٰن الجزیری اس سلسلہ میں "ائمہ اربعہ" کا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یکرہ تکرار الجماعة فی المسجد الواحد ان تصلی فیه جماعة بعد اخریٰ	ایک مسجد میں یکے بعد دیگرے جماعت کرنا فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے

اس کے بعد اس کی تفصیل اس طرح نقل کی ہے:

احناف کے نزدیک: مساجدِ طریق یعنی راستوں پر بنائی گئی مسجدوں میں جس میں امام اور مقتدی متعین نہیں ہوتے جماعت کی تکرار بلا کراہت جائز ہے، اور مساجدِ محلّہ میں جہاں امام اور اکثر مقتدی اہلِ محلّہ ہوتے ہیں ان میں اسی جگہ پر جہاں پر جماعتِ اولیٰ قائم ہوچکی ہو، "جماعتِ ثانیہ" کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ البتہ اس جگہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مقام و مکان میں جماعت کی جاسکتی ہے۔

مالکیہ کے نزدیک: کسی بھی مسجد میں بلکہ اس "جماعتِ ثانیہ" میں بھی جو پنجوقتہ نمازوں کے لئے مختص ہوگیا ہو "مقررہ امام" کی جماعت ہوجانے کے بعد دوسری جماعت کرنا مکروہ ہے، اگر چہ کہ امام نے اس کی اجازت بھی دی ہو، اسی طرح مقررہ وقت میں "مقررہ امام" سے قبل بھی علاحدہ جماعت کرنا درست نہیں ہے۔ اور جماعتِ اولیٰ کے دوران "جماعتِ ثانیہ" کرنا تو حرام ہے۔ البتہ وہ مساجد یا مواقعِ صلوٰۃ جہاں امام مقرر نہ ہو اور لوگ علاحدہ علاحدہ جمع ہوکر جماعت کر لیتے ہوں تو ایسے مقامات پر ایک ہی نماز کی متعدد جماعتوں میں کوئی حرج و کراہت نہیں ہے۔

شوافع کے نزدیک: ایسی مساجد میں جہاں امام مقرر ہو، بغیر امام کی اجازت کے جماعتِ ثانیہ مطلقاً مکروہ ہے، خواہ جماعت سے قبل ہو خواہ بعد میں ہو یا ساتھ میں ہو، ہاں اگر وہ مسجد محلّہ کی نہ ہو بلکہ راہ گیروں کے لئے بنائی گئی ہو، یا اس میں کوئی

امام با قاعدہ مقرر نہ ہو، تو ایسی صورت میں جماعتِ ثانیہ کی گنجائش ہے۔

حنابلہ کے نزدیک: مقررہ امام کی جماعت ہو جانے کے بعد دوسری جماعت، مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی کو چھوڑ کر دوسری مسجدوں میں بلا کراہت جائز ہے۔ کیونکہ ان دونوں مسجدوں میں بغیر عذرِ شرعی کے ان کے نزدیک جماعتِ ثانیہ مکروہ ہے۔[1]

☆ عصر حاضر کے عظیم محقق وفقیہ مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں: حنابلہ اور اہلِ ظاہر "جماعتِ ثانیہ" کے جواز کے قائل ہیں...... لیکن ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ) اور جمہور (یعنی علماء کی اکثریت) کا مسلک یہی ہے کہ جس مسجد میں امام و موذن مقرر ہوں اور اس میں ایک مرتبہ محلّہ والے نماز پڑھ چکے ہوں وہاں تکرارِ جماعت مکروہِ تحریمی ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت ہے کہ ایسی صورت میں محراب سے ہٹ کر بغیر اذان و اقامت اور بغیر تداعی (لوگوں کو جمع کیے بغیر کسی جگہ) نماز ادا کی جائے تو جائز ہے، مگر احناف کا مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اس طرح بھی "جماعتِ ثانیہ" کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی مسجد میں غیر اہلِ محلّہ نے آ کر اپنی جماعت کر لی ہو تو اہلِ محلّہ کو دوبارہ جماعت کرنے کا حق ہے، یا اگر بعض محلّہ والوں نے چپکے سے اذان کہہ کر جماعت کر لی ہو اسطرح کہ اس کی اطلاع اہلِ محلّہ کو نہ ہو سکی ہو تو ان کے لئے تکرارِ جماعت جائز ہے، یا اگر مسجدِ طریق ہو جس کے امام و موذن مقرر نہ ہوں تو اس میں بھی تکرارِ جماعت جائز ہے، ان صورتوں کے سوا کسی صورت میں بھی جمہور (یعنی علماءِ امت کی اکثریت) کے نزدیک تکرارِ جماعت جائز نہیں ہے۔[2]

☆ فضیلۃ الشیخ مشہور حسن سلمان ـــــ مصلیوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ـــــ لکھتے ہیں: جماعتِ اولیٰ سے پیچھے رہ جانے والوں کی غلطیوں میں سے ایک غلطی امامِ مقرر کی جماعت ہو جانے کے بعد جماعتِ ثانیہ کرنا ہے،

---
[1] الفقہ علی مذاہب الاربعہ: ۱/۲۴۴ [2] درس ترمذی: ۱/۴۸۴

جبکہ علماء وفقہاء کی ایک بڑی جماعت نے اس کو منع کیا ہے، اور ایسی صورت میں انفراداً نماز پڑھ لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ سفیان ثوریؒ، عبداللہ ابن المبارکؒ، امامِ مالک بن انسؒ، امام محمد بن ادریس شافعیؒ، لیث ابنِ سعدؒ، امام اوزاعیؒ، امامِ زہریؒ، عثمان بتی، ربیعہؒ، امام ابوحنیفہؒ، اوران کے دونوں اصحاب یعنی امام ابو یوسفؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ، یحییٰ بن سعیدؒ، سالم بن عبداللہؒ، ابوقلابہؒ، عبدالرزاق صنعانیؒ، ایوب سختیانیؒ، حسن بصریؒ، علقمہؒ، اسودؒ، ابراھیم نخعیؒ، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ اکابرِ علماءِ دین وائمہ مجتہدین نے احادیث وآثار کی روشنی میں مسجد میں ''جماعتِ ثانیہ'' کی مخالفت فرمائی ہے۔[1]

جماعتِ ثانیہ اور عقلِ سلیم:۔

یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ شریعت میں جماعت کی تعداد کا کثیر ہونا مطلوب ومقصود ہے، ادھر یہ بات بھی عقلی ویقینی ہے کہ جب لوگوں کو جماعتِ ثانیہ کی گنجائش مل جاتی ہے تو وہ ''جماعتِ اولیٰ'' میں شرکت کی کماحقہٗ فکر وکوشش کرنا چھوڑ دیتے ہیں، جیسا کہ ان علاقوں کا حال شاہد ہے جہاں ''جماعتِ ثانیہ'' کا رواج عام ہے۔ کیونکہ وہاں لوگ جماعتِ اولیٰ ہو جانے کے بعد بھی آتے رہتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جماعت بنا کر نماز پڑھتے رہتے ہیں، یہ تہاون وغفلت دوسری جماعت مل جانے کی امید ہی پر تو ہوتی ہے، نیز متعدد جماعتیں ہونے میں جھگڑوں اور اختلافات کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جماعتِ ثانیہ کی اجازت جماعتِ اولیٰ کی تقلیل وکمی کا سبب ہے اور جماعت میں تقلیل وتفریق کا سبب بھی بلاشبہ مکروہ ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے اذان کے بعد جماعت میں نہ شریک ہونے والوں کو جو سخت تنبیہ فرمائی ہے، اس سے بھی عقلاً جماعتِ اولیٰ ہی مراد ہے، اسلئے کہ

[1] القول المبین فی اخطاء المصلین ص:۲۶۹

اگر جماعتِ ثانیہ کی گنجائش ہوتی تو جماعتِ اولیٰ میں نہ پہونچنے والوں کو اتنی سخت تنبیہ نہ فرمائی جاتی۔ کیونکہ ان سے جماعتِ ثانیہ وثالثہ میں شرکت کا امکان باقی تھا، جو ان کے حق میں عذر ہوسکتا تھا۔ چنانچہ یہ طئے ہے کہ وہ تہدید وتنبیہ "جماعت اولیٰ" کے تارکین کے لئے ہی تھی، جب ایسا ہے تو جماعتِ اولیٰ میں شرکت حکمِ رسول سے لازم وواجب ہوگئی اور جب پہلی جماعت میں شرکت کا واجب ہونا ثابت ہوگیا تو خود بخود اس سے جماعتِ ثانیہ کی کراہت بھی ثابت ہوگئی ہے۔[۱]

نیز حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت جو پیچھے گذر چکی ہے میں جو انہوں نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں مشہور منافقوں کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو جماعت میں شریک نہ ہوتا تھا اور اگر دو آدمیوں کے سہارے گھسٹتے پیروں سے بھی پہونچ سکتا تھا تو بھی ضرور وہ مسجد آتا تھا، یہ قول بھی جماعتِ اولیٰ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

امام احمدؒ کا مستدل اور اس کا رد:-

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اس مسئلہ میں امام احمدؒ کا مسلک جمہور کے برخلاف جواز کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "جماعتِ ثانیہ" سوائے حرمین شریفین کے دوسری مساجد میں علی الاطلاق درست ہے، اور ظاہریہ (غیر مقلدین) بھی جواز کے قائل ہیں، ان کی دلیل ایک تو حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد مسجد پہونچے، حضور ﷺ نے حاضرین سے فرمایا، کوئی ہے جو ان کے ساتھ شریک ہوکر ثواب حاصل کرلے؟ تو ایک صاحب (حضرت ابوبکرؓ) اٹھے اور ان کے ساتھ مل کر نماز پڑھ لی![۲]

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ سے "جماعتِ ثانیہ" کی ترغیب کا پتہ نہیں چلتا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترغیب فرض ادا کئے ہوئے لوگوں کو دی، نفل کی

[۱] اعلاء السنن: ۴/۲۷۸　[۲] مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۵۳

نیت سے فرض پڑھنے والے کے ساتھ شریک ہونا موضوع بحث نہیں ہے، بلکہ موضوع فرائض کے لئے دوسری جماعت بنانے کا مسئلہ ہے، پس یہ حدیث "اقتداء المتنفل خلف المفترض" یعنی فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل کی نیت سے شریک ہونے کے مسئلہ سے متعلق ہے نہ کہ "جماعتِ ثانیہ" کے مسئلہ سے، اسلئے اس سے استدلال کامل نہیں، دوسرے یہ کہ یہ صرف دو آدمیوں کی جماعت تھی اور ایک احیانی صورت تھی، اسلئے کہ اس سے اگر صحابہ کرامؓ جماعتِ ثانیہ کی ترغیب کا سبق لیتے تو ان کا اس پر تعامل ہوتا جبکہ پورے ذخیرۂ احادیث میں اس واقعہ کے علاوہ مسجد نبوی میں جماعتِ ثانیہ کا ذکر نہیں ملتا۔ تیسرے یہ کہ جب مسائل میں اباحت وکراہت کا اختلاف ہوتا ہے تو ترجیح کراہت کو حاصل ہوتی ہے۔[1]

دوسری دلیل ان حضرات کی حضرت انسؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مسجد ثعلبہ یا مسجد رفاعہ میں چند لوگوں کے ساتھ تشریف لائے، جس میں جماعتِ اولیٰ ہو چکی تھی تو انہوں نے پھر سے اذان واقامت کہلوائی اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔[2]

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے جس مسجد میں "جماعتِ ثانیہ" کی ہے اس کا محلّہ کی مسجد ہونا واضح نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مسجدِ طریق ہو، جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ انہوں نے اذان واقامت بھی کہلوائی، جبکہ "جماعت ثانیہ" کو درست سمجھنے والوں کے نزدیک بھی جماعتِ ثانیہ کے لئے اذان واقامت کا اعادہ صحیح نہیں ہے، پھر اس واقعہ کی بعض روایات میں مسجدِ رفاعہ کے نام سے جس مسجد کا ذکر ہے، اس نام سے مدینہ منورہ میں کوئی مسجد معروف نہیں تھی، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ محلے سے ہٹ کر یا کسی راستہ پر یہ مسجد رہی ہو، اور وہاں امام اور جماعت مقرر نہ ہو، اور ایسی صورت میں "جماعت ثانیہ" سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے۔[3]

---

[1] درس ترمذی [2] مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۵۱ [3] درس ترمذی: ۱/۴۸۵

یہ توجیہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ خود حضرت انسؓ نے ہی صحابہ کرامؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ "جب ان کی جماعت فوت ہو جاتی تو وہ مسجد میں تنہا پڑھ لیا کرتے تھے۔[۱]

جماعتِ اولیٰ ترک ہو جائے تو تلافی کیسے کی جائے؟:-

اب ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی بے چارے کی کوشش کے باوجود جماعت چھوٹ جائے تو وہ جماعت کے اجر کی تلافی کس طرح کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: ۱۔ اذان کے بعد جماعتِ اولیٰ کو حاصل کرنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کرے، کیونکہ خود اس فکر واہتمام کا ثواب مستقلاً ملتا ہے، ۲۔ مسجد پہونچنے پر جماعت کے ساتھ قعدۂ اخیرہ بھی ملجائے تو جماعت کا ثواب پانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے، ۳۔ اور اگر مسجد پہونچ کر معلوم ہو کہ جماعت ہو چکی ہے تو بھی غم نہ کرے، تنہا نماز ادا کر لے، اس کو فکر واہتمام کی بدولت جماعت کے ساتھ ادا کرنیوالوں کے برابر ہی اجر وثواب ملے گا۔

جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فان اتی المسجد فصلی فی جماعة غفرله ، فان اتی المسجد وقد صلوا بعضا وبقی بعضا، صلی ماادرک واتم ما بقی، کان کذالک فان اتی المسجد وقد صلوا فاتم الصلوٰة کان کذالک [۲]

(جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد پہونچا) اور اس کو جماعت مل گئی تو اسکی مغفرت ہوگئی اور اگر کچھ جماعت ملی باقی تنہا پوری کر لی تو بھی مغفرت ہوگئی، اور اگر ایسے وقت پہونچا کہ جماعت ختم ہوگئی اور اس نے اپنی نماز الگ پڑھ لی تو بھی مغفرت ہوگئی۔

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ: ۵/۵۲ [۲] ابوداؤد: ۱/۱۵۴

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من توضأ فاحسن وضوئه ثم راح ، فوجد الناس قد صلوا ، اعطاه اللّٰہ مثل اجر من صلاها وحضرها، لاينقص ذالک من اجورهم شيئا [۱]	جس نے اچھی طرح وضو کیا، اور مسجد پہونچا تو دیکھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہو چکے ہیں، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو جماعت میں شریک لوگوں کے اجر کے برابر اجر عطا فرمائے گا ان لوگوں کے اجر میں کمی کئے بغیر

دونوں حدیثوں سے ایک بات تو یہ واضح ہوگئی کہ جماعتِ اولیٰ کو پانا یا اس کو پانے کی سعی کرنے کے باوجود نہ پا سکنا، دونوں اجر میں برابر ہے، اسلئے ثواب جماعت سے محرومی کے خیال سے جماعت ثانیہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جماعتِ ثانیہ کو پسند فرماتے تو جماعت کے بعد پہونچنے والوں کو اسی کی ترغیب دیتے، مگر چونکہ ایسا کرنا نظام جماعت کے شرعی مقصد کے خلاف تھا اس لئے آپؐ نے اس کی ترغیب نہیں دی، بلکہ علاحدہ پڑھ لینے کے باجود جماعت سے پڑھنے والوں کے بقدر ثواب کا وعدہ فرمایا، بشرطیکہ اس نے جماعت پانے کی سعی کی ہو۔ اس ارشادگرامی کے موجود ہوتے ہوئے مسجد پہونچنے پر جماعت نہ ملنے والوں کو نہ کسی غم کی ضرورت ہے اور نہ ہی جماعتِ ثانیہ کے ذریعہ اس کی تلافی کی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔ **والحمد للّٰہ علی ذالک**

خلاصۂ بحث اور اہل علم سے ایک گذارش:-

خلاصہ یہ کہ مساجد میں جماعتِ ثانیہ کا بڑھتا ہوا رجحان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل، صحابہ کرامؓ، تابعینِ عظامؒ، تین ائمہ مجتہدینؒ اور جمہور محدثین وسلفِ صالحین

[۱] نسائی: ۱/۱۱

کے اقوال وآراء کی روشنی میں ایک مکروہ اور ناپسندیدہ عمل ہے، اور یہ کہ اس میں زیادہ ثواب سمجھنا احکام سے ناواقفیت کی بناء پر ہے، اور یہ کہ جن چند علماء نے جمہور علماء کے برخلاف اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہے ان کے دلائل زیادہ مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے مرجوح ہیں۔ **واللّٰہ اعلم وعلمه اتم واحکم۔**

اس لئے اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں مسئلہ کی صورتحال کوخوب اچھی طرح واضح کر کے اس بدعت کے خلاف جدو جہد کریں، اور دیکھا دیکھی رواج پاتے ہوئے اس مکروہ عمل پر روک لگائیں۔ جماعتِ اولیٰ کے اہتمام کی طرف خصوصی توجہ دلائیں، اس کے ترک پر وارد وعیدوں سے روشناس کرائیں، یہ بھی بتلائیں کہ جماعتِ ثانیہ سے اسکی تلافی ممکن نہیں ہے، اور جس شخص نے جماعتِ اولیٰ کو پانے کی کوشش کی پھر بھی نہ مل سکی تو اس کو ملول ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کو تنہا پڑھنے پر بھی جماعت کی نماز ہی کا اجر ملے گا۔ اور اگر غفلت کی وجہ سے جماعت چھوٹ گئی تو نوافل کی کثرت کے ذریعہ تلافی کرنے کی کوشش کرلے جیسا کہ سلف صالحین کے احوال میں منقول ہے کہ ایسے موقع پر تنہا نماز پڑھ لیتے تھے، پھر نوافل کے ذریعہ تلافی مافات اور اپنی غفلت کے علاج کی فکر کرتے تھے۔ اگر اہل علم حضرات اس قسم کے مسائل کو غیر اہم سمجھ کر اور نام نہاد وسعتِ ذہنی سے کام لیکر نظر انداز کرتے رہیں گے تو دھیرے دھیرے بات فرائض و واجبات تک پہونچ جائیگی، کیونکہ آج کل عام مسلمان محض بھولے پن سے اور آلۂ کار لوگ سوچی سمجھی سازش کے تحت آہستہ آہستہ اسلاف کے دین کا حلیہ بگاڑ کر امریکہ کا مطلوب دین تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا چھوٹی چھوٹی باتوں پر سختی وپختگی سے عمل کرنے اور مسلمانوں کو پابند بنانے والے ہمارے اسلاف کرام تنگ نظر تھے؟ یا انہیں دلائل کے ضعف

وقوت کا اندازہ نہیں تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ باڑھ کی حفاظت ہی سے کھیت کی حفاظت ہوسکتی ہے، اوراگر باڑھ کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا جائے تو پھر کھیت کی حفاظت کا خواب بھی خبط ہے۔اللہ پاک ہمیں اپنے بڑوں کے تصلب دینی کو سمجھنے اوراس سے سبق سیکھنے کی توفیق عطافرمائے۔(آمین)

ان ارید به الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ

ایک جدید مکتبِ فکراورامام ابن تیمیہؒ کی نظر میں اس کا مقام:-

اسلام میں پنجوقتہ نمازوں کے لئے نظامِ جماعت کا اہتمام کس قدر ہے، کیوں ہے، اس کے ذریعہ اسلام کیا چاہتا ہے، اوران مقاصد کیلئے ہر مسجد میں ایک ہی جماعت قائم ہونی چاہیے،اسکے برخلاف بار بار جماعتیں کر کے جمعیت واتحاد کو کمزور کرنا کتنا ناپسندیدہ عمل ہے، یہ سب تفصیل آپ جان چکے ہیں، جولوگ عربوں کی دیکھا دیکھی یالاعلمی سےثواب کی حرص میں ”جماعتِ ثانیہ“ کوایک نیک کام سمجھ کرکررہے تھےان کیلئے اس عمل کوترک کرنے یہ مضمون بہت کافی وشافی ہے **ان شاء اللّٰہ** اورجیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا کہ یہ مضمون ایسے ہی طبقہ کی علمی رہنمائی وعملی اصلاح کے جذبہ سے لکھا گیا ہے،اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اورتوفیق عمل عطافرمائے۔

لیکن اس طبقہ کے برخلاف اس زمانہ میں ایک اورطبقہ”سلفیت “ کے نام پر ضدی اورہٹ دھرم قسم کا ابھرا ہے، جومسلمانوں کےاجتہادی اختلافات کوبھی دین وایمان کا اختلاف سمجھتا ہے،اورجس کے نزدیک” بخاری شریف“ کی حیثیت ایک ”متوازی نبی“ کی حیثیت ہے کہ کسی بات کا بخاری شریف میں پایا جانایاسعودی عرب میں اس پرعمل ہونا ایسا قطعی الثبوت مسئلہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی حدیث اور فقہی تحقیق نہ قابلِ سماعت ہے نہ لائق التفات ! یہ طبقہ اختلافی امور میں اپنے

مسلک کے پختہ مقلد ہونے اور اسکے برخلاف کچھ نہ سننا چاہنے کے باوجود اپنے کو "کتاب وسنت کا متبع"، باقی سب مسلمانوں کو" بتانِ ائمہ کا پجاری" سمجھتا ہے، اس نئے اور بدعتی طبقہ نے ایک نیا سلسلہ یہ شروع کر دیا کہ اس مزاج وخیال کے لوگ مسجدوں میں بالقصد تاخیر سے پہونچتے اور علاحدہ جماعت بنا کر نماز پڑھتے ہیں، یا پھر انفراداًا اپنی نماز پڑھتے ہیں، تاکہ حنفی المسلک امام کی اتباع سے محفوظ رہیں، یہ لوگ شیعوں کی طرح تقیہ کے مرتکب اور منافقوں کی طرح تفریق بین المؤمنین کے مجرم ہیں۔

یہ لوگ دراصل، سلفیوں کے علاوہ کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے، خاص طور سے احناف کو شرک سے کم درجہ کا قصوروار نہیں مانتے، خود میں نے متعدد مرتبہ دیکھا کہ اس طبقہ کے بعض نوجوان بات کرنے کیلئے آئے، درمیان میں جماعت کا وقت ہوگیا تو یہ لوگ علاحدہ کھڑے رہے اور جب جماعت ہوچکی تو اپنی جماعت بنا کر نماز پڑھی، پوچھنے پر بتلایا کہ چونکہ آپ لوگوں کی نماز صحیح نہیں ہے، اس لئے ہم علاحدہ پڑھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل سلف سے ثابت نہیں ہے، بلکہ بقول امام شافعیؒ سلف تو مسجد کی جماعتِ ثانیہ کو معیوب سمجھتے تھے نہ کہ مرغوب! اصل میں بس راز وہی ہے کہ ان کے نزدیک ابھی جماعت ہوئی ہی نہیں، اس لئے کہ جن لوگوں نے جماعتِ اولیٰ کی تھی، انہیں یہ وثنی اور صنمی یعنی بت پرست سمجھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ احناف کو بھی مسلمان سمجھتے اور" اہل السنۃ والجماعۃ" میں سے ہوتے تو بلا کراہت ان کی اقتداء کر لیتے، جیسا کہ بہت سے کر بھی لیتے ہیں——اور ان معتدل غیر مقلدین سے ہم مخاطب بھی نہیں ہے، جاہل حنفیوں اور غالی سلفیوں سے سے گفتگو کی جارہی ہے کیونکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں یہ بھی شامل ہے کہ مسلمان خواہ صالح ہو یا فاجر اس کی اقتداء میں نماز درست ہے،" ونری الصلوٰۃ خلف کل بر وفاجر"

(العقیدۃ الطحاوی) اس لئے مسلمانوں کو اس طبقہ سے خبردار و ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ یہ طبقہ" افتراق بین المسلمین" کی سنگین اور غیر اسلامی حرکت کا مرتکب اور دشمنانِ اسلام کا آلہ کار ہے۔ چونکہ یہ طبقہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ؒ کا نام لیتا رہتا ہے اور ان کی تحقیقات ہی کو برحق سمجھتا ہے، خواہ وہ جمہورِ امت کے مقابلہ میں ان کے تفردات ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے ہم ذیل میں ان کی عبرت و نصیحت کیلئے شیخ کی ایک عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں: انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ ایک مسلک کے مسلمانوں کی نمازیں دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے پیچھے ہو جاتی ہیں یا نہیں؟ جواباً فرمایا:

ہاں! ایک مسلک والے کی نماز دوسرے مسلک والے کے پیچھے صحیح ہو جاتی ہے، جیسا کہ صحابہ کرامؓ تابعین اور ان کے بعد ان کے سچے متبعین اسی طرح ائمہ اربعہ رحمھم اللہ کا معمول تھا کہ وہ مسائلِ اجتہادیہ میں اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے، سلف میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہتا تھا کہ مسلک کے اختلاف کے ساتھ اقتداء صحیح نہیں ہے، جو شخص ایک مسلک والے کی دوسرے مسلک والے کے پیچھے نماز صحیح ہو جانے کا منکر ہے وہ بدعتی، گمراہ اور کتاب وسنت اور اجماعِ سلف اور ائمہ امت کا مخالف ہے۔[1]

حدیثِ صحیح میں وارد ہے کہ وہ تمہیں نماز پڑھائیں گے اگر وہ صحیح پڑھائیں تو ان کے حق میں بھی مقبول تمہارے حق میں بھی مقبول اور غلط پڑھائیں تو تمہاری نماز مقبول ہے اور وبال ان کے سر ہے۔[2]

ترکِ جماعت کے اعذار:-

درمیان مضمون میں بلا عذر شرعی جماعتِ مسجد ترک نہ کرنے کا ذکر آیا تھا اسلئے آخر میں ان شرعی اعذار کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے تا کہ قارئین کے علم میں

[1] مجموع الفتاوی: ۲۳/۳۷۳ [2] ایضاً

رہے،اور عمل کا سبب بنے۔

(۱) لباس بقدر ستر عورت کے نہ پایا جانا۔(۲) مسجد کے راستے میں سخت کیچڑ ہونا۔(۳) بارش کا بہت تیز ہونا۔(۴) سردی کا اس قدر سخت ہونا کہ مسجد جانے میں سخت تکلیف ہو۔(۵) مسجد جانے میں مال واسباب کے چوری ہوجانے کا خوف ہونا۔(۶) مسجد جانے میں کسی دشمن کے ملجانے کا خوف ہونا۔(۷) مسجد میں کسی قرض خواہ کے ملجانے کا اوراس سے تکلیف پہونچ جانے کا اندیشہ ہونا۔ بشرطیکہ ادائیگی قرض کی وسعت نہ ہو۔(۸) اس قدر اندھیری رات ہوکہ راستہ نہ دکھائی دیتا ہو،لیکن اگر روشنی کا سامان مہیا ہوتو پھر یہ عذر نہیں ہے۔(۹) رات کا وقت اور سخت آندھی کا چلنا۔(۱۰) کسی ایسے مریض کی تیمارداری میں ہونا کہ جماعت میں جانے سے مریض کو تکلیف پیش آنے کا خطرہ ہو۔(۱۱) کھانا تیار ہواور بھوک ایسی لگی ہوکہ نماز میں دل نہ لگنے کا خوف ہو۔(۱۲) پیشاب یا پاخانہ زور سے لگا ہو۔(۱۳) سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور گاڑی چھوٹ جانے کا یا جماعتِ مسجد کے انتظار میں تاخیر کا اندیشہ ہو۔(۱۴) کوئی ایسا عذر ہونا کہ اس کی وجہ سے چل پھر نہ سکتا ہو۔[۱]

۱؎ مراقی علی الطحطاوی،مرتبہ:حضرت محی السنہؒ

اہل قرآن یا منکرین حدیث

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

قال اللّٰه تبارک وتعالیٰ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ[1]

قال النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کل امتی یدخلون الجنة الا من ابی قیل ومن ابی یارسول اللّٰه! قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقدابی.[2]

محترم علماء کرام اور قابل قدر طلبۂ علم دین!

اسلام کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین اسلام کتاب وسنت کے مجموعہ کا نام ہے،اسی وجہ سے اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت ایمان والوں کے اوپر لازم کردی گئی ہے، ہمارے علماء وفقہاء نے اصول کی کتابوں میں اس کی صراحت کردی ہے،اور ہمارے اس عقیدہ پر ــــ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت امت پر واجب ہے ــــ قرآن وحدیث کی بے شمار آیات وروایات شاہد ہیں،اسی وجہ سے قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے مخاطبین ــــ حضرات صحابہ کرامؓ ــــ سے لے کر آج تک امت باجماع واتفاق اسے اپنا عقیدہ مانتی اور اسکے انکار کرنے والے کو قرآن وحدیث کا منکر اور خارج از اسلام یقین کرتی آئی ہے۔

---

[1] سورۃ النساء:۶۴ [2] صحیح بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ:۳/۱۳۹

حضرت محمدؐ کون ہیں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور سب سے آخری رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر اپنی سب سے آخری کتاب قرآن مجید اتاری ہے، قرآن کریم آپ کے رسول الٰہی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بغیر رسول پر ایمان معتبر نہیں اور اللہ کی اطاعت بغیر رسول کی اطاعت ممکن نہیں، بلکہ رسول کو اسی لئے بھیجا جاتا ہے کہ اسکی اطاعت کی جائے، صرف اس لئے نہیں کہ پیغام رسانی کر کے اللہ اور بندوں کے درمیان سے ہٹ جائے، یا حینِ حیات بندوں پر امامت وحکومت کر کے وفات کے بعد اپنی اطاعت کے حق سے محروم ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اور رسول خاص اسلامی اصطلاحات اور منصب ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ان کو بھیجتا ہے اور وہی ان کی ذمہ داریاں متعین کرتا ہے۔

نبی کی چند اہم ذمہ داریاں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں تک پہونچانا۔

يَـا اَيُّهَـا الـرَّسُـوْلُ بَـلِّـغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ [۱]

اے رسولؐ! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسے (لوگوں تک) پہونچادیجئے

مَـا عَـلَـى الـرَّسُـوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنِ [۲]

رسول کے ذمہ تو بس بلاغ مبین ہے

(۲) اس پیغام کی تشریح وتبیین کرنا۔

اَنْـزَلْـنَـا اِلَيْکَ الـذِّكْـرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاس مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ [۳]

ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ جو کچھ نازل ہوا ہے،

۱؎ سورۃ المائدہ: ۶۷　۲؎ سورۃ النور: ۵۴　۳؎ سورۃ النحل: ۴۴

لوگوں کو کھول کھول کر بتلا دیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اس پیغام پر عمل کرنا۔

ثُمَّ جَعَلۡنَاکَ عَلیٰ شَرِیۡعَةٍ مِنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا[۱] — پھر ہم نے آپ کو ایک خاص طریقہ پر کر دیا پس آپ اسی طریقہ کا اتباع کیجئے

اِتَّبِعۡ مَا اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ[۲] — جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے اس کی اتباع کیجئے۔

(۴) اللہ کے کلام کو پڑھ کر سنانا، قرآن کریم اور حکمت (وحی غیر متلو) کی تعلیم دینا اور عقیدہ و عمل کی تطہیر و درستگی کرنا۔

کَمَا اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلاً مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیَاتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ وَیُعَلِّمُکُمُ الۡکِتَابَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُعَلِّمُکُمۡ مَا لَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ[۳] — جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہیں (گناہوں سے) پاک کرتے ہیں۔ اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (اور اسکے علاوہ) جو تم نہیں جانتے تھے وہ بھی سکھاتے ہیں۔

(۵) امت کو اللہ تعالیٰ کی اور اپنی اتباع و اطاعت کی دعوت دینا۔

اِتَّبِعُوۡا مَا اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ[۴] — اے لوگو! جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اسکی اتباع کرو۔

---

۱ سورۃ الجاثیۃ:۱۸ ۲ سورۃ الانعام:۱۰۶ ۳ سورۃ البقرۃ:۱۵۱ ۴ سورۃ الاعراف:۳

قُـلْ اِنْ کُـنْـتُـمْ تُـحِبُّـوْنَ الـلّٰــهَ فَاتَّبِعُوْنِی [1]	آپ کہہ دیجئے، اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو
وَاَنَّ هٰـذَا صِـرَاطِـیْ مُسْتَـقِیْماً فَاتَّبِعُوْهُ [2]	یہ میرا راستہ سیدھا ہے پس اس کی اتباع کرو۔

(۶) حلال وحرام کی صراحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام کرنا۔

یَـاْمُـرُهُـمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَاهُمْ عَــنِ الْــمُــنْـکَـرِ وَیُـحِـلُّ لَهُـمُ الــطَّیِّبٰــتِ وَیُـحَـرِّمُ عَـلَیْهِـمُ الْخَبَائِثَ [3]	وہ (نبی) ان کو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں پاکیزہ چیزیں حلال قرار دیتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا چند آیات سے معلوم ہوگیا کہ رسول کی حیثیت "محض کسی پیغام رساں" اور ڈاکیہ کی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کے بندوں پر اسکے منشا ومراد کو نافذ کرنے والے خلیفۃ اللہ کی ہے۔

حضرت محمدؐ قرآن کی نظر میں:

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً وباطناً کامل ومکمل بنایا، اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْم فرما کر آپؐ کی فکر ونظر، علم وعمل اور دیانت وامانت وغیرہ تمام صفات واوصاف کو سندِ کمال واعتبار عطا کیا۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃ فرما کر پوری زندگی کی ہر حرکت وسکون پر مہرِ تحسین وتصدیق ثبت فرمادی۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ فرما کر آپؐ کی زبان مبارک سے صادر ہونے والے تمام کلمات کو صحت وصداقت کی ضمانت

[1] سورۃ آل عمران: ۳۱　[2] سورۃ الانعام: ۱۵۳　[3] سورۃ الاعراف: ۱۵۷

عطا کی ۔اِنَّ الَّـذِیْـنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَایُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ فرما کر آپ کی بیعت کو اپنی بیعت،مَـنْ یُـطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ کے ذریعہ آپؐ کی اطاعت کو بلاشبہ اپنی اطاعت،وَمَـارَمَیْـتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی فرما کر آپؐ کے عمل کو اپنا عمل،اورآپؐ کی زبان سے، فَـاتَّبِـعُـوْانِـیْ یُـحْبِبْـکُمُ اللّٰہَ کہلوا کر آپؐ کی اتباع کو اپنی محبت کا وسیلہ قرار دیا۔ نیز اعلان فرمایا کہ رسول اسی لئے بھیجے جاتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے۔مَـااَرْسَـلْـنَـا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّالِیُـطَـاعَ بِـاِذْنِ اللّٰـہِ ۔آپؐ کی اطاعت کو بندوں پر فرض فرمایا،یَـااَیُّھَـاالَّـذِیْنَ اٰمَـنُـوْااَطِـیْـعُـوْاالـلّٰہَ وَاَطِیْعُوالرَّسُوْلَ آپ کے ساتھ برابری اور عامیانہ سلوک کرنے کو حرام اور آپؐ کے مرتبہ کے احترام کو فرض قرار دیا۔اَلـــنَّبِـــیُّ اَوْلـــٰی بِـالْـمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ، لاَتَـجْـعَـلُـوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاءِ بَـعْـضِـکُـمْ بَـعْـضـاً، اَ تَـجْـھَـرُوْالَـہٗ بِـالْـقَـوْلِ کَجَھْرِبَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ، لَاتُقَدِّمُوْابَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ.

بہرحال ان تمام آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں ہمیں یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ نبی صرف پیغام رساں یا مرکز ملت یا امام وقت نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب الاتباع ہادی ورہبر ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایمان کے بغیر اپنے اوپر ایمان کو ان کی اطاعت کے بغیر اپنی اطاعت کو ناقص ونامکمل اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔اور جس طرح اپنی کتاب کے بارے میں اِنَّ ھٰـذَاالْـقُـرْآنَ یَھْدِیْ لِـلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ. فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلیٰ صِـــرَاطٍ مُّسْتَقِیْـمٍ فرمایا اسی وجہ سے اہل السنّت والجماعت کا اجماعی عقیدہ یہی ہے کہ دین قرآن وحدیث کے مجموعہ کا نام ہے۔قرآن وحدیث کے درمیان وہی نسبت ہے جو قلب کو قالب سے اور جسم کو جان سے ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے

لئے لازم ہیں ۔اسی طرح کتاب وسنت کو ایک دوسرے سے جدا کر کے مذھب اسلام اور دین حق کا تصور باطل ہے۔

نبی کی جاہلانہ تعریف:

لیکن امت میں ہر زمانہ کے اندر ایسے گمراہ طبقات وجود میں آتے رہے ہیں جو مفادات حاصلہ کے آلۂ کار اور عقل ورائے کے شکار ہو کر جمہورِ امت اور سوادِ اعظم سے علاحدہ ہو جاتے اور اپنے لئے دیڑھ اینٹ کی الگ مسجد تعمیر کر لیتے ہیں۔ اور جب دشمنان اسلام کو ایسی کسی شخصیت یا طبقہ کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ لوگ فوراًان مسلوب التوفیق اور محروم الھدایت افراد کے دماغوں اور دلوں پر ترغیب وتحریص یا ترھیب وتخویف کا جال پھینک کر اور انہیں اپنے قابو میں لے کر اسلام مخالف سرگرمیوں کیلئے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ کتاب اللہ کو سمجھنے اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کیلئے احادیثِ شریفہ کے ضروری ہونے کے مسئلہ میں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے یا دشمنانِ اسلام کی طرف سے تیار کئے گئے جنہوں نے محض اپنی عقل ورائے کی بنیاد پر اس سلسلہ میں پوری امت کے برخلاف یہ نام نہاد وخانہ ساز نظریہ وجود میں لایا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور اسکے بندوں کے درمیان ایک قاصد اور پیغام رساں کی ہے۔اور ان کی اتباع من حیث الرسول تو واجب نہیں البتہ بہ حیثیت امام یا بہ حیثیت مرکز ملت لازم ہوتی ہے، وہ بھی صرف ان کی زندگی کی حد تک، ان کے خیال میں” اطاعت“ زندہ کی فرمانبرداری کو کہا جاتا ہے اور جب رسول کا وصال ہو جائے تو اب”اطاعت“ کے امر کو پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔

یہ ان حضرات کی متفرق تحریرات کا خلاصہ ہے یا جوانکی دو اہم کتب ا۔مقامِ حدیث ۲۔اسباس زوال امت سے مستفاد ہیں، اسکی تفصیل اہلِ علم مذکورہ کتب میں دیکھ سکتے ہیں۔

تاریخ انکارحدیث:

علامہ بدرعالم میرٹھی نے صراحت فرمائی ہے کہ انکارحدیث کا فتنہ پہلی صدی ہجری کے بعدکی پیداوار ہے،اورمعتزلہ اس کے بانی ہیں،موجودہ صورت شکل سے گومختلف سہی مگراس درخت کی جڑ اسی گمراہ فرقہ میں نظرآتی ہے۔ان سے قبل تمام مسلمان بالاتفاق احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوحجت شرعیہ اوراصل دین تسلیم کرتے تھے۔حتی کہ روافض،خوارج اورقدریہ جیسے فرقوں کوبھی اس سے اختلاف نہ تھا۔

اس باطل نظریہ کی بیخ کنی وتردیدکاباقاعدہ کام سب سے قبل سیدناالامام الشافعیؒ نے فرمایا۔پھرامام احمدابن حنبلؒ، حافظ ابن قیمؒ،امام غزالیؒ،ابن حزمؒ اورحافظ محمد ابراھیمؒ وزیر، حافظ جلال الدین السیوطی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس بے سروپا خیال کا مضبوط رداوراطاعت رسول کی واجبیت واہمیت کامستنداثبات کیا۔یہاں ہندوستان میں ہمارے علماء دیوبند نے بھی ان تحریکوں کا زبردست تعاقب کیا ہے۔ چنانچہ مولانامناظراحسن گیلانیؒ کی"تدوین حدیث"علامہ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی "نصرۃ الحدیث"مولانا تقی عثمانی مدظلہ کی"حجیت حدیث"مولانا رفیع عثمانی مدظلہ کی "کتابت حدیث "مولاناادریس کاندھلویؒ کی"حجیت حدیث"جیسی مستقل تصنیفات منظرعام پرآئیں نیزمولانا احمدرضا بجنوریؒ نے"مشکلات القرآن"کے مقدمہ میں،مولانا بدرعالم میرٹھیؒ نے"ترجمان السنہ"میں اوردیگراساتذہ حدیث نے اپنی دروس وشروحات میں ضمناً اس مسئلہ پرمختصرمگرمدلل وشافی کلام کیا ہے۔اس طرح کہ کسی متلاشی حق کومزیدتحقیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔**فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء**

معتزلہ چونکہ اچھی معلومات اورخاصاعلم رکھتے تھے۔اس لئے اپنے پیداکردہ اس جاہلانہ فتنہ کوزیادہ نباہ بھی نہ سکے،اورانکارحدیث کی توجیہات وتاویلات کرکے

اپنا کام چلاتے رہے۔ ماحول میں خیر کے غالب ہونے اورعلم وعمل، علماء سے ربط وضبط کا عام رواج ہونے اوراس فرقہ کے بذات خود اہل سنت والجماعت سے خارج ہونے کی وجہ سے امت ان کے ان باطل خیالات سے بفضلہٖ تعالیٰ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوسکی، البتہ معتزلہ کا پیدا کردہ یہ فتنہ شدہ شدہ ہواپرست وآزاد خیال لوگوں کی مدد سے ——علماء اسلام کی مساعی مشکورہ کے باوجود—— کہیں نہ کہیں پلتا اور بڑھتا رہا، تا آنکہ بیسویں صدی عیسوی میں اس نے ایک مستقل مکتب فکر اور باقاعدہ فرقہ کی شکل اختیار کرلی۔

مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں:

"بیسویں صدی کے آغاز میں جب مغربی اقوام کا سیاسی نظریاتی تسلط بڑھا تو کم علم مسلمانوں کا ایسا طبقہ وجود میں آیا جو مغربی افکار سے بے حد مرعوب تھا، وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ترقی بغیر تقلید مغرب کے حاصل نہیں ہوسکتی، اور یہ کہ اسلام کے احکام "تقلید مغرب" کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اسلئے اس نے اسلام کو مغربی افکار کے مطابق بنانے کے لئے تحریف کا سلسلہ شروع کیا۔ کیونکہ احادیث زندگی کے تمام شعبوں کو شامل ہیں اور امت کو اپنا پابند بناتی ہیں، پھر مغربی افکار سے متصادم بھی ہیں تو مغرب زدہ طبقہ نے اس کو اپنی من مانی وآزادی کی راہ سے ہٹانا ضروری سمجھا۔ اس کاز کیلئے کام کرنے ہندوستان میں سرسید احمد خان اوران کے رفیق مولوی چراغ علی، مصر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ترکی میں ضیاء گوک الپ بنیادی طور پر معروف ہیں۔ گوکہ ان لوگوں نے احادیث شریفہ کا انکار نہیں کیا، لیکن تدریجی طریقۂ کار کے ذریعہ عملی انکار ہی کے مرتکب ہوئے۔"

پھراس نظریہ کوکسی قدر منظّم طور سے عبداللہ چکڑالوی نے "اہل قرآن" کے نام سے ایک فرقہ قائم کرکے پروان چڑھایا جس کا مقصد حدیث کا مطلق انکار تھا۔ پھر

اسلم جیراجپوری نے انکار مطلق کے نظریہ سے ہٹ کر اپنی ترتیب سے اس کو مزید ترقی دی۔اسکے بعد جب غلام احمد پرویز نے اس نظریہ کی باگ ڈور سنبھالی تو "طلوع اسلام" کے نام سے اس نظریہ کو ایک منظّم اور باقاعدہ نظریہ و جماعت کی شکل میں تبدیل کردیا۔زبان وقلم کے ذریعہ بحث ومباحثہ کا دروازہ کھولا، آزادی ومن مانی کو پسند کرنے والے طبقے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نظریہ تھوڑی ہی مدت میں ایک مستقل تحریک اور منفرد دعوت کی حیثیت سے پروان چڑھنے لگا ہے۔ادھر کچھ دنوں سے جس تیزی سے عوام الناس میں علم دین اور بنیادی اسلامی معلومات کی کمی ہوتی جارہی ہے اسی رفتار سے اس تحریک کو دن بہ دن ترقی ملتی جارہی ہے۔کم علم بلکہ دین کی حد تک بے علم لوگ چند آیات واحادیث کو لیکر بے بنیاد دعاوی اور نامعقول دلائل بلکہ انتہائی سطحی باتوں کے ذریعہ عوام الناس بالخصوص دین سے دور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنے گمراہ کن خیالات کا حامی بنانے میں مشغول ہیں۔

پاکستان ــــــ جو تقریبا تمام گمراہ فرقوں کا مولد ہے ــــــ اس میں تو زور وشور سے ان کا کام جاری ہے۔اتفاق سے ادھر قریب عرصہ میں انہیں بعض جید اہل علم وصاحب زبان وقلم افراد اہل سنت والجماعت سے ہاتھ لگ گئے ہیں، مثلاً علامہ تمنا عمادی پھلواری، حبیب الرحمٰن کاندھلوی یہ حضرات پہلے اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے پھر شامت اعمال اور شومئی قسمت سے اس گڑھے میں جا گرے۔ انہوں نے اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں کو اس فتنہ کی آبیاری اور اس نظریہ کی ترقی واشاعت پر صرف کیا، متعدد تصانیف انکے قلم سے منصۂ شہود پر آئیں۔جن میں علمی خیانتوں کے ایک خاص طریقۂ کار کے ذریعہ احادیث شریفہ اور حضرات محدثین کرام کے تیرہ سوسالہ اعتبار واعتماد کو مجروح کرنے کی مذموم سعی اور ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب ــــــ **واللہ اعلم**

بحقیقۃ الحال ——— جانتے بوجھتے، اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے، اور جس شوخ اور بے ادب زبان وقلم کو استعمال کیا گیا ہے وہ نا قابل بیان ہے۔[1] جس طرح مشرکین قرآن کریم کو "اساطیر الاولین" سے زیادہ ماننے کو تیار نہیں تھے، اسی طرح یہ حضرات احادیث مبارکہ کو "مذہبی داستانوں" اور "من گھڑت کہانیوں" سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

منکرین حدیث کے دعاوی۔

اس گمراہ فرقہ کے دعاوی جیسا کہ عرض کیا گیا، متفرق ومنتشر ہیں۔ان کی کوئی ایسی کتاب نظر سے نہیں گذری جو اس فرقہ کے بنیادی عقائد ونظریات کو واضح کرسکے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ یہ فرقہ کھل کر مسلمانوں کا سامنا کبھی بھی نہ کرسکا۔دبی زبان اور محتاط اسلوب میں اپنے مضامین اور خیالات کے درمیان کچھ ایسی باتوں کو ظاہر کردیا کرتے ہیں جن سے ان احادیث کا ضعیف یا موضوع ہونا یا اسکے مفہوم ومطلب کا مشکل ومتضاد ہونا ظاہر ہو۔اسکے لئے مختلف مصنفین مختلف باتیں کہا کرتے ہیں ۔البتہ ان سب میں قدر مشترک احادیث شریفہ کی معروف حیثیت کو کمزور کرنا اور اس سے کسی طرح جان چھڑانا ہوتا ہے ۔اسلئے اب تک جو تصنیفات ورسائل منظر عام پر آسکی ہیں وہ کسی حدیث یا کسی جزوی مسئلہ کی تحقیق کے زیر عنوان ہیں۔مثلاً حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح، شب برأت کی حقیقت، سماعِ موتی، عذابِ قبر، اختلاف امت والی روایت کی تحقیق، موضوع احادیث، زہری وطبری کے مسلک کی تحقیق اور روافض سے متعلق چند عنوانات وغیرہ۔البتہ بہ حیثیت مجموعی ان کے جو دعاوی ان کی تصنیفات سے مستفاد ہوتے ہیں یا بوقت

[1] یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ ائمہ جرح وتعدیل کے الفاظ ہیں اسلئے کہ اسماء الرجال ایک مستقل فن ہے اور اسکا اپنا موضوع اور اپنی زبان ہے۔جس کی زد میں بسا اوقات بڑے بڑے علماء آتے ہیں اردو زبان میں اس کو من وعن ترجمہ سے نہ حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے اور نہ ہی اردو ادب اسکا متحمل ہے، محض راویانِ حدیث کے بے حیثیت کرنے اور ان کے اعتماد کو مجروح کرنے کے لئے ان لوگوں نے عام تحریرات میں یہ طریقہ کا راستعمال کیا ہے، انہی الفاظ جرح کو بوقت ضرورت ہمارے علماء نے بھی اردو کتابوں میں نقل کیا ہے۔لیکن تعبیر میں بین فرق ہے۔

گفتگو جن کا اظہار ہوتا ہے وہ اس طرح ہیں۔

(۱) قرآن کریم ہی اللہ تعالیٰ کی ایک محفوظ کتاب ہے اورتمام جزئیات وکلیات کوشامل ہے۔ بندے صرف اس کتاب کی اتباع کے پابند ہیں۔

(۲) دین کی بنیاد ظن پر قائم نہیں کی جاسکتی جبکہا حادیث کا پورا ذخیرہ ظنی ہے، اسلئے انکی اتباع درست نہیں ہے۔اس سلسلہ میں پھر میں انکی مختلف رائیں ہیں۔

(۳) آپؐ کی اطاعت مرکز ملت کی حیثیت سے واجب تھی من حیث الرسالۃ نہیں تھی۔ یا صرف آپ کے اسوہ وعمل کا اتباع واجب ہےاقوال کا نہیں۔

(۴) بہت سی احادیث قرآن کے خلاف ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع ہیں‌اور بعد والوں کی گھڑی ہوئی ہیں نیز یہ کہ محدثین خود اکثر ناقابل اعتبار ہیں۔

(۵) احادیث تیسری صدی میں لکھی گئی ہیں اور وہ بھی یادداشت کی بنیاد پر! اسلئے ان کا معتبر ہونا مشکوک ہوگیا ہے۔[۱]

ان کے علاوہ بہت سی جزئیات ہیں‌لیکن وہ دراصل ان بنیادی مفروضات کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہیں۔ اسلئے ان کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے،اس وقت صرفمذکورہ بالا مفروضات ومزعومات کا جائزہ لے لینا کافی ہوگا، چنانچہ ہم ذیل میں ان میں سے ہر ایک دعوے کا حقیقی چہرہ —— حتی المقدور —— قرآن کریم ہی کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کریں گے۔ وباللہ التوفیق

ان دعاوی کا مختصر تجزیہ۔

جہاں تک قرآن کریم کی جامعیت کا تعلق ہےتو اہل سنت والجماعت بھی اس کے قائل ہیں مگر اس تفصیل کے ساتھ کہ بلاشبہ قرآن کریم ایک جامع ترین کتاب ہےاور وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں بندہ کی بنیادی راہنمائی کے لئے کافی

ہے مگر وہ اشارہ کی زبان ہے اوراکثر کلی احکام پر اکتفا کرتی ہے گو کہیں کہیں جزئیات کا ذکر بھی آ گیا ہے تاہم وہ جزئیہ بھی غور کیا جائے تو فی الحقیقت ایک کلیہ ہی ہوتا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کے مضامین صرف اصول اوراحکام پر مبنی ہیں۔جن کی تشریح،صراحت اور عملی شکل واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے منشا سے واقف اوراس کے ساتھ رشتۂ وحی رکھنے والی کسی ہستی کا ہونا ضروری ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت ہمیشہ یہی رہی کہ انبیاء بغیر کتابوں کے بھی بھیجے گئے مگر کبھی کوئی کتاب بغیر نبی کے نہیں بھیجی گئی۔اس وضاحت کو مدنظر رکھ کران لوگوں کے دعوؤں کے جوابات ملاحظہ کریں۔

پہلے دعوے کا جواب

(الف) قرآن فہمی کیلیئے اگر بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کی ضرورت نہ ہوتی تو قرآن میں آپ کو لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ کی ذمہ داری کیوں سونپی گئی، عام انسانوں کوخود ہی سمجھ لینے کا اختیار کیوں نہ دیا گیا؟ جبکہ کفار مکہ بھی حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهٗ کا مطالبہ کررہے تھے۔اورقرآنی آیات لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْئٍ جیسی آیات کا مطلب وہی ہے جوآپ سمجھ رہے ہیں کہ قرآن کے ہر مضمون کو ہر عامی وجاہل بآسانی سمجھ سکتا ہےاور یہ کہ قرآن میں تمام مسائل کا بیان موجود ہے۔اس کے لئے کسی شارح کی ضرورت نہیں تو پھر دونوں آیتوں میں تضاد ہوگا۔یعنی ایک آیت میں فرمایا گیا کہ قرآن بہت آسان ہے دوسری میں ارشاد ہے کہ اے نبی! آپ قرآن کریم میں جو کچھ نازل ہوا ہے اُمت کے سامنے اس کی وضاحت کیجئے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے، ظاہر ہے کہ دونوں آیتوں میں اختلاف ہے اورقرآن کہتا ہے لَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔یعنی اگر یہ قرآن غیر

اللہ کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلافات پاتے ،جس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہے ۔اس جگہ لازماً آپ کو ان آیات کی کچھ نہ کچھ تاویل کرنی پڑے گی اور آپ کرتے بھی ہیں ۔اس صورت میں سوال پیدا ہوگا کہ اگر آپ کو تاویل وتفسیر کا حق حاصل ہے تو پھر رسول کو کیوں نہیں ہے؟ پھر اگر ایک تاویل آپ کریں ، ایک تاویل نبی کریں تو اطاعت وقبولیت کے لائق آپ کی تاویل باطل ہوگی یا نبی کی تشریح حق ؟

پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور مرادِ الٰہی تک پہونچنے کیلیئے اس کے لانے والے یعنی" نبی" کی تشریح اور بیان کا سہارا لینا ضروری ہے اس کے بغیر کچھ کا کچھ سمجھ کر گمراہی و بے راہ روی کا شکار ہو جانا یقینی ہے، رہ گیا آیات کا یہ ظاہری تضاد کہ بعض سے قرآن کا ایسا ہونا اور بعض سے مشکل ہونا معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات متعارض اور متضاد ہرگز نہیں ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کا ایک حصہ جو تذکیر وموعظت اور نصیحت وعبرت سے متعلق ہے وہ بالکل عام فہم ہے کہ کسی توضیح وتشریح کے بغیر بھی مخاطب کی سمجھ میں آ سکتا ہے، اور ایک دوسرا حصہ جو عقیدہ واحکام سے متعلق ہے اس کے سمجھنے کے لئے آدمی نبی کی قولی وعملی توضیح کا محتاج ہے، چنانچہ خود صحابہ کرامؓ کو باوجود ماہر عربیت ہونے کے بھی اشتباہ ہوا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کے بعد وہ حقیقی معنی کو پا سکے، جس کی بے شمار مثالیں تفسیر وحدیث کی کتب میں موجود ہیں، جن میں سے چند آگے آ رہی ہیں ۔

(ب) نبی کی تشریحات سے بے نیاز ہو کر صرف قرآن کریم سے دین کے احکام کی تشکیل ممکن بھی نہیں ہے ۔اسلئے کہ قرآن کریم میں بہت سی آیات مجمل اور مبہم ہیں ۔جن کی تشریح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ کر دیتے یا ہم اسے قبول نہ کریں تو ان پر عمل کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اگر لغت اور عربیت کی مدد سے ان

کے مفہوم ومعنی کو متعین کرنا چاہیں گے تو دین ایک مضحکہ خیز کھیل تماشہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہے گا۔ دیکھئے! قرآن کریم نے "الصلوٰۃ" کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ صلوۃ لغت میں رحمت، دعاوغیرہ کے ساتھ ساتھ" **تحریک الصلوین** "یعنی سرینوں کو حرکت دینے کو بھی کہتے ہیں۔اگر کوئی سر پھرا مثلاً رقص کرنے کا نام "**الصلوۃ**" رکھنا چاہے تو قرآن کریم میں وہ کونسی دلیل ہے جس سے آپ اس کو یہ باور کرادیں کہ "الصلوۃ" کے یہ بیہودہ معنی لینا ظلم ہے، اور یہ کہ اسلام میں صلوۃ ایک مخصوص طریقہ عبادۃ کا نام ہے؟۔اسی طرح قرآن میں "**الزکوۃ**" کی ادائیگی کا حکم ہے، لغت تو اسکے معنی صفائی پاکیزگی وغیرہ کے بیان کرتی ہے۔ اگر کوئی مالدار اپنے مال کو دھلا کر صاف کرلے اور اس حکم پر عمل کا مدعی ہوجائے تو آپ کے نزدیک کس طرح اس کو اس سے روکا جاسکتا ہے؟ اور وہ کونسی آیت ہے جو صراحۃً یہ بتلائے کہ "**الزکوۃ**" کے کیا معنی ہیں۔اسی طرح "**الصوم۔النحر۔الحج**" وغیرہ بے شمار احکام ہیں اگر احادیث کی مدد نہ لی جائے تو ان کی اتنی شکلیں اپنی اپنی عقلوں سے وجود میں آجائیں گی کہ مذہب ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے زمانے میں خود صحابہ کرامؓ صاحبِ زبان ہونے کے باوجود بہت سے احکام کو الفاظ کے ظاہر سے صحیح نہ سمجھ سکے تھے، اسی طرح بعض دفعہ اسکے الفاظ کو تو سمجھ گئے مگر اس پر عمل کی صورت اور اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد کو سمجھنے سے عاجز ہوگئے تھے، لیکن جب نبی سے رجوع ہوئے اور تحقیق کی تو آپؐ کے ذریعہ صحیح صورتحال کا انھیں علم ہوا جس کا ثبوت خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے سینکڑوں سوال وجواب اس قسم کے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں نمونۃً جمع کئے ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اولین مخاطبین قرآن یعنی صحابہ کرام ؓ کو بھی قرآن کریم کے بعض مقامات میں اشتباہ ہوتا تھا، وہ نبی کی تشریح کے بغیر محض اپنی

فہم سے اس کی صحیح مراد تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔سوال یہ ہے کہ بقول آپ کے پورے قرآن کریم کو احادیثِ شریفہ سے مدد لئے بغیر ہر کوئی سمجھ سکتا اور عمل کر سکتا ہے تو صحابہؓ خود کیوں نہیں سمجھ کر عمل کر لیتے تھے۔ نبی سے سمجھنے اور اطمینان حاصل کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی تھی؟۔اس کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو خاص اصطلاحات اور اشارات پر نازل فرمایا تھا اور اس کی صراحت بذریعہ وحی والہام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو عطا فرمائی تھی اور آپ کو لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ کہہ کر پابند کیا تھا کہ میرے کلام کا حقیقی مفہوم اپنی امت کو آپ اپنے علم الہامی سے قولاً عملاً بتلا دیں۔اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے احکام پر عمل کی صورتیں نبی پر وحی کی جاتی تھیں جس کو نبی قولاً وفعلاً اپنی امت کے سامنے پیش کرتے تھے۔انہی اقوال واعمال کے مجموعہ کو حدیث کہا جاتا ہے۔جس کا حاصل یہ ہوا کہ احادیث کی مدد کے بغیر صحیح معنوں میں قرآن پر عمل کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

(ج) قرآن کریم میں ہے:مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ اس آیت شریفہ میں نبی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے کلام فرمانے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔(۱) وحی (۲) پس پردہ خطاب (۳) بذریعہ قاصد پیغام رسانی ،قرآن کریم بالاتفاق تیسری صورت کے ذریعہ پہونچا ہے۔پہلی صورتوں کے ذریعہ اللہ پاک نے اپنے نبی کے ساتھ جو کلام فرمایا ہے وہ وحی آخر کہاں ہے؟اور اس پر عمل ضروری نہ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟

(د) قرآن کریم میں بہت سی ایسی باتوں کا حوالہ ہے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔مثلاً مَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِىۡ كُنۡتَ عَلَيۡهَا (وہ قبلہ جس پر آپ پہلے تھے) عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ (اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ تم

لوگوں نے ـــــ روزہ مکمل کرنے کے سلسلہ میں ـــــ اپنے نفسوں سے خیانت کی) وغیرہ ان احکام پر قرآن کے مطابق پہلے نبی اور صحابہؓ کا عمل تھا۔ جب کہ یہ احکام قرآن میں اب مذکور نہیں ہیں تو وہ صحابہ کرامؓ کو کس ذریعہ سے معلوم ہوئے تھے، اور انہوں نے اس پر عمل کس بنیاد پر کیا تھا؟ معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی جامعیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی کا ہر ہر مسئلہ اس کے اندر صراحۃً بیان کر دیا گیا ہے اس طرح کہ نبی کی صراحت کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یہ ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، نہ عقلی نہ نقلی۔ مذکورہ آیات اور ان جیسی بہت سے آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے احکام نبی نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُمت کو ایسے بھی دیئے ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ پھر محض قرآن کریم کو لے لینا اور احادیثِ رسول کو ترک کر دینا دین کامل کیلئے کیسے کافی ہوسکتا ہے؟

(ہ) خود قرآن کریم نے **مَاآتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ** یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو۔ **اِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْئٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ** یعنی اگر تم واقعی صاحبِ ایمان ہو تو اپنے اختلافات اللہ اور اسکے رسولؐ کی طرف لوٹا دو (پھر جو حکم ملے اس پر عمل کرو)۔ **فَلَا وَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** آپ کے رب کی قسم! کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے اختلافات کو آپ کی خدمت میں پیش نہ کر دے پھر آپ کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم نہ کر دے۔ وغیرہ بہت سی آیات میں نبیؐ کی اطاعت کا صریحی حکم دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ "منکر حدیث" سب سے پہلے "منکر

قرآن" ہوتا ہے پھر" منکر حدیث"۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی عامل بالقرآن منکر حدیث نہیں ہوسکتا اور کوئی منکر حدیث عامل بالقرآن نہیں ہوسکتا۔

دوسرے دعوے کا جواب

(۲) یہ کہنا کہ احادیث ظنی الثبوت ہیں اسلئے اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ:

(الف) یہ کیسے پتہ چلا کہ قرآن قطعی الثبوت ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّانَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ یعنی ہم نے ہی قرآن اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، کے ذریعہ وعدہ کیا ہے تو پھر اسی میں حدیث شریف کی حفاظت کا وعدہ بھی نکل آتا ہے۔ اسلئے کہ قرآن محض الفاظ یا محض معنی کو نہیں کہا جاتا بلکہ "نظم و معنی" دونوں کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے "ذکر" کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تو "بیان ذکر" کی حفاظت خود اس میں شامل ہوگئی، جبکہ دوسری آیات میں یہ بات اور بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ نیز اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ آیت منزل من اللہ ہی ہے درمیانی لوگوں کا اضافہ نہیں ہے!

(ب) پھر حفاظت قرآن والی آیت جس ترتیب اور جن ذریعوں سے ہم تک پہونچی ہے اسی ترتیب اور اسی ذریعہ سے احادیث رسول بھی پہونچے ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی شخص دو باتیں ایک کو قرآن کے نام سے دوسری کو حدیث کے نام سے بیان کرتا ہے تو آپ کہیں کہ آیت پہونچانے میں تو یہ شخص معتبر، مگر حدیث پہونچانے میں اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کیا عقل و خرد اس ہٹ دھرمی کو تسلیم کرسکتی ہے؟

(ج) قرآن کریم میں ارشاد ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا جس کا

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بنایا ہے، دوسری آیت میں ہے: اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو، ادھر بقول منکرینِ حدیث اللہ تعالیٰ نے حفاظتِ حدیث کی نہ کوئی ذمہ داری لی ہے اور نہ اس کا کوئی انتظام کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنا کے ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ آپ بتلائیں کہ حفاظت حدیث کا انکار کر کے آپ اللہ تعالیٰ پر ظلم و کذب کا الزام نہیں لگا رہے ہیں؟

تیسرے دعوے کا جواب

(۳) اطاعت رسول سے متعلق آیات میں یہ تاویل کرنا کہ " آپ کی اطاعت مرکز ملت کی حیثیت سے واجب تھی" محض ایک دعویٰ ہے جسکی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(الف) اگر اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ میں اطاعت مطلق کی ــــ جو تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے ــــ بلا دلیل تاویل کی جا سکتی ہے تو اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ کی بھی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں رسول پر بہ حیثیت حاکم اور مرکز ملت کے ایمان لاتا ہوں "من حیث الرسول" نہیں لاتا تو کیا آپ اس کے ایمان کو تسلیم کر لیں گے؟ اور ہو سکتا ہے آپ اپنی بات رکھنے کو تسلیم بھی کر لیں مگر کیا اسکا کوئی جواز قرآن کریم سے پیش کیا جا سکتا ہے؟ پس جس طرح "ایمان بالرسول" کے معنی من حیث الرسول آپ کو ماننے کے ہیں اسی طرح "اطاعت رسول" کے معنی بھی من حیث الرسول فرمانبرداری کرنے کے ہوں گے۔

(ب) نیز علماء نے صراحت کی ہے کہ جب کسی اسم مشتق پر کوئی حکم لگایا جائے تو مادہ اشتقاق اس حکم کی علت ہوگا۔ پس جس طرح "اَکۡرِمِ الۡعَالِمَ" کا مطلب "علم کی وجہ سے عالم کا اکرام کرو" لیا جاتا ہے اسی طرح اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا

مطلب رسالت کی بنیاد پر رسول کی اطاعت کرنا ہوگا۔

(ج) اس کے علاوہ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ رسول کے رسول ہونے کی حیثیت اور ہے، حاکم ہونے کی حیثیت اور ہے۔ حاکم ہونے کے لئے رسول ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قیامت تک حکام اور ائمہ ہوسکتے ہیں لیکن ان کی حیثیت، مقام، ادب واحترام کیا وہی ہوسکتا ہے، جو رسول کا ہوتا ہے۔ اور جس کا قرآن نے امت کو پابند کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا!

(د) پھر رسول کی بات رسول ہونے کی حیثیت سے نہ ماننا مرکزِ ملت ہونے کی حیثیت سے ماننا، یہ تقسیم بھی کسی ثبوتِ قرآنی کے بغیر ہے، سوال یہ ہے کہ قرآن کریم جب رسول کو ہمیشہ رسول کے نام اور رسول کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، تو آپ کو کس نے حق دیا کہ آپ اس کی اطاعت کے حکم میں یہ تفریق و تقسیم اپنی عقل ورائے سے کردیں؟ یہ عجیب معمہ ہے کہ آپ کے نزدیک خود رسول تو قرآن کا شارح نہیں ہوسکتا مگر آپ اس کا حق رکھتے ہیں کہ رسول کی حیثیت کو متعین کریں۔

چوتھے دعوے کا جواب

(۴) کوئی "حدیثِ صحیح" قرآن کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ اسلئے کہ جب کوئی حدیث اصولی طور پر محدثین کے نزدیک معتبر ہوگی وہ اہل علم کے نزدیک آج تک قرآن سے متعارض ومتصادم نہیں ہوئی۔ خواہ بادِی النظر میں کسی کو ایسا محسوس ہو۔ مگر فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوتا، اسلئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا تو وہی بات فرماتے ہیں جو قرآن میں ہے یا اس کی تشریح وتوضیح فرماتے ہیں یا جو بات قرآن میں نہیں ہے اس کا حکم فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ کے حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مدد سے خود بیان کرتے ہیں۔ چوتھی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو مذکورہ تینوں صورتوں میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ آپ کی کوئی تعلیم وحکم

قرآن کریم کے کسی حکم سے متعارض ہو جائے۔ آپ لوگ ایسی جتنی روایات پیش کرتے ہیں ان روایات میں علماء اہل سنت والجماعت کو ڈیڑھ ہزار برس میں آج تک ان میں قرآن کے ساتھ تعارض نظر نہیں آیا۔ اب چودھویں صدی میں آپ لوگ اپنی عقل ورائے سے زبردستی تعارض پیدا کریں اور دوسرے کی کوئی بات سننے سے اپنے کان بند کر کے اپنی ہی رٹ لگائے جائیں کہ "حدیثیں قرآن سے ٹکرا رہی ہیں" تو اس نامعقولیت کا کوئی علاج دنیا میں نہیں ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں یہ تو ارشاد فرمایا کہ **ذالک الکتاب لا ریب فیه** "یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں" یہ نہیں فرمایا کہ "اسمیں کسی کو شک نہ ہوگا" چنانچہ بہت سے لوگوں کو قرآن کریم میں بھی تضاد نظر آیا ہے اور اس کی صداقت میں شبہ ہو گیا ہے، تو کیا ان کو تضاد نظر آنے اور شک پیدا ہونے کا معقول جواب دیا جانا چاہئے یا ان کی وجہ سے قرآن کریم کو ——— نعوذ باللہ ——— غیر معتبر کتاب کہہ کر رد کر دینا چاہئے؟ خود سوچ لیجئے!

پانچویں دعوے کا جواب

(۵) رہی کبار محدثین کے رافضی و بے اعتبار ہونے کی آپ کی اپنی اپج! تو حیرت ہوتی ہے کہ حضرات محدثین کرام کی بہترین، بے مثال اور مخلص جماعت جو زمین پر گویا اللہ کی ایک آیت و حجت ہے اس پر "عمل بالقرآن" کے مدعیوں نے کس قرآنی اصول کی بناء پر الزام طرازی و بہتان تراشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے؟ کیونکہ ان کا یہ عمل قرآن کے خلاف ہے، اس لئے کہ قرآن نے اپنے مخاطبین کو حکم دیا ہے کہ وہ ان تک پہونچنے والی خبروں کو بلا تحقیق قبول نہ کریں۔ **اِنْ جَاءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَیَّنُوا** حد یہ ہے کہ خود قرآن کریم پر بے سوچے سمجھے گر پڑنے اور تدبر سے کام نہ لینے کو بھی ناپسند کیا گیا ہے۔ اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے

ہوئے فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَاذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۔ان آیات قرآنیہ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حضرات محدثین کرام کے بارے میں بھی تحقیق وجستجو سے کام لے کر فیصلہ کیا جاتا کہ ان کا عقیدہ ومسلک کیا ہے۔آخر ڈیڑھ ہزار برس کے اہل اسلام اور علماء اعلام کوئی نادان بچے تو نہیں ہیں کہ آنکھ بند کر کے کسی کو مستند و معتبر سمجھتے آرہے ہیں۔آج آپ نے کس تحقیق کی بناء پر یہ الزام لگایا ہے؟ ہوسکتا ہے آپ کتب اسماء الرجال کا سہارا لیں گے مگر یہ آپ کے حق میں حجت نہیں کیونکہ فن" اسماء الرجال" قرآن نہیں ہے، محض ایک تاریخی فن ہے۔آپ تاریخ تو کیا حدیث کو بھی نہیں مانتے ہیں، اسی وجہ سے حدیث سے استدلال کو کہانیوں سے استدلال قرار دیتے ہیں۔لیکن" اسماء الرجال" کو کتاب اللہ کے مرتبہ پر رکھتے ہیں، جبکہ آپ اس فن کی حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس میں ائمہ فن نے اپنی معلومات کے مطابق رواۃ حدیث کی سیرۃ پر کلام کیا ہے اور پھر وہ خود بھی ایک انسان ہیں، بشری کمزوریوں اورتقاضوں سے محفوظ نہیں ہیں، اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کی غالب اکثریت اور مجموعی بیانات کو سامنے رکھ کر کسی راوی کا مرتبہ متعین کیا جائے جیسا کہ" قائلین حدیث" بالخصوص ہم" مقلدین" کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے تحقیق کا حکم دیا ہے، اور جب تاریخ رواۃ حدیث کے اس ذخیرہ" اسماء الرجال" کو بہ حیثیت مجموعی سامنے رکھ کر بلا کسی تعصب و بے دیانتی کے جائزہ لیا جاتا ہے تو معروف محدثین اور حدیث کے مدونین بہ حیثیتِ مجموعی اعتبار واعتماد تو پاسکتے ہیں مگر کسی طرح مجروح ومتہم نظر نہیں آتے۔ ہاں! اگر کوئی حدیث رسول کا دشمن ٹھان ہی لے کہ آزادخیالی اور اسلام دشمنی کی راہ سے حدیثوں کی رکاوٹ کو ختم کردوں تو چونکہ تاریخ میں کوئی محدث ایسا نہ ملے گا جس کی بابت کسی کی بھی رائے مخالف نہ ہو اور ان پر کچھ جرح کے الفاظ استعمال نہ کئے گئے ہوں اس

لئے ایسا شخص ان تنقیدوں سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح محدثین کرام کے اعتبار واعتماد کو مجروح کرنا اور ان پر وضع یا رفض کی تہمت لگانا انصاف کا خون کرنا ہے۔ حد ہوگئی اس بددیانتی اور ہٹ دھرمی کی کہ اپنے لئے تو کہیں سے بھی بے سروپا اور من گھڑت کہانیاں وضع کر لینے اور ان کی بنیاد پر کسی بھی محدث وفقیہ کی پگڑی اچھالتے رہنے کی گنجائش ہے اور دوسروں کے لئے یہ پابندی کہ وہ قرآن سے ہٹ کر بات نہ کریں۔ اپنے کو "آپ" دوسرے کو "تو" کا یہ فلسفہ آپ ہی کو مبارک کسی صاحب علم وسمجھ کیلئے تو کس طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ ؎ تم ہی بتاؤ کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

چھٹے دعوے کا جواب

(٦) آخری بات یہ کہ "حدیثیں تیسری صدی میں مرتب کی گئی ہیں اس لئے ان کا اعتبار مشکل ہے تو عرض یہ ہے کہ آپ قرآن کریم سے کوئی دلیل پیش کیجئے کہ احادیث اگر مدون ہوں تو اعتبار کیا جائے ورنہ نہیں، حفاظتِ حدیث الگ چیز ہے اور تدوینِ حدیث الگ مسئلہ ہے اصل مسئلہ یہ تحقیق کرنا ہے کہ احادیثِ شریفہ کی حفاظت ہر دور میں اس دور کے معروف طریقہ کے مطابق ہوتی رہی یا نہ ہوسکی یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ کتابت اور تدوین کب ہوئی؟ کیونکہ وسائل حفاظت بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ آج حفاظت علم کا ذریعہ جب کمپیوٹر اور سی ڈی بن گئے ہیں تو آپ کی طرح کوئی عقلمند یہ کہنے لگے کہ "چونکہ قرآن کریم چودھویں صدی کے بعد سی ڈی میں محفوظ کیا گیا ہے اسلئے ہم اس کو وہی قرآن نہیں مانتے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا" تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ اگر آپ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کے وعدہ سے استدلال کرتے ہیں تو یہ استدلال آپ کے اصول سے کامل نہیں، اسلئے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس آیت کے بھی آپ تک

پہونچنے کا وہی ذریعہ ہے جو احادیث کے پہونچنے کا ہے آپ کے پاس اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ آیت ان لوگوں نے گڑھ کر قرآن میں داخل نہیں کی بلکہ رسول ہی کی طرف سے پہونچائی ہے، انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآن کریم ہو یا حدیث رسول ان کی صداقت وحفاظت کے تیقن کے لئے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہر زمانہ کے مروج ومعتبر طریقۂ حفاظت کے مطابق محفوظ رہ کر بہ تواتر وتوارث ہم تک پہونچے یا نہیں؟ جب ایسی بات ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ علماء اسلام ناقابل رد دلائل عقلیہ سے ثابت کر چکے ہیں کہ عہد رسالت میں بالعموم "حفاظت بالعمل" اس کے بعد "حفاظت بالحفظ والعمل" کا رواج تھا، مسلمانوں نے احادیث مبارکہ کو بھی انہی طریقوں سے محفوظ رکھا اور پورے اشتغال ودلچسپی کے ساتھ محفوظ رکھا، پھر کتابت کا رواج عام ہوا اور اسکی ضرورت محسوس کی گئی تو پورے اہتمام اور نادر انتظام سے اس ذریعہ حفاظت کو اختیار کیا گیا۔ پھر اس اہتمامِ حفاظت کی عہد بہ عہد تفصیل وتاریخ بھی آپ کے سامنے رکھ دی، متکلمین اسلام نے حدیث کی حجیت اور حفاظت پر اس قدر کتب لکھ دی ہیں کہ کسی متلاشی حق کیلئے ان میں کسی اضافہ کی ضرورت اب باقی نہیں رہ گئی۔ کوئی بدنصیب شپرہ چشم اس روشنی سے آنکھ موندھ کے یہود ونصاری کے قدم بہ قدم چل کر تاریکی میں رہنا چاہتا ہے تو رہا کرے ہمارے لئے ایسے فرد یا طبقوں کا وجود میں آجانا نہ حیرت انگیز ہے نہ پریشان کن۔ اسلئے کہ ہمیں ہمارے نبی نے اس کی خبر بہت پہلے ہی دے دی تھی۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خبردار! عنقریب ایسا وقت بھی آئے گا کہ کسی شخص کو میری حدیث پہونچے گی وہ اپنے تخت پر (بے نیازی کے ساتھ) ٹیک لگائے بیٹھ کر اسکے جواب میں کہے گا کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔ ہم صرف اسکے حلال کو حلال اور اسکے حرام کو حرام سمجھتے

ہوں (کسی اور کے کلام کی ہمیں ضرورت نہیں) خبردار! اچھی طرح سمجھ لو مجھے کتاب اللہ بھی دی گئی اتنا ہی علم اور بھی دیا گیا ہے (یعنی وحی متلو کے ساتھ وحی غیر متلو بھی ہے اور دونوں کے مجموعے سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔)

منکرین حدیث کہئے یا اہل القرآن یا جماعت المسلمین یا کچھ اور! یہ وہی طبقے ہیں جو مغرب زدہ ہے اور اسلام دشمن قوتوں کا شکار ہوکر دین اسلام کو اپنی عقل کا تابع اور اپنی عقل کو دین کا متبوع وماخذ بنائے ہوئے کسی "لبرل اسلام" Liberal islam کی تیاری میں مشغول ہیں۔ ان کے حق میں سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ تجزیہ صدفی صد صحیح ثابت ہوتا ہے۔

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین ۱/۴۵ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: "متبعین عقل حدیث کے دشمن ہوا کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں احادیث کا علم حاصل کرنے اور انہیں یاد رکھنے کی توفیق کبھی نہیں ہوتی، ادھر لوگ اس سلسلہ میں کچھ سوالات کرتے ہیں تو جواب دیتے بھی نہیں بن پڑتا، شرم دامن گیر ہوتی ہے تو اپنی رائے وعقل سے جواب دیا کرتے ہیں اور عقل ہی سے حدیثوں کا مقابلہ ومعارضہ شروع کردیتے ہیں، پس میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ ایسے گمراہ طبقہ سے بچتے رہنا"۔

فاروق اعظم کے اس "فارق بین الحق والباطل" تجزیہ پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہم سب مسلمانوں کو صراط مستقیم کی توفیق عطا فرمائے اور ہر زیغ وضلال سے اپنی پناہ میں رکھے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

تقلید کی ضرورت

تقلید کی ضرورت پر کلام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم پہلے خود تقلید کی حقیقت کو سمجھ لیں۔ اور اس کے سمجھنے کیلئے چند مقدمات ہیں، ان مقدمات کو خالی الذہن ہو کر بالترتیب و بغور مطالعہ کیجئے۔

(۱) اس میں کسی کو شک نہیں ہے کہ اسلام میں مطلق اتباع و اطاعت صرف اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے، جو شخص ان کے ساتھ اطاعت مطلقہ میں کسی اور کو شریک کرے تو وہ بالاتفاق اسلام سے خارج ہے اس میں نہ چون و چرا کی گنجائش ہے اور نہ ہی شک وشبہ کیلئے کوئی راستہ ہے۔[۱]

یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اس پر قرآن کریم کی نصوص قطعیہ اور احادیثِ صحیحہ متواترہ شاہد ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذریعہ اور وسیلہ قرآن و حدیث ہیں، کیونکہ نہ تو ہم اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو سکتے ہیں اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے —— ان کی وفات کے بعد —— براہِ راست استفادہ کیا جا سکتا ہے، اسی وجہ سے آپؐ نے دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل مسلمانوں کی صلاح وفلاح اور ہدایت کی حفاظت کیلئے ان ہی دو چیزوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا: ”میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، اگر تم اس کو مضبوطی سے تھام لو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، ایک اللہ کی کتاب دوسرے اس کے نبی کی سنت![۲]

---

[۱] شرح العقیدۃ الطحاویۃ: ۱/۱۴، [۲] مشکوٰۃ المصابیح ۱/۸۸

(۳) قرآن وحدیث ہی جب اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا واحد ذریعہ ہیں اور ہم ان کی اتباع کے ماموروپابند ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے کہ ان ذرائع کی اپنی خاص نگرانی وتدبیر سے حفاظت وصیانت کا سامان فرمائے۔ چنانچہ قرآن کریم اور حدیث شریف دونوں ہی کی حفاظت کا اللہ پاک نے ذمہ لیا اور یہ دونوں علوم زمانہ نبوت سے ہم تک —— ہر قسم کی خرد وبرد سے محفوظ رہ کر —— اس طرح پہونچی ہیں کہ عقلیں حیران ہیں اور ہر شخص اعتراف وتسلیم پر مجبور ہے۔(یہ تفصیل کا موقعہ نہیں اسلئے جنہیں اشکال ہو یا تفصیل جاننا چاہتے ہوں وہ تدوینِ قرآن وحدیث کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرلیں وہاں دلائلِ نقلیہ وعقلیہ سے اس دعوے کو اس قدر مدلل ومستند کردیا گیا ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں رہی۔[1] چونکہ ہمارا مخاطب جو طبقہ ہے وہ اس بات کا منکر نہیں اسلئے یہاں اسکے بیان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔)

(۴) اللہ تعالیٰ کا کلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام مجموعی طور پر انسانی زندگی کے انفرادی واجتماعی تمام شعبوں کو شامل اور ان کی کلیات وجزئیات کے حامل ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا وجود وصدور ایک ہی وقت میں اور یکجا طور پر کسی مرتب قانون کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ تدریجی وتدریبی طرز پر مناسب مواقع اور ضرورت کے اعتبار سے ہوا۔ چنانچہ قرآن کریم کے نزول اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وتشریحات کا دور پورے ۲۳ سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے، باوجودیکہ کفار نے "جملة واحدة" یعنی اکھٹے نازل ہونے کو بڑا اعجاز وکمال سمجھ کر اس کا مطالبہ کیا تھا۔[2] مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کو نامعقول قرار دے کر تدریجی ترتیب ہی کو قائم رکھا۔ مختصر یہ کہ قرآن وحدیث میں جو احکامات مذکور ہیں وہ کوئی نظریاتی خاکہ نہیں ہیں، بلکہ عملی زندگی کے سدھار اور فرد

[1] دیکھئے: مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوین حدیث، [2] سورۃ الفرقان: ۳۲

ومجتمع کی درستگی کی کامیاب عملی شکل ہے، مذکورہ تفصیل کا منشا اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نزولِ قرآن کے پورے ۲۳ سالہ عہد، اسکی ابتدا وانتہا، احوال وکوائف، مواقع ووقائع، تعبیرات واصطلاحات اور بالخصوص دعوت محمدیؐ کے مزاج ومنہاج کو اچھی طرح جانے سمجھے بغیر احکامِ شرع کو ان کے ''ظاہری الفاظ اور محض لغوی معنیٰ'' کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرنا نہایت ناسمجھی اور کم فہمی کی بات ہے۔

(۵) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا دور دین اور صفاتِ اسلامی کی عملی تصویر ہونے کے اعتبار سے جامع ترین اور کامل ترین دور تھا، جب تک آپ موجود تھے سمع وطاعت آپ کے پروانوں کا شیوہ تھا، اور آپؐ کے بعد بھی عوام صحابہؓ ضرورت کے مواقع پر خواص صحابہؓ کے علم وفقہ کا اعتبار کرتے رہے، آپؐ کی طرف کسی غلط بات کو منسوب کرنا یا دین میں نفسانیت اور ہوا وہوس کو راہ دینا وہ لوگ گویا جانتے بھی نہ تھے۔ اس کے بعد جیسے جیسے آپ کے دور سے دوری ہوتی گئی مسلمانوں میں تمام صفاتِ اسلامیہ کمزور ہوتی چلی گئیں اور ایسا ہونا ایک فطری وتکوینی امر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے سے متصل تین دور کو خیر القرون قرار دیا: **خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم**[۱]، اسی طرح حدیث دیانت میں صفتِ دیانت وامانت کے دھیرے دھیرے زوال پذیر ہونے کی خبر دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: آخر میں ایسا دور آجائیگا کہ لوگ پورے پورے قبیلہ میں سے کسی ایک شخص کا تعارف دیانتدار ہونے کی حیثیت سے کروائیں گے''۔ اسی طرح آپؐ کا یہ ارشاد بھی ذخیرہ احادیث میں موجود ہے کہ ہر آنے والا دور گذرے ہوئے دور سے باعتبار دین ودیانت کمتر ہوگا، خود ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخی تجزیہ اس حقیقت کی صداقت پر نا قابلِ تردید ثبوت ہے، مزید یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہی حال حافظہ کی پختگی، تقویٰ اور پرہیزگاری اور

[۱] صحیح بخاری فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۲/۱۸۹

علومِ عالیہ میں تعمق وگہرائی، وفنونِ آلیہ میں وسعت وگیرائی کا بھی ہے کہ خیر القرون کے بعد سے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ صفتیں امتِ مسلمہ میں قابلِ لحاظ حد تک انحطاط کا شکار ہوتی چلی گئیں اور ہوتی جارہی ہیں۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اپنی سب مخلوقات کو یکساں قوت کا مالک نہیں بنایا ہے، ہر جنس مخلوق میں غور کیجئے اس کی انواع اور ہر نوع کے افراد کے مابین استعداد وصلاحیت میں نمایاں اور واضح فرق موجود ہے، ہر درخت برابر پھل نہیں دیتا، ہر لکڑی کی قوت ایک جیسی نہیں ہوتی، ہر پھول کی خوشبو مساوی نہیں ہوتی، ہر زمین کی پیداوار برابر نہیں ہوتی، ہر جگہ کا پانی ایک قوت ولذت کا نہیں ہوتا، ہر ستارہ کا حجم اور روشنی برابر نہیں ہوتی، ہر انسان کی عقل برابر نہیں ہوتی، ہر ایک کا ہاضمہ ایک جیسا نہیں ہوتا، ہر ایک کا حسن جدا ہوتا ہے وغیرہ بیشمار مثالیں ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ ومصالحِ تکوینیہ سے اپنی مخلوقات حتیٰ کہ انسانوں کی بھی استعدادوں کے مابین نمایاں فرق رکھا ہے۔ بلاشبہ وہ مدبر کائنات اور قائم الارض والسماوات ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے، پس! جس طرح اس نے تمام مخلوقات کی استعدادوں وصلاحیتوں میں کمی بیشی کا فرق رکھا ہے اور انسانی صلاحیتوں میں بھی اس کا یہ قانون جاری وظاہر ہے، اسی طرح اس نے علم وفہم میں بھی اپنے سب بندوں کو ایک معیار پر نہیں رکھا فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ[۱] کہ ''ہر صاحبِ علم پر اس سے بڑا عالم موجود ہے'' نیز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابِ کرامؓ جیسی مبارک ومحترم جماعت سے فرمایا ''لیلنی منکم اولو الاحلام والنھی''[۲] تم میں سے جو لوگ صاحب فہم و دانش ہیں وہ نماز میں مجھ سے قریب کھڑے ہوا کریں، اسکے علاوہ بے شمار مثالیں ہیں جو اس حقیقت کے شریعت میں معتبر ہونے پر دلالت کرتی ہیں کہ علم وفہم میں سب

[۱] سورۂ یوسف: ۷۶، [۲] مسلم کذا فی مشکوۃ: ۱/۳۱۸

مسلمان برابر نہیں ہو سکتے۔

(۷) دین کے احکام عبوری طور پر دو طرح کے ہیں، بعض وہ ہیں جو بالکل واضح، عام فہم اور محکم ہیں، جنہیں پڑھنے کے ساتھ ہی کوئی زبان داں بغیر کسی تشریحی مدد کے ان کی مراد و مفہوم کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، اس میں ایمانیات یعنی عقیدۂ توحید ورسالت وآخرت وغیرہ نیز حسنِ اخلاق وعادات اسی طرح حسنِ معاملت ومعاشرت، اور بندگی وعبادت کے عام احکام شامل ہیں، ان کے برخلاف بعض دوسرے احکام ہیں جو متشابہ، محتمل المعانی، یا بظاہر متعارض ہیں، جنہیں پڑھنے یا سننے کے بعد ایک عام آدمی اپنے علم وفہم کی کوتاہی کی وجہ سے الجھن کا شکار ہو جاتا ہے، نہ وہ کوئی مفہوم متعین کر پاتا ہے، نہ تعارض کو دور کر پاتا ہے، نہ ہی ان کے مختلف مواقع تلاش کر کے ان پر منطبق کرنے کی سکت رکھتا ہے، اس قسم میں حلال وحرام، طہارت ونجاست، نکاح وطلاق اور دیگر معاملات وعبادات کی بہت سی جزئیات داخل ہیں، یہ دوسری قسم ہے جو عام پڑھے لکھے آدمی کی دسترس سے باہر ہے، اس کیلئے کسی راسخ فی العلم، قرآن وحدیث کے ماہر اور عربی زبان وادب پر قادر، ساتھ ہی دیانتدار وپرہیزگار عالمِ دین کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر مسئلہ میں اس سے متعلق تمام نصوص، ان کی درایتی وروایتی حیثیت اور استدلالی قوت کی اچھی طرح چھان بین کر کے ناسخ ومنسوخ، مقدم ومؤخر، وغیرہ کی تعیین کر سکے اور اسبابِ ترجیح اور وجوہِ تطبیق وغیرہ جیسے بنیادی اصولوں کے ذریعہ انکی شرعی حیثیت کو متعین کر سکے اسی طرح ان میں جو ظاہری اختلاف وتضاد نظر آ رہا ہے اس کو حل کر سکے۔

(۸) علم دین کا یہی وہ حصہ ہے جس میں ایک عالم کو بھی دوسرے عالم کی ضرورت ہوتی ہے چہ جائے کہ عوام! ارشاد نبوی ہے" جس شخص نے بغیر علم کے فتویٰ

دیا تو اس کا وبال اسی پر ہے"۔[۱] اس سے صاف ظاہر ہے کہ امت میں کچھ لوگ فتویٰ لینے کے پابند ہیں اور کچھ فتویٰ دینے کے قابل ہیں، سب مسلمان علمی اعتبار سے یکساں صلاحیت کے حامل نہیں ہیں، اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مسئلہ بتانا یا فتویٰ دینا یا بالفاظِ دیگر قرآن وحدیث سے مسائل استنباط کرنا یہ ہرکس وناکس کا کام نہیں ہے، اس کے لئے علم وفہم کی معتد بہ صلاحیت درکار ہے۔

(۹) جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ بغیر قرآن وحدیث اور ان سے متعلق اصولی علم میں مہارت کے محض زبان دانی اور سطحی معلومات کے ذریعہ ہر شخص براہِ راست قرآن وحدیث سے مسائل واحکام کو صحیح طرح نہیں نکال سکتا، جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو چونکہ دین کی پابندی ضروری ہے تو قرآن وحدیث میں مہارت پیدا کرنا بھی ضروری ہے، جبکہ اس کا اُمت کے علماء میں کوئی بھی قائل نہیں، اور نہ ہی عہدِ رسالت سے آج تک کسی دور میں عملاً ایسا ہوسکا ہے، کیونکہ ایسا ہونا فطرتاً وعادتاً ناممکن ہے۔ ہر صاحبِ دانش وعقل جانتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے ہر فرد کو اس قدر علم کے حصول کا پابند کیا جاتا جس سے وہ کتاب وسنت سے براہِ راست احکام نکال لینے کے قابل ہوجائے تو یہ حکم اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ بن کر پورے نظامِ زندگی کی تباہی کا سبب ہوجاتا، اور کارخانہ عالم کا کاروبار ہی ٹھپ پڑ جاتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے تمام بندوں کو پورے علم کے حاصل کرنے اور خود ہی احکامِ دین کو سمجھ کے ان پر عمل کر لینے کا پابند نہیں بنایا البتہ ان میں سے ایک جماعت کو اس کام کیلئے مختص ہونے کا حکم دیا، تاکہ وہ پورے علم دین کے ماہر بن کر دوسروں کو بوقتِ ضرورت راہنمائی کریں۔ ارشاد ربانی ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ[۲] وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ[۳] یہ اور

[۱] ابوداؤد:۳۲۱ [۲] سورۃ التوبۃ:۱۲۲ [۳] سورۃ النساء:۸۳

ان جیسی دوسری آیات اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے بہت کافی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن وحدیث کی بہت سے احکام ومسائل ایسے بھی ہیں کہ معمولی واقفیت اور سطحی علم کے ذریعہ ان کے حقیقی منشا اور صحیح مراد کونہیں پایا جاسکتا ادھر یہ بھی مسلم ہے کہ ہر مسلمان اپنے کو بہت زیادہ علمی استعداد حاصل کرنے اور کتاب وسنت پر عبور حاصل کرنے کے لئے فارغ نہیں کرسکتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اس کا پابند قرار دیا ہے تو لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ امت ہر زمانہ میں دو طبقوں میں منقسم رہی ہے اور رہے گی، ایک وہ طبقہ جو معمولی ومختصر علم ودانش رکھتا ہے، دوسرا وہ جو علم دین کی تفصیلی دلائل اور نظائر کی وسعت، اور علومِ دینیہ پر عبور کامل رکھتا ہے۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دین پر ثبات قدمی واستقامت اور زیغ وضلال سے حفاظت کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ "کم علم اور کم فہم" طبقہ اس "کثیر العلم اور ماہر کتاب وسنت طبقے" کے علم وعقل پر اعتماد کرکے اور ان سے پوچھ پوچھ کر اطاعتِ خدا ورسول کا فریضہ ادا کرتا رہے، اور یہ دوسرا طبقہ دن رات کتاب وسنت کے احکام میں غور وفکر کرتے ہوئے امت کی ضرورت اور حالات کے مطابق ان کی دینی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے۔فقہ کی اصطلاح میں پہلے کو مقلد دوسرے کو مجتہد کہتے ہیں۔**فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**[1] جیسی آیات اور **انما شفاء العی السوال، فاقتدوا بالذین من بعدی ابابکر وعمر**[2] جیسی احادیث کا یہی مطلب ہے، اس جگہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کم علم وفہم طبقہ کا —— جو خود سے احکام کا استنباط نہیں کرسکتا اسلئے وہ علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کرنے کا پابند کیا گیا ہے —— "عالمِ مجتہد" سے اس کے قول کی دلیل پوچھنا محض لغو ولایعنی اور فضول عمل ہے، اس لئے کہ اگر وہ اس کے قابل

---

[1] سورۃ النحل:۴۳ [2] ترمذی:۵/۳۷۵

ہوتا تو وہی عالم اور مجتہد ہوتا، پھر اگر اس کو بتلا بھی دیا جائے تو وہ بے چارہ کیا خاک سمجھ سکتا ہے؟

(۱۱) ایک آخری بات یہیں صاف ہوجانا چاہیے کہ عام مسلمان کسی عالم سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کا کیا حکم ہے؟ اور عالم مجتہد جب جواب دیتا ہے تو دراصل اپنے نزدیک اس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی جو انتہائی تحقیق ہے اس کو بتلاتا ہے یعنی تقلید و اجتہاد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعتِ مطلقہ میں کسی غیر کی شرکت نہیں ہوتی، نہ مقلد کی جانب سے نہ مجتہد کی طرف سے، کیونکہ مقلد مجتہد کی رائے معلوم نہیں کرتا منشائے دین کو جاننا چاہتا ہے، اور مجتہد اپنے نفس وخواہش سے جواب نہیں دیتا بلکہ کتاب وسنت سے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اخذ کردہ حکم بتلاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عوام کے لئے یہی سیدھا معقول ومنقول راستہ ہے اور بالکل عقل وفطرت کے مطابق ہے۔[۱]

ان گیارہ بنیادی باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب تقلید کی تعریف ملاحظہ کیجئے:

التقلید: عبارة عن اتباع الانسان غيره فيما يقول اويفعل، معتقداً للحقية فيه من غير نظر وتأمل فى الدليل[۲] یعنی تقلید نام ہے اپنے غیر کے قول یا فعل کا اس کے حق ہونے کے اعتقاد کی وجہ سے دلیل کو دیکھے اور پرکھے بغیر اتباع کر لینا۔

التقلید: العمل على قول من لا حجة له بلا حجة[۳]

[۱] اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں، حتیٰ کہ غیر مقلد حضرات کے ہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کی عوام نہ ہر مسئلہ کی خود تحقیق کر سکتی ہے اور نہ ہی اپنے علماء پر اعتماد سے گریز کر سکتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ تقلید کریں تو عین توحید ہے اور ہم کریں تو سراسر شرک وکفر! کوئی حد ہے اس ظلم وجہل کی۔ [۲] کتاب التعریفات للجرجانی: ۲:۷۰، [۳] تیسیر التحریر: ۲/۲۴۱

"تقلید نام ہے ایسے شخص کے قول پر بلا طلب دلیل عمل کر لینے کا کہ جس کا قول فی نفسہٖ حجت نہیں ہے" یعنی وہ نبی نہیں ہے، اس کا اپنا قول حجت نہیں ہے، رہ گیا اس کا کتاب وسنت سے استخراج کرکے کسی حکم کا بتلانا تو وہ بلا شبہ حجت ہے اور عام آدمی کیلئے اس کا اتباع لازم ہے، اب بلا طلب دلیل کی شرط پر بظاہر اشکال ہوسکتا ہے مگر وہ اشکال بھی باطل ہے، اسلئے کہ جب اس سائل میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو اس کا دلیل طلب کرنا اور عالم کی طرف سے بتلانا دونوں فضول اور بے معنیٰ عمل ہیں، اس لئے کہ اگر دلائل کو سمجھنے اور ان میں فرق کرنے کا اہل ہوتا تو وہ خود مجتہد ہوتا مقلد نہ ہوتا۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ تقلید کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن وحدیث کا پورا علم نہیں اور وہ شریعتِ مطہرہ کے مزاج اور مسائل اخذ کرنے کے بنیادی اصولوں سے بھی اچھی طرح واقف نہیں اس کا کسی عالم مجتہد کی دیانت وامانت، دین میں مہارت اور عقل وعلم کی کثرت پر اعتماد کرتے ہوئے مسئلہ معلوم کرکے اس مسئلہ پر —— بلا طلب دلیل —— عمل کر لینا، اور وہ بھی صرف تحقیق طلب اور مختلف فیہ مسائل میں، نہ کہ محکم اور متفق علیہ مسائل میں یعنی صرف ان مسائل میں جو مفہوم کے اعتبار سے مبہم، معانی کے لحاظ سے محتمل ومتشابہ، مضمون کی حیثیت سے بظاہر متعارض یا مضطرب ہوں آپ ہی دیانت سے بتلایئے کہ اس تعریف اور تفصیل کی روشنی میں کون شخص ہوگا جو صاحبِ علم ودانش بھی ہو اور عوام الناس کیلئے تقلید کی ضرورت کا منکر بھی ہو؟ ہاں! عقل وعلم سے کورا ہو، مزاجِ اسلام اور اس کے فطری نظام سے بے خبر ہو یا پھر ضد وتعصب کا بیمار ہو تو اور بات ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء اسلام اور ائمہ دین نے اس ضرورت کو تسلیم اور اس کے موافق عمل کو ضروری سمجھا ہے۔[۱] بہرحال! اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ جمہور

---

[۱] دیکھئے راہ اعتدال: ۵۳، ۵۴

امت کا اس بات پر اتفاق واجماع ہے کہ عوام الناس کیلئے سب سے اسلم ومحفوظ راستہ تقلید ہی کا ہے، اور یہ کہ تقلید کا یہ راستہ قرآن وحدیث، تعامل صحابہؓ اور عقل سلیم کے ذریعہ ثابت ہے۔ اس کی تفصیل ہمارے علماء نے چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابوں میں جمع کردی ہیں، وہ کتابیں چھپی ہوئی ہیں اور بازار میں ہر جگہ دستیاب بھی، تعصب سے آزاد ہوکر دیانت وامانت کیساتھ ان رسائل کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ سرمۂ بصیرت ثابت ہوگا۔

گذشتہ تفصیل سے قارئین کرام کو اتنی بات تو سمجھ میں آگئی ہوگی کہ تقلید نہ کفر وشرک ہے نہ بدعت وضلالت، بلکہ دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ثابت اہم دینی ضرورت اور دین پر ثابت قدم رہنے کا محفوظ ومؤثر ذریعہ ہے، اب اس کے بعد ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ چلو تقلید واقعی اہم اور ضروری سہی مگر کسی ایک امام مجتہد کی تقلید کی پابندی کیوں ضروری ہے؟ مقلد کو اختیار ہے کہ وہ جب جس کی چاہے تقلید کرلے۔

سواس کا جواب یہ ہے کہ جائز تو دونوں صورتیں ہیں اور تعامل صحابہؓ وتابعین سے ثابت بھی، لیکن آپ غور کریں کہ تقلید کی دو اہم مصلحتیں ہیں، ایک شارع کے صحیح منشا پر عمل آوری دوسرے ہوا وہوس کے شکار ہوجانے سے حفاظت، تقلید مطلق کے ذریعہ غیر مجتہدین کے لئے پہلی مصلحت کا حصول تو ممکن ہے دوسری مصلحت کا حصول ممکن نہیں، تجربہ وتعامل عام سے یہ بات واضح اور ثابت ہوگئی کہ ہوا وہوس کے عموم اور دیانت وامانت ورع وتقویٰ کی دن بہ دن کمی کی وجہ سے اتباع دین کے بجائے اتباع نفس ورائے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ جبکہ اسلام اتباع ہوا وہوس کو خطرناک مہلکہ قرار دیتا ہے، قرآن وحدیث میں اس کی شناعت وخباثت بکثرت وارد ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ**

اَضَاعُوْا الصَّلوٰةَ وَاتَّبَعُوْا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيّاً یعنی ”نبیوں کے بعد پھر ایسے ناخلف لوگ وجود میں آگئے جنھوں نے نمازوں کو ضائع کیا اور خواہشات نفسانیہ کے درپئے ہوگئے، سوعنقریب یہ غی میں داخل کئے جائیں گے۔“ اسی طرح حدیث پاک میں ”اعجاب کل ذی رای برائیه“ کو علامات قیامت میں شمار کیا گیا، اور ”هوی متبع “ کو مہلکات وموبقات میں سے فرمایا گیا ہے، اس لئے امت کو اس موذی مرض سے بچانا بھی بہت ضروری تھا، جس کے نتیجہ میں دین ومذہب کا اتباع ختم ہوکر ہوائے نفسانیہ کا بازار گرم ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے احکامات ہوس پرستی، مفاد پسندی اور تاویلات باطلہ کے ذریعہ کھیل تماشہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ (جس کی واضح اور خطرناک وشرمناک مثالیں مضمون کے دوسرے حصے میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔) اسی خطرہ کے مدنظر خیر القرون کے بعد کے علماء نے بڑی دوراندیشی اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے قرآن وحدیث کی روشنی میں امت کے لئے تقلید شخصی کو —— سدذریعہ سے کی رو سے —— لازم اور ضروری قرار دے دیا، جس پر —— کچھ علماء کو چھوڑ کر —— پوری امت کے سلف وخلف کا اجماع ہوگیا، اور یہی طریقہ تواتر وتوارث کے ساتھ آج تک قائم ہے، **فالحمد للّٰه علی نعمائه الشاملة و آلائه الکاملة**

اس کے برخلاف ادھر کچھ عرصہ سے ایک طبقے کی جانب سے —— جس میں بعض اہل علم وفضل اور اکثر کم علم وغیر معتبر حضرات شامل ہیں —— تقلید کا یہ مسئلہ بڑی شدومد بلکہ غلو وافراط کے ساتھ اٹھایا جارہا ہے، گو ہر زمانہ میں چند علماء ”نفس تقلید یا تقلید شخصی“ کی ضرورت کے مخالف ومنکر رہے، لیکن ان حضرات میں اعتدال تھا اور وہ اپنی تحقیق میں مخلص ومعذور تھے، پھر ان کا طریق اختلاف بھی بہت حد تک مخلصانہ ومنصفانہ ہوا کرتا تھا، نیز وہ لوگ مقلدین کی حقانیت، ائمہ مجتہدین کی عالی مقامی، وفورِ علم اور تحقیق میں مخلص وصادق ہونے کے نہ صرف بدل

وجان قائل تھے بلکہ ان کے احترام واکرام اور تعظیم مقام میں کسی قسم کی کوتاہی یا کم ظرفی سے کوسوں دور اور بے تہذیبی و بے ادبی سے سخت نفور تھے، مگر اب اس جماعت میں ایک ایسا کم فہم و ناسمجھ طبقہ وجود میں آیا ہے جو مبادیات دین واصول اور فقہ سے قطعاً ناواقف اور بالکل سطحی ذہن ومزاج کا حامل ہے، اس طبقہ کا ماننا ہے کہ جب قرآن وحدیث مرتب ومدون شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں، اور احادیث کی معیاری تقسیم وتعریف بھی ہوچکی ہے تو اب کسی امام مجتہد کی کیا ضرورت ہے؟ ائمہ مجتہدین اور فقہا وعلماء کی اتباع کرنے کے بجائے براہِ راست قرآن و حدیث کا اتباع کر لینا ہدایت کیلئے کافی ہے، نیز یہ کہ صحیح حدیث کے ہوتے ہوئے کسی کم درجہ کی حدیث کی طرف دیکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، جب کہ خود محدثین کے نزدیک اس فنی تقسیم کا وہ مفہوم نہیں جو ان حضرات نے اختیار کیا ہے، لیکن آج بچہ بچہ کا حال یہ ہیکہ چند حدیثیں، چند محدثین کے نام، چند مسائل کو لے کرامت میں تفریق وانتشار اور تکفیر کا بازار گرم کر رہے ہیں، اور اپنے علاوہ پوری امت مسلمہ کو کبھی مشرک، کبھی یہودی اور کبھی ائمہ کے پجاری اور خدا جانے کن کن الزامات سے نواز رہے ہیں، صبح وشام کا مشغلہ اور زبان وقلم کا مصرف ائمہ کرام اور علماء عظام کی توہین کرنا بنائے ہوئے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ فروعی اختلافات ــــ جن میں سے ہر پہلو کی اصل کتاب وسنت میں موجود ہے ــــ کو اصولی اور اعتقادی اختلاف کا درجہ دے کر اپنے موقف کی طرف اس طرح دعوت دے رہے ہیں جیسے گمراہوں کو ہدایت کی طرف، یا باطل پرستوں کو حق پرستی کی طرف یا کفار ومشرکین کو ایمان وتوحید کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ جاننے والے جانتے بوجھتے اور نہ جاننے والے انجانی ونادانی میں وہ منھ شگافیاں اور خامہ زوریاں دکھار ہے ہیں کہ خرد سر پیٹ رہی ہے، اور دین ودیانت کا جنازہ نکل رہا ہے، **والعیاذ**

باللّٰہ من الشیطان الرجیم اور جب سے عرب ممالک کے چند آزاد خیال واباحیت پسند علماء ان کے ہاتھ لگ گئے اور اس سطحی خیال میں پھنس گئے تب سے تو کیا کہنا ان جہالتوں کی نہ تو کوئی حد ہے نہ انتہا، وہ باتیں انشاء اللہ تعالیٰ میں آگے نقل کروں گا جن سے آپ ہمارے اس دعوے کا ثبوت پائیں گے۔

اس طبقہ کے لوگ اپنے کو اہل حدیث، سلفی، اثری، محمدی، مدنی اور خدا جانے کن کن ناموں سے موسوم کرتے ہیں، مگر عملی صورتحال یہ ہے کہ یہ لوگ حدیثوں کا نام ضرور لیتے ہیں مگر اپنی منتخب واختیار کردہ حدیثوں کے علاوہ دیگر حدیثوں پر عمل نہیں کرتے، خواہ وہ احادیثِ صحیحہ ہی کیوں نہ ہوں۔ سلفی کہلاتے ہیں مگر سلفِ صالحین کے سخت مخالف ہیں، اثری بنتے ہیں مگر نہ کسی صحابی کے اثر کو قبول کرتے ہیں نہ تابعین وائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، محمدی بننے کا شوق ہے مگر اسوہ محمدی سے کوسوں دور ہیں، مدنی لکھتے ہیں مگر ہیں ہندوستانی، واقعہ یہ ہے کہ جو حال ان کا اپنی نسبتوں کے ساتھ ہے وہی حال پورے دین کے ساتھ ہے۔

الغرض دین پر ثبات اور کما حقہ اتباع کی ایک تو تقلید واتباع والی شکل تھی جو گذشتہ سطروں میں بیان کی گئی اور جسے بفضل اللہ تعالیٰ وعونہٖ جمہور علماء کرام اور مسلمانوں کے "سواد اعظم" نے اختیار کیا اور الحمد للہ کہ یہ لوگ اخلاص وللٰہیت کے ساتھ کتاب وحکمت کے منشا کے مطابق، علماءِ راسخین، ائمہ مجتہدین اور سبیل المؤمنین کے اتباع کی برکت سے آج تک ہر قسم کی بے راہ روی اور گمراہی، بے ادبی و بے تہذیبی اور بزرگوں کی شان میں گستاخی کے جرم سے محفوظ ومامون ہیں (عملی کوتاہیاں علاحدہ چیز ہیں، اس سے نہ وہ خالی ہیں نہ ہم!) اور جس قدر بھی اعمال، اشغال، موعظت، تذکیر، اصلاحِ اُمت کی مساعی، فرقِ باطلہ ضالہ کا مقابلہ، الحاد وارتداد کے حملوں سے ملت کا دفاع، عقائد اسلامی کا تحفظ، مختصر یہ کہ حفاظت

واشاعت اسلام کی جو بنیادی وکلیدی محنتیں پورے عالم میں اس وقت تک ہورہی ہیں —— کس طرح اللہ کا شکرادا کیا جائے کہ —— بفضلہٖ تعالیٰ وہ سب یا —— ان کا بڑا حصہ —— اسی جماعت حقہ اور سواداعظم کے حصہ میں آئیں۔ **اللھم لانحصی ثناء ا علیک انت کمااثنیت علی نفسک**

اس کے برخلاف جن لوگوں نے دوسری صورت —— خودمختاری وآزادی کی —— اختیار کی، تقلید کو غیرضروری بلکہ کفروشرک کے برابر جرم سمجھا اوراس نہایت معقول ومقبول، فطری اورکتاب وسنت اور تعاملِ سلف سے ثابت طریقہ کار کی نامعقول وغیرمستند طریقہ سے مخالفت کرتے رہے، تاریخ وتجربہ شاہد ہے کہ نہ ان کی منطقی گاڑی زیادہ دورتک چل سکی نہ ہی ان کے استدلال نے بہت دیرتک یاوری کی، کچھ دوراور کچھ مسائل تو ظاہرنصوص سے کام چلا سکے مگر بات آمین بالجہر، رفع یدین، قرأت خلف الامام جیسے چند جزوی اورمحض ترجیحی مسائل سے ذرا آگے بڑھی تو انہی شارحینِ حدیث اورفقہاء کرام کی بیساکھیوں کے محتاج ہونا پڑا جن کی اتباع کو شرک فی النبوت کہنے سے تک دریغ نہ کیا تھا، اسلئے کہ ان چند جزوی مسائل اور اختلافی موضوعات تک دین محدود نہیں الدین الکامل کو اگرصحیح شکل میں دیکھنا ہے تو علماءاعلام، فقہاءاسلام اورمحدثین کرام سب ہی سے مدد لینی پڑتی ہے، چندمنتخب حدیثوں کورٹ کرمسلمانوں کے درمیان ناپسندیدہ افتراق تو پیدا کیا جاسکتا ہے دین قیم اوردین کامل کی صحیح تصویرپیش نہیں کی جاسکتی۔ میں غیرمقلدین کے معتبر علماء کی بات تونہیں کرتا —— کہ وہ اس سطح کے لوگ نہیں ہیں —— مگراب جو کھیپ میدان میں اُتری ہوئی ہے جس پرخودان سنجیدہ علماء واکابرِ جماعت کا بھی کچھ بس نہیں چلتا صرف ان کا رونا رورہا ہوں، ان میں عوام بھی ہیں علماء کہلائے جانے والے بھی ہیں، البتہ ان بزرگوں سے اتنی شکایت ضرور ہے کہ ان کی طرف

سے ان غلط بیانیوں اور نا درست حملوں پر کرنے اور غالی لوگوں کو اعتدال پر لانے کی سعی کسی سمت سے نظر نہیں آتی ، لامحالہ ہم کو اس موضوع میں دخل دینا اور جہلاء کے خلاف کبھی کبھی زبان وقلم تیز کرنا پڑتا ہے۔

الغرض! جب ان مدعیانِ عمل بالحدیث کا سکہ چند مخصوص اور مقصود کے اعتبار سے کم اہم مسائل سے آگے دیگر مسائل دین واحکامِ شریعت میں کچھ زیادہ نہیں چلتا اور علماء ربانیین کی گرفت مضبوط ہونے لگتی ہے تو اس میں ایسے ایسے گستاخ پیدا ہو جاتے ہیں جو آنکھیں بند کر کے لاٹھی گھمانا شروع کر دیتے ہیں، خواہ اسکی زد میں ائمہ کرام آجائیں یا صحابہ عظام! ہمارے نزدیک دراصل عدم تقلید کا یہی سب سے بڑا مضر ومفسد پہلو ہے جس نے اباحیت واجازت کا نہ بند ہونے والا دروازہ کھول دیا اور خود کو نہ سمجھ میں آنے والی ہر بات رد کر دینے اور صحیح وضعیف کے پس پردہ احادیثِ رسول وآثارِ صحابہؓ کی حجیت کو جھٹلا دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جسے دیکھو بخاری کا ترجمہ ہاتھ میں لے کر ائمہ کرام وصحابہ عظام کا وزن تولنے اور گردن ناپنے پر تلا ہوا ہے، نہ اصولِ تفسیر سے باخبر ہوتا ہے نہ ہی اُصولِ حدیث کی شد بد ہوتی ہے، نہ صحیح کی فنی تعریف معلوم ہے نہ ضعیف کی حقیقت سے واقف! مگر اصرار یہ ہے کہ فقہاء اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں، حدیثِ صحیح کو چھوڑ کر مخالفتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجرم ہوئے ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ تو ان کی نظر عالی میں کسی حساب میں نہیں آتے ، انھیں وہ حدیث کے میدان میں "طفلِ مکتب" بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، آج چھوٹے چھوٹے مکتبوں میں کمسن بچے کم ازکم چالیس احادیث تو سنا ہی دیتے ہیں اور نام نہاد اہل حدیثوں ـــــ غیر مقلدوں ـــــ کے نزدیک امام اعظم صرف سترہ حدیثوں سے باخبر تھے۔ **فیا حسرۃ علیھم ویا للعجب!**

اللہ روحوں کو ٹھنڈی رکھے اور بے انتہا رحم فرمائے ان علماءِ راسخین پر جنھوں

نے عوام امت کیلئے اپنی بصیرت خداداد کے ذریعہ تقلید کو واجب کر کے اس آزادی و بے راہ روی سے بچالیا ہے ورنہ کیا عجب کہ اس دین کا اسی وقت جنازہ نکل گیا ہوتا، اور آج ہمیں خدا کا یہ دین نفس پرستوں کا کھلونا بن کر پہنچا ہوتا، حیرت ہے کہ ان چشم کشا تجربات کے بعد بھی ان اللہ والوں اور پاک بازوں کی جلالتِ علمی و بلند نگاہی کا یہ لوگ اعتراف نہ کر سکے۔

ان مدعیان "عمل بالحدیث" کی کجروی وگمرہی کا یہ نقشہ ممکن ہے آپ کے قلوب پر ہمارے قلم سے بہت شاق گذر رہا ہو اور بارگراں معلوم ہو رہا ہو، اس لئے ہم چاہتے ہیں اسی جماعت کے متصلب اور پختہ خیال بزرگوں واکابر کے قلم سے ہی چند جواہر پارے ناظرین کی خدمت میں پیش کریں جن میں انہوں نے اپنی جماعت کے جہلاء کا یہی رونا رویا ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ کیونکہ مشہور ہے **صاحب البیت ادری بما فیه**، ملاحظہ فرمائیں:

☆ نواب صدیق حسن خان صاحب جو اس جماعت کے قابل اور صاحبِ تصانیف علماء میں سے ہیں، اپنی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس زمانہ میں ایک شہرت پسند اور ریا کار فرقہ پیدا ہوا ہے جو باوجود ہر قسم کی خامیوں کے قرآن وحدیث کے علم اور ان پر عمل کا مدعی ہے حالاں کہ اس فرقہ کو علم وعمل اور (اصولِ احکام کی) معرفت کے ساتھ کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں"۔[1]

"تعجب کی بات ہے کہ غیر مقلدین کیوں کر اپنا نام خالص موحد رکھتے ہیں اور دوسروں کو (جو تقلید کرتے ہیں) مشرک کہتے ہیں، حالاں کہ یہ خود سب لوگوں سے بڑھ کر سخت متعصب اور غالی ہیں"۔[2]

☆ ایک اور بڑے غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالویؒ فرماتے ہیں:

---

[1] الحطہ فی ذکر صحاح الستہ: ۱۳۰　[2] ایضاً

"پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، کفر وارتداد، فسق وفجور کے اسباب کے لئے بے علم یا کم علم ہو کر ترک مطلق تقلید کے مدعی ہیں، وہ ان نتائج سے ڈریں، اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہو جاتے ہیں"۔[۱]

☆ صحاح ستہ کے اردو مترجم نواب وحید الزماں حیدر آبادی رقم طراز ہیں:

"غیر مقلدوں کا گروہ جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتے ہیں، انھوں نے ایسی آزادی اختیار کی ہے کہ مسائل اجماع کی بھی پرواہ نہیں کرتے، نہ سلفِ صالحین، صحابہ اور تابعین کی، قرآن کی تفسیر لغت سے اپنی من مانی کر لیتے ہیں، حدیث شریف میں جو تفسیر آ چکی ہے اس کو بھی نہیں سنتے، بعضے عوام اہل حدیث کا یہ حال ہے کہ انھوں نے صرف رفع یدین اور آمین بالجہر کو اہل حدیث ہونے کے لئے کافی سمجھا ہے، باقی اور آداب وسنن اور اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مطلب نہیں ہے، غیبت، جھوٹ، افتراء سے باک نہیں کرتے، ائمہ مجتہدین رضوان اللہ علیھم اجمعین اور اولیاء اللہ اور حضراتِ صوفیہ کے حق میں بے ادبی اور گستاخی کے کلمات زبان پر لاتے ہیں، اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک اور کافر سمجھتے ہیں، بات بات میں ہر ایک کو مشرک اور قبر پرست کہہ دیتے ہیں۔[۲]

☆ یہ پُرانے لوگ تھے تو پُرانی باتیں نہ سمجھیں، ماہنامہ "اہل حدیث" دہلی کے ایڈیٹر نے تو اپنے گھر کا سب کچھ کچا چھٹا سامنے رکھ دیا ہے اور تازہ ترین صورتِ حال سے واقف کرا دیا ہے:

"ہماری جمعیت مسلک کی دعوت وتبلیغ کیلئے نہیں بلکہ روپیہ، اقتدار کی ہوس کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے، عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے اور مسلک وجماعت

[۱] اشاعت السنۃ: ۱۱/۲　[۲] حدیث اور اہل حدیث: ۱۰۳

کا نام اور منصب کا بلیک میل کیا جا رہا ہے، جس شخص کے پاس جمعیت کا عہدہ اور منصب ہو وہ پہلے اس کے ذریعہ عرب دُنیا میں چمکتا ہے، پھر اپنے کاروبار کو وسیع کرتا ہے، کیوں کہ اس منصب کے ذریعہ ویزا اور عرب شیوخ تک رسائی بہر حال آسان ہو جاتی ہے"۔[۱]

ہمارا موضوع ہے "تقلید ضروری کیوں؟" آپ فیصلہ کیجئے اکابر غیر مقلدین نے ترکِ تقلید کے مضرات ونقصانات کا جو تجزیہ و تجربہ پیش کیا ہے اس کے بعد بھی مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کیا غیر مقلدین کی فکری و عملی گمراہی کا یہ چشم دید نقشہ، عینی مشاہدہ ترکِ تقلید کے ہر طرح مضر ہونے کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ بات اب بھی نہیں سمجھ میں آئی تو آگے چلئے، راقم اپنے چند ذاتی تجربات پیش کرتا ہے:

۱) میں نے مسجدِ نبوی شریف کے صحن میں ایک غیر مقلد نوجوان کو یہ تقریر کرتے ہوئے سنا:

"حنفی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر پر آ کر انھیں زندہ سمجھ کر سلام کرتے ہیں اور ان سے سفارش و استغفار کی درخواست کرتے ہیں، جب کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے اے نبی! آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اب مجھے بتاؤ کہ مردوں کے پاس آ کر اس طرح کہنا کیسے صحیح ہوگا؟"

صرف نظر اس کے کہ ہمارا عقیدہ اس سلسلہ میں کیا ہے اور کیوں ہے، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اندازِ بیان اور کلماتِ گستاخانہ کس ذاتِ عالی کے متعلق کہے جا رہے ہیں، آپ اس کا تصور کریں اور منکرینِ تقلید کی اس بے تہذیبی پر آنسوؤں کے بجائے خون روئیں۔

۲) حرم شریف میں ایک دوسرے غیر مقلد نوجوان کی تقریر:

[۱] مجلّہ اہل حدیث: ۲ مارچ ۱۹۹۰ء

"مسلمانو! تمہاری وہ نمازیں جوتم نے حنفی طریقہ سے پڑھی ہیں ایک بھی نہیں ہوئی۔ساری زندگی برباد ہوگئی، اب تو کم از کم نماز پڑھنا سیکھ لو، بغیر رفع یدین کے نماز ہی نہیں ہوتی، ہماراامام صرف ہمارا نبی ہے۔اس کے علاوہ کسی کوامام ماننا شرک ہے۔سعودی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہیکہ اس نے حرم مکہ میں سے چار مصلے ختم کر کے سب مسلمانوں کوایک امام پر جمع کیا، جب تک سعودی حکومت نے مسجدِ حرام میں سے چار مصلے نکال کر کچرے میں نہیں پھینک دیئے جب تک حرم میں بھی شرک گھسا ہوا تھا"۔

میں ان ہفوات پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا اس لئے آپ ایک مرتبہ اورنظر ڈالئے اورسوچئے کہ کیا اسمیں کچھ بھی سچائی ہے؟۔

۳)ایک غیر مقلدامام مسجد کی تفسیر بالرائے ملاحظہ فرمایئے:

"جونمازیں چھوٹ گئیں ان کی قضا نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن میں ہے: نیکیاں برائیوں کومٹادیتی ہیں، اسلئے قضا نمازوں سے بس توبہ کر لینا کافی ہے"۔

۴)انہی کی یہ تفسیر بھی غور سے پڑھئے اور سر دھنئے:

"ان اللّٰہ وملئکتہ یصلون علی النبی (الآیۃ) کا ترجمہ دراصل یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اپنے نبی پر قرآن اُتارا ہے، اے ایمان والو! تم اس قرآن پر عمل کرو"۔

دیکھئے ظالم نے اس بدترین من گھڑت توجیہ کے وقت، عقل، علم، لغت سب کچھ بالائے طاق رکھ کر کس طرح تحریفِ قرآن کا ارتکاب کیا ہے۔

۵)ایک غیر مقلد خطیب صاحب خطبہ جمعہ میں ارشادفرمارہے ہیں:

"ائمہ اربعہ کو برحق کہنے والوں کواپنے منہ کی طہارت لینی چاہیئے"۔

۶)حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ جماعتِ صحابہؓ میں بڑے عالم وفقیہ سمجھے جاتے

ہیں، تاریخِ اسلام اور تاریخ صحابہؓ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے، لیکن ایک غیر مقلد کے سامنے ان کی روایات پیش کی گئیں تو جواب ملتا ہے:

"ان کو چھوڑو، ان کا حافظہ کمزور تھا، وہ بہت سی باتوں کو بھول جایا کرتے تھے"

۷) ایک صاحب کا قول ہے: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو افضل الانبیاء کہنا جائز نہیں"۔ جب کہ **تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ**[1] **وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ**[2] خود قرآن میں موجود ہے۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں جو طبقے کے لوگوں سے راقم کی سنی ہوئی ہیں یا دیگر علماء نے ان کے خطیبوں سے سن کر نقل کی ہیں، اب تو فونوں پر جو طرح طرح کے میسیجز بھیجے جا رہے ہیں، جو آپس میں تبصرے ہو رہے ہیں ان کی بڑی تفصیل ہے، یہ موقع تفصیل کا نہیں ہے ان زبانی تجربات کے علاوہ ان کے کتب ورسائل کے چند اقتباسات بھی ملاحظہ فرما لیجئے:

۸) حضرت عائشہؓ کا کیا مقام ہے وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے وہ ام المؤمنین ہیں اور ان کی پاکبازی کی شہادت قرآن کریم میں موجود ہے، لیکن ایک غیر مقلد عالم جناب عبدالحق بنارسی کی دیدہ دلیری ملاحظہ کیجئے:

"انھوں نے (یعنی حضرت عائشہؓ نے) حضرت علیؓ سے جنگ کر کے ارتداد کیا اور اگر بلا توبہ ان کی موت ہوئی تو یہ کفر پر موت ہے"۔[3]

۹) حضرت عمر فاروقؓ صحابی رسولؐ اور خلیفہ دوم ہیں، احادیثِ شریفہ میں ان کی اطاعت کا حکم موجود ہے، نبی نے ان پر اعتماد کیا ہے اور ان کے قلب وزبان پر حق کے جاری ہونے کے بشارت دی ہے، لیکن غیر مقلدین کو ان پر اعتماد نہیں ہے، نبی ان کے طریقہ کو سنت کہتے ہیں اور غیر مقلدین ان کے طریقہ کو بدعتِ عمری

[1] سورۃ البقرۃ:۱۵۳ [2] سورہ بنی اسرائیل:۵۵ [3] کشف الحجاب:۳۱ بحوالہ مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی از مولانا بنارسی

کہتے ہیں، یہ قول ملاحظہ کیجئے:

"بہت صاف صاف اور موٹے موٹے مسائل ایسے ہیں کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے ان میں غلطی کی، ان مسائل کے دلائل سے وہ بے خبر تھے"۔[۱]

۱۰) ان لوگوں کا تراویح کو "بدعتِ عمری" کہنا اور حضرت عثمانِ غنیؓ کی جاری کردہ اذان کو "بدعتِ عثمانی" قرار دینا سب کو معلوم ہے، جب کہ ہر شخص جانتا ہے کہ بدعت بدترین گناہ اور دین میں زیادتی کی مذموم کوشش ہے، سوچنا چاہئے کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ اور خلیفہ ثالث ذوالنورین حضرت عثمانِ غنیؓ جیسے اکابر صحابہ کیا بدعت کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟[۲]

۱۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ "السابقون الاولون" میں سے ہیں، دامادِ رسول ہیں، علومِ اسلامی اور نبی امین کے امین ہیں، کتبِ حدیث ان کے فضائل سے بھری پڑی ہیں، مگر نام نہاد اہل حدیث کا عقیدہ ہے:

"سیدنا علی کے خودساختہ حکمرانہ عبوری دور کو خلافتِ راشدہ میں شمار کرنا صریحاً بددیانتی ہے"۔[۳]

۱۲) جنتی نوجوانوں کے سردار، ریحانۃ الرسول، جگر گوشۂ بتول، حضراتِ حسنین کرامؓ جیسی قابلِ احترام ہستیوں کی تنقیص وتوہین سے بھی ان کا اعمال نامہ خالی نہیں ہے:

"حضراتِ حسنین کو زمرہ صحابہؓ میں شمار کرنا صریحاً سبائیت کی ترجمانی یا اندھا دھند تقلید کی خرابی ہے"۔[۴]

۱۳) زاہد الامت، صحابی رسول، حضرت ابوذر غفاریؓ جن کی بڑے بڑے صحابہ کرامؓ عزت کرتے تھے، غیر مقلدین ان کے احترام کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔ نبی

۱؎ شاید ان حضرات کا عقیدہ شیعوں کی طرح یہی ہوگا کہ بعض صحابہ نبی کے بعد صراطِ مستقیم سے بہک گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک صحابہ کرام کا قول وفعل حجت نہیں ہے۔ ۲؎ التاج المکلل ص:۲۹۲ ۳؎ خلافتِ راشدہ از حکیم فیض عالم ص:۶۵ ۴؎ سیدنا حسن ابن علی از حکیم فیض عالم ص:۳۲

صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور شرفِ صحابیت، الٰہی قبولیت، سب کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں کمیونزم سے متاثر قرار دیا جارہا ہے کہ وہ

"ابن سبا کے کمیونسٹ نظریات سے متاثر ہوکر ہر کھاتے پیتے مسلمان کے پیچھے لٹ لے کر بھاگ اُٹھتے تھے"۔[۱]

۱۴) صحابہ کرام بھی بشر تھے، انبیاء کی طرح معصوم عن الخطا نہ تھے، ان سے بلاشبہ غلطیاں ہوئیں لیکن ان کا سچی توبہ کرنا اور اس توبہ کا مقبول ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے، ان کے لئے خلافِ ادب زبان وقلم کا استعمال بالاتفاق حرام و ناجائز ہے۔لیکن ایک غیر مقلد عالم کے دل کی بھڑاس دل پر پتھر رکھ کر پڑھئے کہ وہ صحابی رسولؐ ماعز اسلمیؓ کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:

"یہ (شخص) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کسی غزوہ کیلئے نکلتے تو مردوں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر جنس زدہ بدمعاش کی طرح عورتوں کا تعاقب کرتا تھا"۔[۲]

اسی طرح حضرت غامدیہؓ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"وہ آزاد قسم کی بد پیشہ عورت تھی"۔[۳]

۱۵) ائمہ جرح وتعدیل نے "**الصحابة کلهم عدول**" کہہ کر تمام صحابہ کو قابلِ اعتماد اور عادل ٹھہرایا ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ صحابہ تمام کے تمام دیانتدار، پاکباز اور صادق القول تھے، لیکن غیر مقلدین اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

"صحابی کا قول قابل حجت نہیں"۔[۴]

قصہ مختصر یہ کہ پوری جماعت صحابہ ہی غیر معتبر ہے، پھر جب اس محروم ادب جماعت کے سفاک ہاتھوں سے حضرات خلفاءِ راشدین، اہلِ بیت اطہار، ازواجِ

[۱] خلافتِ راشدہ ص:۴۳ [۲] تدبر قرآن :۳۵/۳۷۰ [۳] ایضاً:۵/۲/۷ [۴] التاج المکلل:۲۹۲ [۴] صدیقہ کائنات:۱۰۶

مطہرات، اور عامۂ صحابہ کرامؓ کا وقار واعتبار نہ بچ سکا تو محدثین وفقہاء کس قطار وشمار میں آسکتے ہیں، خود ہی سمجھا جا سکتا ہے! پھر بھی نمونۃً چند مثالیں اس کی بھی پیش کی جاتی ہیں۔

۱۶) حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" میں واقعہ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر تہمت والے مشہور واقعہ کو روایت فرمایا ہے۔ اس کی وجہ سے ان پر ایک غیر مقلد صاحب شدید برہم ہیں۔ اسی برہمی کی حالت میں امام بخاریؒ کے اعتماد واستناد کی دھجیاں یوں بکھیرتے ہیں:

"دراصل امام بخاری میرے نزدیک اس روایت کے معاملہ میں مرفوع القلم ہیں"۔[1]

یعنی نادان پاگل ہیں، اس لئے کہ علمی اصطلاح میں "مرفوع القلم" نابالغ بچے یا مخبوط الحواس آدمی کے لئے مستعمل ہے۔

۱۷) امام ترمذیؒ عظیم محدث ہیں "سنن ترمذی" ان کی علمی یادگار ہے اور صحاح ستہ میں شامل ہے، دنیا آج تک ان کا نام احترام سے لیتے آئی اور ان کی سنن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے، ان کی سنن کے بارے میں بھی "غیر مقلدین" کی رائے معلوم کر لیجئے:

"معلوم ہوتا ہے کہ امام مسلم کے بعد کسی سبائی ٹکسال میں انھیں (ان حدیثوں کو) گھڑا گیا ہے"۔[2]

مجھے نہیں معلوم ہوسکا کہ ہر مسئلہ میں صریح وصحیح حدیث کا مطالبہ کرنے والے غیر مقلدین نے کس کشف وکرامت کے ذریعہ یہ انکشاف کیا ہے؟

۱۸) ابن شہاب زہریؒ زبردست محدث اور پایہ کے عالم ہیں، سب سے پہلے کہا جاتا ہے کہ "تدوین حدیث" کا انھیں کو شرف حاصل ہے، ان کے حق میں ایک

[1] صدیقہ کائنات: ۱۰۶ [2] ایضاً: ۱۰۸

غیر مقلد صاحب نے درج ذیل انکشاف کیا ہے:

"منافقین وکذابین کے دانستہ نہ سہی نادانستہ ہی سہی مستقل ایجنٹ تھے، اکثر گمراہ کن، خبیث ومکذوبہ روایتیں ان کی طرف منسوب ہیں"۔[۱]

۱۹) اہل سنت والجماعت سے تو ان لوگوں کو یہ بغض وعداوت ہے جو آپ نے پڑھ لیا، اس کے بالمقابل روافض اور قادیانیوں سے قلبی تعلق و ہمدردی، مودت و محبت کس قدر ان میں پائی جاتی ہے، اسے بھی ملاحظہ کیجئے اور حضراتِ صحابہ کرامؓ کے بارے میں ان لوگوں کا رافضیانہ عقیدہ ذرا کلیجہ تھام کر پڑھئے:

"کچھ صحابہ فاسق تھے، جیسا کہ ولید اور اس کے مثل کہا جائیگا معاویہ، عمرو، مغیرہ اور سمرہ کے حق میں" **لا یجوز لهم الترضی**[۲]

یعنی ان لوگوں کیلئے رضی اللہ عنہ کہنا جائز نہیں، عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بلا استثنیٰ تمام صحابہ کو **رضی اللّٰه عنهم ورضوا عنه** فرمائیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو سبق سکھا رہے ہیں کہ **لا یجوز لهم الترضی**

اسی طرح حضرت معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ کے بارے میں کہتے ہیں:

"دونوں باغی اور سرکش اور شریر تھے"۔[۳]

۲۰) قادیانی باتفاقِ امت کافر ہیں، بچہ بچہ الحمدللہ اس سے واقف ہے، لیکن حضراتِ صحابہ کرامؓ کو فاسق، باغی اور سرکش وشریر قرار دینے والے غیر مقلدین کا "قادیانی مرتدین" سے حسن ظن اور اعتماد کا کیا حال ہے؟ ان کے بڑے عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری سے سنئے:

"میرا مذہب وعمل یہ ہے کہ ہر کلمہ گو کے پیچھے اقتداء جائز سمجھتا ہوں، وہ شیعہ ہو یا مرزائی"۔[۴]

نماز کی طرح وہ قادیانی عورت سے نکاح کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔

---

[۱] صدیقہ کائنات: ۸۰ [۲] نزل الابرار ص: ۹۴ [۳] رسائل اہل حدیث: ۹۳ [۴] اخبارِ اہل حدیث: ۲۱/اپریل ۱۹۵۱ء

”میرے ناقص علم میں مرزائن سے نکاح جائز ہے“۔[1]

دیکھئے اور دیدۂ عبرت سے دیکھئے ! مسلمانوں کے سواد اعظم ”اہل سنت والجماعت“ سے کٹے تو کہاں جاکے پہونچے:

(۲۱) کم علمی جہالت وبے علمی کے باوجود تقلید کو حرام قرار دے کر ”عمل بالحدیث“ کے دعوے نے ان بے چاروں کو ضلالت وگمراہی کے جس دلدل میں پھنسا دیا ہے اور جس طرح کے شرمناک وخطرناک فتاویٰ ان کے زبان وقلم سے صادر ہونے لگے ہیں، انھیں دیکھ کر ایک مخلص غیر مقلد عالم مولانا داؤد غزنویؒ کا بھی کلیجہ پھٹنے لگا اور وہ اپنی جماعت کی اس خطرناک صورتحال پر اس طرح ماتم کناں ہیں:

”جماعتِ اہل حدیث کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی بد دعا لے کر بیٹھ گئی، ہر شخص ابوحنیفہ ابوحنیفہ کہہ رہا ہے، کوئی بہت ہی عزت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہ کہہ دیتا ہے، پھر ان کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے، یا زیادہ سے زیادہ گیارہ، اگر کوئی بڑا احسان کرے تو سترہ حدیثوں کا عالم گردانتا ہے، جو لوگ اتنے جلیل القدر عالم کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان میں اتحاد ویکجہتی کیوں کر پیدا ہوسکتی ہے؟ **یا غربة العلم انمااشکو بثی وحزنی الی اللّٰہ**“[2]

(۲۲) اس جماعت کی فکری آزادی اور مذہبی بے راہ روی نے اسے کہاں تک پہنچایا ہے؟ اس کی چند مثالیں آپ نے پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمالیں، اسکے بعد ہر ایک صاحبِ سمجھ آدمی اس نتیجہ پر بآسانی پہنچ جائے گا کہ ترکِ تقلید دراصل گمراہی کا ایک دروازہ ہے، اس میں داخل ہونے والا ضلالت کی کسی بھی حد تک پہونچ سکتا ہے اور یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے، تجربہ کار اور آزمودہ غیر مقلد علماء کی بھی یہی رائے ہے، ایک غیر مقلد عالم مولانا عبدالواحد خانپوری کا ارشاد ملاحظہ ہو:

---

[1] اخبارِ اہل حدیث ۲؍نومبر ۱۹۳۴ء [2] مولانا داؤد غزنوی: ۱۳۶

"اس زمانہ کے جھوٹے اہل حدیث، مبتدعین، مخالفین سلف صالحین، جو حقیقت ما جاء بہ الرسول سے جاہل ہیں وہ صفت میں وارث وخلیفہ ہوئے ہیں شیعہ ورافضی کے یعنی شیعہ جس طرح پہلے مسلمانوں میں باب اور دہلیز کفر ونفاق تھے"[1] (اسی طرح جھوٹے اہل حدیث بھی کفر ونفاق کا دروازہ ہیں) پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ قادیانی، مرزائی چکڑالوی جیسے ملاحدہ وزنادقہ سب اسی دروازہ سے برآمد ہوئے ہیں اور اپنے ایک مشہور زمانہ عالم کو تو "خاتم الملحدین" کے نام سے موسوم کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے "غیر مقلدیت" کے نتائج کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آنکھوں دیکھا حال ہے جو ناقابلِ تردید حقیقت بن چکا ہے، چنانچہ نمونہ از خروارے:

مرزا غلام احمد قادیانی	پہلے غیر مقلد	پھر قادیانی
اس کا خلیفہ حکیم نورالدین	پہلے غیر مقلد	پھر قادیانی
سرسید احمد خان	پہلے غیر مقلد	پھر منکرِ حدیث
اسلم جیراجپوری	پہلے غیر مقلد	پھر منکرِ حدیث
غلام احمد پرویز	پہلے غیر مقلد	پھر منکر حدیث
عنایت اللہ مشرقی	پہلے غیر مقلد	پھر ملحد وبے دین
ڈاکٹر احمد دین	پہلے غیر مقلد	پھر ملحد وبے دین
عبداللہ چکڑالوی	پہلے غیر مقلد	پھر منکر حدیث
نیاز فتح پوری	پہلے غیر مقلد	پھر دہریہ
مسعود احمد	پہلے غیر مقلد	پھر امام مفترض الطاعۃ

ایک تازہ ترین مثال بھی آخر میں ملاحظہ کیجئے جو مجھ سے یہیں[2] کے ایک عالم دین نے بتلائی کہ ان کے علاقہ میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان دین کی طرف راغب

[1] التوحید والسنۃ: ۶۲، ۶۳ [2] تمل ناڈو

ہوئے اور دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے ماشاءاللہ خاصے متبع سنت ہو گئے، وضع قطع اسلامی، نمازوں کی پابندی، حلال وحرام کی تحقیق اور تمام احکام کی پابندی کرنے لگے، اس بے چارے پر کسی غیر مقلد کی نظر پڑ گئی انھوں نے اسے سمجھایا کہ ’’تقلید شرک ہے اور تم اتنی ساری محنت جو مقلد بن کر کر رہے ہو بیکار ہے اور ہم (نام نہاد) اہل حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی اتباع نہیں کرتے‘‘۔ مختصر یہ کہ کسی طرح انھیں غیر مقلد بنایا، اب وہ ہر معاملہ میں ’’حدیثِ صحیح‘‘ کی تلاش کرنے لگے اور ان کو جب ان کی تحقیق میں کوئی صحیح حدیث نہ ملتی تو دھیرے دھیرے ایک ایک سنتِ نبی ترک کرنا شروع کیا، حدیثوں میں ایسے اُلجھے کہ اپنی بے مائیگی علم اور اصولِ دین سے ناواقفیت کی بناء انھیں حدیثیں ہی غلط ومن گھڑت معلوم ہونے لگیں[1] نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دن کے بعد منکر حدیث ہو گئے اب دیکھئے کہ اس خود مختاری اور من مانی کا بدترین اور خوفناک انجام کیا ہوا کہ اس شخص نے خود ان عالم سے کہا: (**العیاذ باللّٰہ ثم العیاذ باللّٰہ**) ’’کسی مسلک اور جماعت کا قصور نہیں ہے دراصل اُمت کو تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نے طرح طرح کی باتیں کہہ کر کنفیوز (Confuse) کیا ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں‘‘۔

میں تو اس کی نقل کرنے کے لئے بھی بار بار سوچتا رہا اور ڈرتا رہا کہ کہیں اس کی نحوست میں شریک نہ کر دیا جاؤں۔ مگر ’’نقل کفر کفر نہ باشد‘‘ کے مدنظر اُمت کو ترک تقلید کے خطرناک نتائج کی عملی شکل بتلانے اور انھیں خبردار کرنے کے لئے ضروری سمجھ کر نقل کر دیا اور مجھے اس شخص کے ان الفاظ اور اس کے گمراہ کن فیصلہ پر ذرا تعجب نہیں کہ اس کی مثل اور اس سے بڑھ کر بھی میں نے حیدرآباد کے تارکینِ تقلید جاہل نوجوانوں کی زبانوں سے سن لیا ہے، اللہ ہی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

[1] امام مسلمؒ نے مقدمہ میں بڑی پتہ کی بات فرمائی ہے کہ ’’عوام الناس کے لئے جو اصول سے ناواقف ہیں زیادہ احادیث کا معلوم ہو جانا مضر ہے‘‘ اپنے کو محدثین کے طریق پر قرار دینے والے غیر مقلدین کم از کم اس عظیم المرتبت محدث کی اس نصیحت کو مان لیتے مگر......

نہ معلوم ان کے بڑے کس خواب وخیال میں ہیں کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دانستہ نہ سہی نادانستہ ہی سہی کسی "اسلام دشمن سازش" کا شکار ہو گئے ہوں؟[1]

اس لئے کہ انھیں اب بھی اپنے برحق ہونے پر اصرار ہے اور ان حالات کو دیکھ کر بھی سنبھلنے اور قوم کو سنبھالنے کیلئے تیار نہیں، بلکہ بقصد وارادہ من گھڑت، خود ساختہ اور خانہ زاد الزامات وضع کر کے ہندوستان کے علماءِ احناف ـــــ جو دراصل ہندوستانی مسلمانوں کے دین وایمان کے حق میں زمین پر اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہیں ـــــ کو علماءِ عرب کے سامنے مشتبہ وبدنام کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ اس سراسر جھوٹ وبہتان پر نہ اللہ سے شرم کر رہے ہیں، نہ حساب کے دن سے ڈر رہے ہیں، جس کی واضح مثال اور بین ثبوت ان کی تازہ عربی تصانیف "الدیوبندیۃ" اور "الجماعۃ التبلیغیۃ" ہیں جس میں انھوں نے دین ودیانت، عدل وانصاف اور سچائی کا خون کیا ہے، جسکی نظیر اختلافاتِ امت کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ

یہ ترکِ تقلید کی وہ دینی مضرتیں ہیں جن کے مدنظر علماء متقدمین نے عوام مسلمین کو تقلید ہی نہیں "تقلید شخصی" کا پابند کر کے ان مضرتوں اور دیگر خطرات سے محفوظ کر لیا تھا، آپ غور کریں کہ کیسے کیسے علماء ومحدثین، عباقرہ علم وعمل، اور جبال دین ودیانت نے اس تقلید کا اہتمام کیا ہے آخر کس طرح ان سب کو گمراہ ومشرک قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دم سے اسلام زندہ رہا اور ہے:

خدا یاد آئے جنھیں دیکھ کے وہ نور کے پتلے
نبوت کے وارث ہیں یہ یہی ہیں ظل رحمانی

پس مسلمانوں کو چاہئے کہ قرآن وحدیث پر عمل کے لئے ان علماءِ ربانیین

[1] ان کے بقول جب ابن شہاب زہریؒ جیسا محدث سازشوں کا شکار ہے تو یہ بے چارے کس حساب میں آئیں گے؟

پر اعتماد کریں اور ''سبیل المؤمنین'' کی اتباع کے اپنے مسلم ومتوارث طریق کو ان گمراہانِ فکر وخیال اور مفلسانِ علم وتقویٰ کے سطحی الزامات واعتراضات سے متاثر ہوکر ترک نہ کر بیٹھیں، ورنہ جو حشر انکا ہوا ہے وہ ہمارا بھی ہوسکتا ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه آمین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔

عقیدۂ ختم نبوت۔مفسرین قرآن کی نظر میں!

امام الانبیاء والمرسلین، خاتم النبیین ،سیدنا ومولانا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور کامل شریعت کے حامل وداعی ہیں، آپ کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی اب تک آیا ہے اور نہ آئندہ آئے گا، یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک کا متفق علیہ اجماعی عقیدہ ہے جس سے مسلمانوں کی کسی جماعت کو اختلاف نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر چہ قیامت سے قریب تشریف لائیں گے لیکن ان کی تشریف آوری اس عقیدہ کے منافی نہیں، اس لئے کہ وہ اپنی نبوت یا کسی جدید شریعت کے ساتھ نہیں آئیں گے، صرف نبوتِ محمدی کے تابع اور ان کے دین کے داعی ہونیکی حیثیت سے آئیں گے، جو شخص آپ کے خاتم النبیین ہونے کے اس متفق علیہ عقیدہ اور اس کے معنی —— ایسے آخری نبی جن کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں —— میں شبہ رکھتا ہو، یا اس کے معانی میں تاویل وتحریف کرتا ہو تو وہ بلا شبہ روئے زمین کا بدترین کافر، مرتد اور خارجِ اسلام ہے اور اہلِ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں اس وقت بطور نمونہ چند مفسرینِ قرآن کے اقوال اس سلسلہ میں نقل کر رہا ہوں۔

☆مشہور محدث، مورخ اور مفسر قرآن حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ قرآن کریم کی آیت:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ [۱]	محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، البتہ وہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔

کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں: بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک عظیم تر رحمت یہ ہے کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (بندوں کی ہدایت کے لئے) مبعوث فرمایا، جنہیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس سلسلۂ نبوت کا ان پر اختتام فرما کر دینِ حنیف کی تکمیل فرمادی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں یہ بات صاف طور پر واضح کردی ہے کہ وہ سب سے آخری نبی ہیں، تاکہ انسانیت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر آپؐ کے بعد کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کذاب، افاک، دجال اور ضال ومضل ہے، چاہے وہ کتنے ہی خارقِ عادت حرکات دکھائے اور کرتب ظاہر کرے وہ سب فاسد احوال اور شعبدہ بازی ہیں، جیسے یمن میں "اسود عنسی" نے اور یمامہ میں "مسیلمہ کذاب" نے طرح طرح کے دعوے اور شعبدے لوگوں کے سامنے رکھے تھے، (یہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ) "مسیلمہ کذاب" سے لے کر "مسیح دجال" تک اس قسم کے سب لوگ جھوٹے اور نا قابلِ اعتبار ہیں، نیز اس امت پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان جھوٹے مدعیانِ نبوت لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایسے احوال بھی لگا دیئے جن کے ذریعہ علماء امت بلکہ عامۂ مسلمین تک کو ان کے کذاب ومفتری ہونے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے احوال واعمال امام ابنِ کثیرؒ کے اس دعوے کی واضح مثال ہیں۔ فللّٰہ الحمد اولاً وآخراً.........

---

[۱] الاحزاب: ۴۰،

☆ امام طبری کی تحقیق یہ ہے کہ خاتم "ت" کے زیر کے ساتھ اگر پڑھا جائے تو اس کے معنیٰ ہوں گے" آپ نے سلسلۂ نبوت کو ختم فرمادیا" اور اگر "ت" کے زبر کیساتھ پڑھا جائے تو اسکا مطلب ہے" آپ آخری نبی ہیں اور ظاہر ہے کہ بہرصورت معنیٰ واحد ہیں[1]

یعنی تلبیس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لفظ یعنی" خاتم" کو جس طرح بھی پڑھو معنیٰ یہی ہوں گے کہ حضور ﷺ ایسے آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں۔

☆ ابوعبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی" الجامع لاحکام القرآن" میں "المسئلۃ الثالثۃ" کے تحت رقم طراز ہیں:

" آپ کا اس طرح آخری نبی ہونا کہ آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہیں، اس مسئلہ پر امت کے سلف وخلف کا متواتر اجماع ہے، ابوطیب اور امام غزالیؒ نے اس سلسلہ میں اجماعِ امت کے برخلاف جو احتمالات ذکر کئے ہیں وہ ضعیف ہیں، بلکہ میرے نزدیک اس قسم کی باتیں مسلمانوں کے "ختمِ نبوت" کے بنیادی اجماعی عقیدہ کو مضمحل کرنے کا سبب ہونے کی وجہ سے الحاد میں داخل ہیں، اس قسم کے احتمالات سے جو "عقیدہ ختم نبوت" پر اثر انداز ہوں ہوشیار وخبردار رہنا اور اپنے کو دور رکھنا چاہئے۔"

☆ مولانا عبدالحق حقانیؒ فرماتے ہیں:" خاتم" کو ابن عامر اور عاصم کوفی نے بفتح التاء پڑھا ہے اسکے معنیٰ مہر کے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ سب نبیوں کی مہر ہیں، جب کسی چیز کو بند کر کے مہر لگاتے ہیں تو پھر اس میں کوئی دوسری چیز داخل نہیں ہوسکتی، اسی طرح آپ پر سلسلہ نبوت ختم کر کے اس پر مہر کر دی گئی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، دوسرے قراء نے" خاتم" کو بکسر التاء اسم فاعل کا صیغہ قرار دیا ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں بھی تصریح کی گئی ہے

---

[1] مختصر تفسیر طبری: ۵:۴۷۵،

آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ قصر نبوت میں جو ایک اینٹ کی جگہ باقی تھی سو وہ ایک آخری اینٹ آپؐ ہیں، اس پر تمام امت کا اتفاق و اجماع ہے۔[1]

☆ مولانا ادریس کاندھلویؒ نے اس مسئلہ پر نہایت بسط و تفصیل سے عقلی و نقلی روشنی ڈالنے کے بعد خلاصۃً فرمایا:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ حضور پرنور خاتم النبیین آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں، آیات واحادیث میں ظلی و بروزی کی کوئی قید نہیں بلکہ مطلق نبوت کی نفی ہے کہ آپ کے بعد کسی کو کسی قسم کی کوئی نبوت نہیں ملے گی نہ تشریعی نہ غیر تشریعی، نہ ظلی نہ بروزی، "لا نبی بعدی" میں مرزائیوں کی یہ تاویل کہ "میرے بعد کوئی مستقل نبی نہیں" یہ تاویل بالکل مہمل ہے، یہ تاویل تو ایسی ہے جیسے کوئی مدعی الوہیت "لا الہ الا اللہ" کے یہ معنی لے کہ "اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مستقل معبود نہیں، لیکن جو معبود اللہ تعالیٰ کا ظل یا بروز ہو یا اسکا عین ہو تو ایسا عقیدہ عقیدۂ توحید کے منافی نہیں"۔ (ظاہر ہے کہ کوئی عقل منداس تاویل کو درست نہیں کہہ سکتا، پس جس طرح لا الہ الا اللہ کی مفروضہ تاویل کفر ہے اسی طرح لا نبی بعدی میں مرزائیوں کی تاویل بھی کفر ہے).....

بہر حال تمام اسلامی فرقے اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی بھی نبی نہیں۔[2]

☆ دکتور وہبہ زحیلی "التفسیر الوجیز" میں لکھتے ہیں:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بہتر علم ہے کہ کس نبی کے ذریعہ سلسلۂ نبوت کا اختتام کیا جائے (چنانچہ آپؐ پر اس نے اس مسئلہ کو ختم فرمادیا۔) پس آپ کے بعد کوئی نبی نہیں"۔[3]

[1] تفسیر حقانی:۱۶/۴، [2] معارف القرآن ادریسی:۵۷۲/۵ [3] التفسیر الوجیز:ص:۴۲۴

☆ فقیہ اعظم مفسر قرآن مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

"صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جو تمام کمالات نبوت ورسالت میں آپ کی اعلیٰ فضیلت وخصوصیت کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی ہوتی ہے اور انتہاء پر پہونچ کر اس چیز کی تکمیل ہوتی ہے، جو آخری نتیجہ اور تکمیلی مرحلہ ہے وہی اصل مقصود ہوتا ہے، آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا اور آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک ہر دور کے مسلمانوں کا اجماع واتفاق رہا ہے"۔[۱]

☆ سعودی عرب کے شائع کردہ ترجمہ قرآن کے حاشیہ نگار جناب صلاح الدین یوسف صاحب لکھتے ہیں:

"خاتم مہر کو کہتے ہیں اور مہر آخری عمل کو کہا جاتا ہے، یعنی آپؐ پر نبوت ورسالت کا خاتمہ کردیا گیا، آپ کے بعد جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ نبی نہیں کذاب ودجال ہے، احادیث میں بھی اس مضمون کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس پر پوری امت کا اجماع واتفاق ہے، قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا جو احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔ تو ان کا نزول عقیدہ ختم نبوت کے منافی نہیں ہے، اسلئے کہ وہ اس وقت نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر آئیں گے"۔[۲]

---

[۱] معارف القرآن: ۷/۱۶۳، [۲]: ترجمہ قرآن شائع شدہ از سعودی عرب: ۱۱۸۳

مہدوی مذہب کا ایک تعارفی خاکہ

فرقہائے باطلہ میں "مہدویہ" ایسا فرقہ ہے جن کی تعداد گو کم ہے[۱] اور ان کا وجود بھی ہر جگہ نہیں پایا جاتا اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے عقائد وافکار کا عمومی پرچار اور اس کی طرف دعوت کا کام بھی کم کرتے رہے مگر ادھر چند دنوں سے ان کی تحریری ودعوتی مشن سرگرم عمل ہے، اہلِ اسلام خصوصاً ان کے نوجوانوں کا اپنے مذہب کے بنیادی اور ضروری علم سے محروم رہنے نے ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ان کا شکار آسان کر دیا ہے۔ شیعہ اور مہدویہ ایسے طبقے ہیں جن کے ہاں "تقیہ" کا استعمال بہت ہے اسی وجہ سے ان کے کفر کو سمجھنے میں لوگوں نے بہت دھوکہ کھایا ہے۔ چنانچہ بہت سے عوام ہی نہیں بلکہ بعض اہلِ علم بھی مہدویوں کو اسلام ہی کا ایک فرقہ سمجھتے ہیں۔ اور "مہدویت" اور اسلام میں اسی قدر فرق جانتے ہیں کہ انہوں نے "الامام المہدی" کے ظہور کا دعویٰ کیا ہے اور ہم ان کے ظہور کے منتظر ہیں۔ حالانکہ بات یہی نہیں ہے۔ اگر ان کے افکار وعقائد میں ہم بغور نظر کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ فرقہ اپنے غیر اسلامی افکار کے اعتبار سے قادیانیوں کے شانہ بشانہ ہے بلکہ کسی کسی جگہ ان سے بھی دو قدم آگے ہی ہے۔ جیسا کہ آپ اگلی سطروں میں خط کشیدہ جملوں سے جان سکیں گے۔

دکن کے آصف جاہی ونظام شاہی ادوار میں انہوں نے اہلِ اسلام پر متعدد مرتبہ قاتلانہ حملے بھی کئے ہیں جس کے بعد انہیں ممالک محروسۂ آصفیہ سے شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ دکن سے نکل کر میسور کے قریب چن پٹن میں آباد

۱؎ حاشیہ آخر مضمون میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہو گئے تھے لیکن پھر نظام کے معتمد علیہ راجہ چندو لال کی حمایت اور سفارش سے دوبارہ دکن لوٹ آئے، اور بیرون بلدہ اپنے محلے آباد کئے البتہ اس کے بعد بجائے شمشیر و کمان کے قلم اور زبان سے اہلِ اسلام کی مخالفت جاری رکھی۔

چند دنوں قبل اخبار میں سید محمد جونپوری کی تاریخ عرس کے موقعہ پر کسی صاحب کا مضمون بہ عنوان ''ظہورِ مہدی'' چھپا تھا۔ جس میں غالباً انہوں نے غلطی سے بعض اپنے عقائد کو بھی ظاہر کر دیا تھا۔ جو عموماً ظاہر نہیں کرتیہیں۔ اس پر برافروختہ ہو کر اہلِ اسلام نے دارالعلوم سبیل السلام، جامعہ نظامیہ اور دارالعلوم حیدرآباد جیسی اسلامی جامعات سے استفتاء کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ اس قسم کے عقائد غیر اسلامی ہیں اور ان کا معتقد غیر مسلم ہوگا۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ انکے کچھ عقائد ناظرین ''اشرف العلوم'' کی نظر سے بھی گذر جائیں چنانچہ جامعہ کے کتب خانہ میں موجود مہدوی لٹریچر کے ذریعہ مختصراً ۴۳؍ عقیدے پیش کئے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ ہمارا مقصد نہ مہدویوں سے مناظرہ ہے اور نہ ان کے رد سے ہمیں کچھ دلچسپی ہے۔ البتہ اہلِ اسلام کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے کہ مہدوی اپنے آپ کو ''مومن'' اور ہمیں ''مسلمان'' کہتے ہیں تو اس اصطلاح کا پس منظر کیا ہے؟ اور وہ اہلِ ایمان و تصدیق سے خارج کر کے ہمیں کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ہمارے سامنے اس وقت ان کے عقائد پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ''جامع الاصول'' ہے جو بندگی میاں شاہ قاسم مجتہد کا مصنفہ ہے۔ اور جمعیۃ مہدویہ حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ جس کو مصنف نے اصلاً عربی میں تصنیف کیا ہے اسلئے ترجمہ کیساتھ طبع کیا گیا ہے۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ ان کے بیان کردہ یہ عقائد (سید محمد جونپوری کے) تابعین کاملین اور صحابہ مہدی کی سند سے میراں سید محمود ثانی تک مرفوع ہیں۔ انہوں نے اولاً صراحت کی ہے کہ دین کے بعض احکام فروعی

ہوتے ہیں، انکو احکام فرعیہ وعملیہ کہا جاتا ہے اور بعض احکام اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں وہ اصول وعقائد کہلاتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے عقائد کو جاننے کے لئے اسی رسالہ پر اعتماد کیا جائے۔ جسے انہوں نے صراحتاً اور سند متصل کے ساتھ عقیدہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ اس لئے ہم ان کے عقائد کو بلا تبصرہ (ان عقائدِ باطلہ کی اثرات سے پناہ مانگتے ہوئے) نمبر وار ذکر کرتے ہیں۔ کہ نقلِ کفر کفر نباشد۔

(۱) توحید باری تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم (سب سے اہم ہے مگر) اس کی کنجی، نبوت اور ولایت کی بزرگی کا اعتقاد ہے اس کے بغیر توحید کے دروازے کی کشائش اور دیدارِ الٰہی سے حجاب کا اٹھنا ممکن نہیں ہے۔

(۲) مہدیٔ موعود، اللہ کے بندے اللہ کے دین کی بینہ اس کے رسول کی شریعت کے تابع تام اور امور حقیقتِ دین کے بوجھ کے حامل ہیں۔

(۳) نبی صلعم نے فرمایا ولایت نبوت سے افضل ہے (اور وہ) وہی ولایت ہے جو مہدی کے وجود میں موجود ہے۔

(۴) جس نے ولایتِ ذات مہدی کی فضیلت (از نبوت) کا انکار کیا وہ شرفِ نبوت کا منکر ہوا۔

(۵) جس نے انکار کیا مہدی کا تو بس تحقیق کہ وہ منکر ہوا ان تمام امور کا جو محمدؐ پر نازل ہوئے۔

(٦) ولایت کی مثال آفتاب کی ہے اور نبوت کی مثال چاند ہے۔ جس نے ان دونوں مثالوں کا انکار کیا تو وہ منافق ومبتدع ہے۔

(۷) مہدی صاحبِ زمان اور صاحبِ فرمان ہیں فرشتہ کے واسطہ کے بغیر، جس نے مہدی کے لئے فرمانِ خدا ہونے کا انکار کیا اس نے کفر کیا۔

(۸) مہدی کلام ذاتِ الٰہی بیان کرنے پر من جانب اللہ مامور ہیں، جس نے بالجزم اس کا انکار کیا وہ کافر ہے۔

(۹) محمدؐ نبی خاتم النبوت ہیں اور محمد مہدی خاتم ولایتِ محمدی ہیں ۔اور وہ دونوں دراصل مساوی ہیں ۔جس نے وثوق کے ساتھ دونوں کے مساوی ہونے کا انکار کیا تو وہ منکر ہے نور محمدؐ کا۔

(۱۰) مہدی نے اس دنیا میں بلا حجاب خدا کو دیکھا ہے۔اس بات کا یقین کے ساتھ انکار کرنے والا کافر ہے۔

(۱۱) مہدی اللہ کا امیر ہے، وہ اسطرح مامور ہے جس طرح محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم منجانب اللہ (احکام کی تشریع کے لئے) مامور ہیں (فرق یہ ہے کہ) محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی بواسطۂ جبرئیل مامور ہوئے اور مہدی بلا واسطۂ جبرئیل کلام اللہ کے بیان پر مامور ہوئے۔

(۱۲) جس نے مہدی کے احکام کا انکار کیا وہ خدا اور رسولِ خدا کے حکم کا منکر ہے۔

(۱۳) جو خوارق عادات مہدی سے ظاہر ہوئے وہ معجزہ سے موسوم ہیں، انہیں کرامت کہنا صحیح نہیں ہے۔

(۱۴) بندگی میاں کی جنگ جنگِ بدر کے برابر ہے ۔جس نے ان کی جنگ نبیؐ کی جنگِ بدر کے برابر نہ تسلیم کی تو وہ منافق ہے اور اگر اس کا انکارِ مطلق کردے تو پھر کافر ہو جائیگا۔

(۱۵) مہدی خاتم الاولیاء ہیں ان کے بعد کوئی ولی نہ ہوگا۔

(۱۶) مصدقینِ مہدی کو انبیاء واولیاء کے مراتب حاصل ہیں ۔جیسا کہ میاں شیخ بھیک کو عیسیٰ کا مرتبہ حاصل ہے۔

(۱۷) ائمہ اربعہ کے مذاہب میں مہدی مقید نہیں ہیں، ان ائمہ کے اقوال

میں جو قول مہدی کے فرمان کے مطابق ہو وہ صحیح ہے ورنہ انکے اجتہاد میں خطا ہے۔

(۱۸) مہدی کا دین مطلق ہے کیونکہ مہدی صاحبِ تحقیق وصاحبِ فرمان ہیں۔

(۱۹) انکارِ مہدی کفر ہے (میراں سید محمود ثانی نے فرمایا کہ اگر بایزید بھی منکر مہدی ہوئے تو انکارِ مہدی کی وجہ سے کافر ہو جائے۔

(۲۰) جس نے احکامِ مہدی میں کمی بیشی کی تو اس کو اہلِ ایمان میں شمار کرنے کا ہم کو اختیار نہیں رہتا۔

(۲۱) جنت بی بی الہدتی (زوجہ سید محمد) کی میراث ہے، مہدی نے فرمایا بی بی مغفورہ ہے، ان کی اولاد سات کرسی تک مغفور ہے جو انکے دیوار کے سایہ سے گذر جائے وہ بھی مغفور ہے اور جو ان کے گھڑے کا پانی پیا وہ بھی مغفور ہے، اور جس نے انکی مدد کی اور جس نے ان کو بازار سے کوئی چیز خرید کر دی وہ سب مغفور ہیں۔

(۲۲) مہدی نے بارہ آدمیوں کو جنت کی بشارت دی ہے، ان سب کا جنتی ہونا حق ہے۔

(۲۳) کامل زمانہ وہی ہوسکتا ہے جو مہدی وصحابہ ٔمہدی کا متبع کامل ہو اس کے سوائے کوئی اور کامل زمانہ نہیں ہوسکتا۔

(۲۴) شبِ قدر اور اس کی تحقیق مہدی سے ہوئی ہے، رمضان کی ستائیسویں کو شب قدر ہونے کا یقین مہدی کے ذریعہ حاصل ہوا، مہدی نے اس میں دو رکعت نماز خدا کے حکم سے ادا فرمائی ہے۔ ان دو رکعتوں میں حالت سجدہ میں دعا کرنا اور اسکی نیت میں متابعت مہدی کا لفظ اختیار کرنا واجب ہے جس نے اس کے ضروری ہونے کا انکار کیا وہ مبتدع بلکہ منافق ہے۔

(۲۵) منافقین کی جزاء یہی ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں رہیں گے، منافقین کے اعمال خصوصاً تین ہیں (۱) منکر مہدی کے کفر کا قائل نہ ہونا (۲) احکامِ مہدی

کو حق نہ جاننا (۳) مخالف امام (غیر مہدوی امام) کے پیچھے بہ خوشی نماز پڑھ لینا۔

(۲۶) مہدی کا منکر بھی کافر ہے، اور ساکت بھی کافر ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے "لاتکتموا الشهادة" فرمایا ہے۔

(۲۷) قرآن کی اصطلاحات کما حقہ مہدی کے علاوہ کوئی نہیں جانا۔

(۲۸) جس نے مہدی کے احکام اور ان کی فضیلتوں کا انکار کیا وہ کافر ہے۔

(۲۹) منکرینِ مہدی کی میت پر نماز جنازہ پڑھنا منع ہے، اور بلاضرورت ان سے ملنا بھی منع ہے۔

یہاں تک میں نے جامع الاصول کے اقتباسات بلکہ اکثر حصہ نقل کیا ہے آگے رسالہ "بعثتِ مہدی" مصنفہ الحاج سید نجم الدین صدر مجلس علماء مہدویہ ہند سے کچھ مزید وضاحتیں نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں اور دادِ تحقیق پیش کریں۔

(۳۰) مہدی کی بعثت بھی قرآن شریف سے اسی طرح ثابت ہے جسطرح کتب سماویہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیائے سابقین کی بشارتوں سے محقق ہوئی ہے (ص:۶)

(۳۱) ہم مہدوی آیات واحادیث کی روشنی میں یقینِ واثق اور اعتقادِ جازم رکھتے ہیں کہ حضرت امامنا سید محمد (جونپوری) مہدیٔ موعود، خلیفۃ اللہ معصوم عن الخطاء، اور خاتم ولایتِ محمدیہ ہیں۔ (ص:۷)

(۳۲) مہدی علیہ السلام کی بعثت کے بارے میں جو احکام وارد ہیں وہ.......
.....قرآن وحدیث میں خدا اور رسول کی طرف سے امت کو دی گئی ہیں۔ (ص:۹)

(۳۳) مذہبِ مہدویہ دوسرے مذاہب کیطرح ہے بحث ومباحثہ کا نتیجہ نہیں بلکہ عین اسلام ہے (ص:۱۰)

(۳۴) مہدویت دینِ اسلام کا خلاصہ اور اس کا عطر عطیر ہے۔ (ص:۱۰)

(۳۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ دین باعتبار تبلیغ نہیں، آپؐ نے صرف احکام شریعت کی تبلیغ فرمائی، احکامِ ولایت کی تبلیغ ......امام معصوم مہدی پر موقوف رکھی۔(ص:۳۷)

(۳۶) مہدی نے فرمایا: احادیث میں بہت اختلاف ہے اور ان کا صحیح ہونا مشکل ہے (اسلئے) جو حدیث قرآن مجید اور بندہ (مہدی) کے حال کے موافق ہو وہی صحیح ہے۔(ص:۵۲)

اب کچھ اس رسالہ کو بھی دیکھ لیجئے جو مہدوی مدارس میں تدریساً رائج ہے اور عقائد و احکام پر مشتمل ہے۔ یعنی "چراغ دینِ مہدی" مرتبہ الحاج سید خدا بخش رشدی ملاحظہ فرمایئے اس چراغ کی روشنی میں مہدویت کی تصویر!

(۳۷) اس ذات ابنیاء صفات (امام مہدی موعود) کا فیض اسقدر ہوا کہ شمار میں نہیں آسکتا (ص:۴)

(۳۸) حقیقتِ دین اسلام یعنی "طلبِ دیدار خدا" مہدویوں پر شریعت ہوگئی ہے۔(ص:۴)

(۳۹) آیۃ کریمہ "**هذه سبيلي ادعوا الى الله**" میں "**من اتبعني**" سے مہدی مراد ہیں۔(ص:۴)

(۴۰) دیگر انبیاء کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ ولایت بھی مخفی رہی اسی لئے اسکے اظہار سے متعلق جو احکامِ طریقت تھے وہ بھی مخفی رہے (ص:۵)

(۴۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ ختمِ نبوت میں پانچ اصول دین بیان فرمائے (جو سبھی جانتے ہیں) حضرت مہدی موعود خلیفۃ اللہ خاتم ولایتِ محمدی مراد اللہ صلی اللہ علیہما وسلم نے دورِ اظہارِ ولایتِ محمدی میں چھ اصول دین بیان فرمائے ....ان میں سے پانچ ارکانِ طریقت ہیں اور چھٹی اصل حضرت مہدی

کے منکر کو کافر جاننا اصلِ اعتقادی ہے۔(ص:۷)

(۴۲) حضرت مہدی نے حکم دیا ہے کہ ہر ایک مرد وزن پر خدا کے دیدار کی طلب فرض ہے جب تک سر کی آنکھ سے یا دل کی آنکھ سے یا خواب میں خدا کو نہ دیکھے (کوئی آدمی) مومن نہ ہوگا۔(ص:۸)

(۴۳) مرشد کی اجازت کے بغیر نمازِ تہجد کسی کے لئے جائز نہیں۔(ص:۴۱)

مہدویوں کے ان عقائدِ باطلہ پر کسی تبصرہ کے بجائے یہ شعر ملاحظہ فرمالیجئے ؂

زخم کو پھول، اور صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

حاشیہ صفحہ ا

یہ خیال اس وقت کا ہے جبکہ مہدوی برادری سے قریبی واقفیت نہیں تھی ، اب معلوم ہوا ہے کہ یہ قوم حیدرآباد کے علاوہ علاقہ ٔرائلسیما، کرناٹک، مہاراشٹرا تمل ناڈو، اور گجرات میں بھی پائی جاتی ہے، بیرونی ممالک میں بالخصوص امریکہ وکناڈا میں بڑی تعداد رہتی ہے۔بعض تعلیم یافتہ حضرات تائب ہوگئے ہیں۔ بہت سے معتدل الفکر بن گئے ہیں، بہت سے پوری سختی کے ساتھ نہ صرف قائم ہیں بلکہ اصلاحی کوششوں کی مزاحمت بھی کرر ہے ہیں،اس عاجز نے اب اس مذہب پر کافی تحقیق کرکے ایک مستقل رسالہ ”مطالعہ مہدویت“ کے نام سے مرتب اور شائع کردیا ہے، جو الحمدللہ مذہب کو پوری طرح جاننے کے لئے بہت کافی ہے، یہ رسالہ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی چھپ چکا ہے۔و ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء

ایک پیغام !

مہدوی بھائیوں کے نام !!

زندگی بہت محدود ومختصر ہے، موت ایک یقینی حقیقت ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ موت کے بعد فنا نہیں ہے، بلکہ مواخذہ وجوابدہی کے ایک خوفناک مرحلے سے گذرنا ہے، پھر ابدی عزت وسرخروئی یا ابدی ذلت وسرنگونی کے انجام کا سامنا بھی یقینی ہے۔

آخرت کے عقیدہ پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی شخص آخرت کی کامیابی سے زیادہ کسی اور چیز کا خواہشمند نہیں ہوتا، ہم بھی اسی کی فکر میں ہیں اور یقیناً آپ کا مطمحِ نظر بھی یہی ہوگا۔

اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ نجات —— خواہ دنیوی ہو یا اُخروی —— نبی ﷺ اور صرف نبی ﷺ کے اتباع میں ہے، "کتابؔ وسنت" کے علاوہ کوئی علم سیدھا راستہ دکھانیوالا نہیں ہے، نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کیلئے یہی دو ہدایت نامے لائے، اسی پر امت کو چلایا، اسی کی دعوت دی اور یہی دو ہدایتیں بعد والوں کو دے کر دنیا سے پردہ فرما گئے۔

یاد رکھیئے ! اب انسانوں کی نجات صرف "کتابؔ وسنت" کے اتباع میں ہے، خواہ وہ انسان عام آدمی ہو، غوث وقطب ہو، یا ولی ومہدی ! حتیٰ کہ نبی سابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نزول فرمائیں گے تو انکی نجات بھی اسی میں ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نبیٔ پاک ﷺ کے بعد اب کسی کو قیامت تک "اطاعت مطلقہ" کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا،

سب کا وظیفہ وفریضہ آپ کا "اتباع محض" ہے، اسکے برخلاف آپ حضرات کے مہدوی مذہب میں اپنے امام کیلئے حضرت محمد ﷺ کے" تابع تام" کے دعوے کے باوجود ——— متبوع ،مطاع مطلق ، مامورمن اللہ ،مبعوث من اللہ، اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلیم حاصل کرنے والا ،فرشتے کے القا کے بغیر نہ بولنے والا ،اسی طرح ان کے کلام کے حجت قطعیہ ہونے ،انہیں نبی کے برابراور بعض وجوہ سے نبی سے برتر مراتب حاصل ہونے ——— کے دعاوی موجود ہیں ،ان کے علاوہ اور بہت سی خلافِ کتاب وسنت باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے انہی چند معتقدات کو سامنے رکھ کر دیکھیں محض یہی آپ کو صراط مستقیم اور جادۂ قویم سے ہٹا دینے کیلئے کافی ہیں۔

"اہل اسلام" میں کوئی بھی عالم عہد صحابہؓ سے آج تک ان باتوں کا قائل نہیں رہا، اگر کسی شخص نے ایسی کوئی بات کہی اور اسپر مصر رہا تو امت کے سواداعظم نے اسے خارجِ ملت کر دیا اور اگر اہل حق میں سے کسی کی زبان یا قلم سے کبھی کبھار ایسی بات نکل گئی تو انکے غالب اقوال واعمال موافق کتاب وسنت ہونیکی وجہ سے ان کی ایسی باتوں کو حالت سُکر و بے خودی پر محمول کر کے قائل کو معذور اور قول کو مردود قرار دیا گیا، بعض دفعہ تو قرار واقعی سزا بھی دی گئی ،لیکن کسی صورت بھی ان خلافِ کتاب وسنت باتوں کو صحیح تسلیم نہیں کیا گیا، مگر تعجب ہے کہ آپ حضرات نے اپنے بزرگوں کی ایسی باتوں کو بلا کدورد تسلیم کر لیا بلکہ اسے مسلمان ہونے کے لئے اپنے مذہب وعقیدہ کا لازمی او رواجب التسلیم رکن قرار دیدیا، جب یہ چیز اسلام کے بنیادی ومتفق علیہ عقائد کے مغائر ٹھیرتی ہے تو اسی چیز نے "مہدویت" کو "مذہب اسلام" سے علاحدہ کر دیا ہے ،اب ظاہر ہیکہ حق وانصاف اور اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولؐ کے ساتھ سچی وفاداری کا راستہ اسکے علاوہ اور کیا ہوسکتا کہ کتب مذہب میں موجود ان خلاف کتاب وسنت اورخلافِ عقائد اہل اسلام باتوں کو اور ان کے قائلین کو سپرد خدا کر کے ——— کہ وہ "علیم

بذات الصدور "ہستی ان کی نیتوں اور مقاصد کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ خود کرلے گی—— قرآن وسنت کی روشنی میں ان باتوں کیغلط ہونے کا اقرار کرکے اور ان سے توبہ کرکے اپنے رب اور اسکے حبیب ﷺ کو راضی کرلیں۔

اسلئے آپ حضرات سے دردمندانہ اپیل ھیکہ مذہبی تعصب سے آزاد ہوکر اُخروی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے آپ کو "کتاب وسنت" اور اسکی وہ متفق علیہ تشریح—— جو عہد صحابہؓ سے آج تک بتواتر ثابت ہے—— کو اختیار کرنے کی جرأت کرلیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ پُرعزم وپُرحوصلہ اقدام دنیا میں کچھ تکلیف دہ ثابت ہومگر آخرت کے ناقابل تحمل تکالیف سے ضرور بچالے گا۔ **ان ذالک من عزم الامور**

فقہ، فقہاء اور ہندوستان[1]

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

اسلام دیگر مذاہب کی طرح کسی نظریہ اور تحریک کا نام نہیں ہے۔ وہ "دینِ قیم" یعنی ایک مکمل دستورِ حیات، اور جامع و مستقل تہذیب ہے، جو عملی زندگی کی طالب ہے۔ قرآن کریم میں " اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا " کے ساتھ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کو جوڑے رکھنے کا اہتمام اسی حقیقت کی واضح دلیل ہے، اسی لئے علماءِ امت نے "ایمانِ کامل" کیلئے ـــــ تعبیر و تعریف کے فرق کے باوجود ـــــ "عمل" کو شرطِ لازم قرار دیا ہے۔ پھر اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دین فطرت ہے یعنی اس کے احکام میں انسانی مزاجوں، مطالبوں اور بشری تقاضوں کی بھرپور رعایت کی گئی ہے، آدمی کے مختلف حالات اور زمانہ کے تغیرات و تطورات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، کیونکہ اسلام ایک ایسا آخری دین اور دائمی و آفاقی قانون ہے جو زمان و مکان کے حدود سے آزاد ہوکر پوری دنیا کے انسانوں کیلئے اور قیامت تک کے زمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

پس! "دینِ قیم" ہونے کی حیثیت سے اس کے بنیادی احکام و ارکان اور تشریعی منہاج و انداز ناقابلِ تنسیخ و تبدیل ہیں، کسی فرد، جماعت یا حکومت کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں، چنانچہ زمانۂ نبوت سے آج تک اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوسکا، اور نہ آئندہ ہوسکتا ہے۔ کبھی اگر کسی نے ان بنیادی احکام میں ذرہ برابر تحریف و تبدیل کی مذموم کوشش کی تو علماءِ اسلام نے اپنا فرض ادا

[1] شریعہ ایڈوائزری بورڈ، شکاگو کی جانب سے جمع کردہ "جامع الفتاویٰ" کی پہلی جلد کیلئے بورڈ کے ذمہ داروں کی خواہش پر لکھا گیا تعارفی نوٹ۔

کرتے ہوئے ان کوششوں کا قلع قمع کیا، اور اس سلسلہ میں غیرت وحمیت، ایثار وقربانی اور مذہبی وفاداری کی وہ مثالیں قائم فرمائیں ہیں کہ تاریخ مذاہب میں اس کی کوئی نظیر ملنی مشکل ہے۔ **فجزاهم الله خيرا و جعلنا امثالهم آمين**

اور " دینِ فطرت " ہونیکی حیثیت سے اسکے ان بنیادی احکام کی عملی صورتیں، اسی طرح ذیلی احکام کی شکلیں، زمان ومکان کے تبدل، حوادث ونوازل کے تعرض اور خود مکلّف کے احوال وماحول میں تغیر کی وجہ سے حسبِ ضرورت بدلتی رہتی ہیں، مثال کے طور پر " نماز " ہے جو اسلامی احکام میں ایک بنیادی اور ترجیحی حکم ہے، ہر عاقل وبالغ مسلمان پر بہرحال فرض ہے، اس حکم کے منسوخ کرنے یا ان میں کمی کرنے، یا ان کی رکعات کی تعداد بدلنے کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، نہ عامی کچھ ردوبدل کرسکتا ہے نہ عالم، لیکن اسی نماز کی کیفیتِ اداء اور صورتِ تعمیل، صحت و مرض، سفر وحضر، امن وخوف وغیرہ جیسے حالات کے تغیر کے ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے، اسی طرح " طہارت " ہے جو نماز کیلئے ایسی شرطِ لازم ہے کہ قصداً خلاف ورزی کرنے والے پر کفر کا اندیشہ کیا گیا ہے، تاہم اس کے حصول کی صورتیں، درپیش احوال واشکال کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہیں، یہی حال دیگر عبادات، معاملات، معاشرت وغیرہ شعبہائے حیات سے متعلق احکام کا ہے کہ اس کا ایک حصہ اگر کسی قسم کی ترمیم وتبدیل کو قطعاً قبول نہیں کرتا تو ایک اور حصہ بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت بدلتا رہتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اسلام کو ہر زمانہ اور ہر علاقہ کیلئے قابلِ قبول اور سہل الحصول بنادیا ہے جو بندوں پر ان کے رحمان ورحیم پروردگار کا انعامِ عظیم ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان " **يريد الله بكم اليسر** " اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشاد " **الدين يسر** " میں اسی انعام کی طرف اشارہ ہے۔

مگر یہ کام ہر کسی شخص کا نہیں ہے کہ وہ جب چاہے جس طرح چاہے عمل کی کوئی صورت اپنے لئے منتخب و متعین کر لے، بلکہ یہ کام حاملینِ علومِ نبوت، ماہرینِ قرآن وسنت یعنی حضرات علماء وفقہاء کرام کا ہے کہ وہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں متعین کردہ رہنمایانہ خطوط کی پابندی، دیانت وتقویٰ کی پاسداری کے ساتھ اس ذمہ داری کو نباہتے رہیں۔ چنانچہ ہر زمانہ میں علماء وفقہاء نے اس فرضِ منصبی کو ادا کیا اور قیامت تک توفیقِ الٰہی سے کرتے رہیں گے۔

اسلامی احکام کی مذکورہ بالا ان دونوں قسموں کی صحیح معرفت، ان کے درمیان فرق وتمیز کی قوت اور اس سلسلہ میں عامۃ المسلمین کی بروقت وبرحق رہنمائی کی صلاحیت "فقہ" کہلاتی ہے، اور ان صفات کے حامل کو "فقیہ" کہتے ہیں۔

فقہ، عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مادہ ف ق ہ ہے، اس کے لغوی معنی کسی بات کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے ہیں، عام طور سے "علم وفہم" پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن اس کی اصطلاحی تعریف مخصوص ہے۔[1] چنانچہ امام راغب اصفہانیؒ نے اس کی تعریف "**التوصّل الی علم غائب بعلم مشاھد**" سے کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ فقہ علم سے خاص ہے جبکہ علم عام ہے۔[2] اور بھی تعریفات ہیں مگر حاصل سب کا تقریباً ایک ہے۔

فقہ کے بنیادی مصادر چار ہیں۔ قرآن کریم، سنتِ نبی کریم، اجماع اور قیاس، یہ متفق علیہ ماٰخذ ہیں، ان کے علاوہ استحسان، استحصاب، استصلاح اور عُرف کو اپنی تفصیلی شرائط کے ساتھ مصادرِ فقہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر یہ مختلف فیہ مصادر ہیں۔ مجمع علیہ مذکورہ بالا چار مصادر ہیں۔[3]

فقہ اور فقہاء کے فضائل بے شمار ہیں جو قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے آثار میں موجود ہیں۔ یہاں ان کا احاطہ ممکن ہے نہ مقصود۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ

---

[1] مفردات الفاظ القرآن الکریم ص:۴۳، [2] کتاب التعریفات ص:۱۹۱، [3] موسوعۃ نضرۃ النعیم ص:۳۱۳۸۔

والتسلیم کا ارشاد گرامی ” من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقھه فی الدین “ [۱] اور حضرت ابن عباسؓ کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ” اللھم فقھه فی الدین “ [۲] اس کام کی اہمیت وفضیلت اور اس کے حاملین کے مرتبہ ومقام کو سمجھنے کیلئے بہت کافی ہے، ملک العلماء کاسانی حنفیؒ فرماتے ہیں ”حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے علم کے بعد کوئی علم ”علم فقہ“ سے بڑھ کر اشرف وافضل نہیں ہے۔ جس کو حلال وحرام اور شرائع واحکام کا علم کہتے ہیں۔ جس کی معرفت عقل ونقل کے اجتماع کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْراً كَثِيْراً یعنی ” جس کو حکمت (تفقہ فی الدین) عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دی گئی“ اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا ” فقیہ واحد شیطان کے حق میں (گمراہ کرنے کے اعتبار سے) ہزار عابدوں سے بڑھ کر ہے“۔ حضرت عمرؓ نماز کا ایک مسئلہ سیکھنے کیلئے شام سے سفر کر کے مدینہ پہنچنے والے ایک مخلص مسلمان کو دیکھ کر رو پڑے اور ان سے فرمایا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ (دینی احکام ومسائل کو اس قدر اہمیت دینے اور اس کی فکر کرنے کی بدولت) تم کو کبھی عذاب نہ دے گا۔“ (بہرحال) علم فقہ کی اہمیت اور اسکی ترغیب کے سلسلہ میں اخبار وآثار اس قدر وارد ہوئی ہیں کہ ان کا احصاء ممکن نہیں ہے۔ [۳]

سعودی عرب کے موجودہ دینی مکتبِ فکر کے بانی ورہنما محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ ——— جن کی بعض تحریرات وتعبیرات کو ایک طبقہ ” فقہ“ کی اہمیت کو گھٹانے کیلئے آج کل خوب خوب استعمال کر رہا ہے ——— بھی کھلے الفاظ اور واضح انداز میں علم فقہ کی اہمیت کے معترف ہیں بلکہ اسے علومِ نبوت کا عطر وخلاصہ تصور کرتے ہیں۔

چنانچہ جامعۃ الامام محمد بن سعود کی جانب سے ۱۲ جلدوں میں شائع کردہ ” مولفات الشیخ الامام محمد بن عبدالوہاب“ کی قسمِ ثالث، جزء فتاویٰ ومسائل کے تحت

---

۱ مسلم حدیث نمبر: ۱۰۳۷، ۲ ایضاً: ۲۴۷۷، ۳ بدائع الصنائع ۱/۶۳

ایک سوال کے جواب میں ان کا یہ ارشاد منقول ہے ”جو لوگ دین (اور علم دین) کی طرف منسوب کیئے جاتے ہیں (ان کے دو طبقے ہیں) ایک وہ جو علم وفقہ کا ماہر ہے اور اس کی جانب زیادہ توجہ دیا ہوا ہے جیسے فقہاء (کرام) کا طبقہ اور دوسرا وہ جو عبادت وریاضت اور طلب آخرت کی طرف زیادہ التفات وتوجہ کیا ہوا ہے جیسے صوفیاء (عظام)! معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دین دے کر مبعوث فرمایا ہے وہ وہی دین ہے جو ان دونوں قسموں (یعنی فقہ وتصوف) کا جامع ہو۔[1]

غیر منقسم ہندوستان میں ”فقہ اسلامی“ اور دیگر علومِ اسلامیہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود یہاں کے مسلمانوں کی تاریخ قدیم ہے۔ اس لئے کہ جس زمانہ میں یہاں مسلمانوں کی آمد کی ابتداء ہوئی اور ان کی تعداد اقل قلیل تھی، تاریخ بتلاتی ہے کہ اس زمانہ میں بھی مسلمان اپنے شرعی قوانین اور احکامِ دین کے معاملہ میں بہت ہی غیور ومتصلب تھے، اس معاملہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے، تمام مسائل میں اپنے امام ومؤذن کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہی ان کی رہنمائی کرتے تھے، حتیٰ کہ بعض راجاؤں نے تو اپنی قلمرو میں مسلمانوں کے فصل خصومات اور حلِ معاملات کیلئے کسی مسلمان ہی کو باقاعدہ عہدہ بردار بنا رکھا تھا۔[2] پھر جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ان کے مسائلِ دینیہ میں اضافہ ہوتا گیا فقہاء ومفتیان کا اسی رفتار سے سلسلہ بنتا اور بڑھتا گیا تا آنکہ مسلم حکمرانوں کا دور آیا اور مسلمانوں کیلئے تعلیم گاہوں، فتویٰ کی مسندوں اور قضاء کے کاموں کا ملک کے طول و عرض میں سلسلہ چل پڑا۔ ہر طرف فقہ اسلامی بالخصوص فقہِ حنفی کے درس وتدریس، تحقیق وتالیف، قضاء وافتاء کا کام جاری تھا۔ دوسرے علوم کے ماہرین سے صرفِ نظر صرف فقہاء ومفتیان کرام اور انکے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو اسکی ایک طویل

---

[1] موقف ائمة الحركة السلفية ص:۱۵، [2] تفصیل کیلئے دیکھئے: مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب ”ہزار سال پہلے“

فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ علامہ عین الدین اندرپتی، قاضی مغیث الدین بنادی، ملا نظام الدین برہانپوری، قاضی نوراللہ شوستری ہندوستان کے قدیم ترین فقہاء وقضاۃ ہیں۔ایک " فتاویٰ عالمگیری" کے مرتبین ہی کو لیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ کے ہندوستان میں بھی کیسے کیسے قابلِ رشک اور لائقِ فخر فقہاء موجود اور علمی کارناموں میں مشغول تھے۔پھر مسند الحدیث فی الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کے بعد کا دور تو اس معاملہ میں عروج وترقی کا روشن ترین دور کہلانے کا مستحق ہے۔اور ماضی قریب میں ہمارے اکابر کی خدمات کا کیا کہنا ؟ کہ ان حضرات نے علومِ دینیہ کی تحقیق وتدقیق میں سلف صالحین اور علماءِ متقدمین کی یاد تازہ کردی۔

مختصر یہ کہ فقہ اسلامی کا موجود آغازِ اسلام ہی میں ہوگیا تھا اور تا ہنوز پورے آب وتاب کے ساتھ یہ علم اقطاعِ عالم میں ہے۔اسی مبارک سلسلہ کی ایک کڑی زیرِ نظر تصنیف بھی ہے۔

فریضہ حج کی طرف توجہ کیجئے!

ان دنوں سفر حج کے لئے درخواست گذاریوں کا سلسلہ چل رہا ہے، بلکہ اس کی مدت بھی قریب الختم ہے۔ ہمارے بہت سے بھائی اور بہنیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے فریضہ حج کی تکمیل کے لائق بنایا ہے اور اس کی سعت وسکت دی ہے، مگر وہ ابھی تک اس عظیم المرتبت فرض کی جانب سے غفلت ولا پرواہی کا شکار ہیں، اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں، بہر حال یہ بہت بڑی غلطی ہے، دینی علم سے دوری کی صورتحال یہ ہیکہ عام طور سے احباب کو حج کی فرضیت کا علم تک نہیں ہے، گذشتہ عشرہ کے دوران راقم سطور نے شاہ آباد، تانڈور اور گلبرگہ میں احباب واصدقاء کی خواہش پر متمول حضرات کے سامنے فرضیت وفضیلتِ حج سے متعلق تفصیلاً گفتگو کی۔ بحمد للہ تعالیٰ بات سمجھ میں آنے پر متعدد حضرات نے اسی سال حج ادا کرنیکی سعی شروع کر دی ہے۔ اور بعضوں نے آئندہ سال کے لئے ارادہ کر لیا ہے، بہت سوں کی غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔ کئی ایک نے اپنے حلقہ احباب واعزہ میں اس سلسلہ میں تشکیل وترغیب کا بھی ارادہ کیا ہے۔

واقعی حج ایسا عظیم فرض ہے کہ اس کی فرضیت کے بعد اس سے پہلو تہی یا ٹال مٹول نا قابلِ معافی جرم ہے، اگر چہ کہ کسی عذر سے اس کی ادائیگی میں تاخیر کی گنجائش دی گئی ہے، لیکن بلا عذر قدرت کے باوجود حج نہ کر کے مرجانے والے کے لئے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے "**من ملک زاداً وراحلة تبلغه الی بیت اللّٰه ولم یحج فلا**

علیه ان یموت یهودیا او نصرانیاً" [1]

جو شخص اتنے سرمایہ پر قادر ہو گیا کہ سفر میں اپنی اور گھر پر اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کو پورا کر سکے پھر بھی اس نے حج نہیں کیا تو اس کے لئے برابر ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ارکانِ اسلام میں سے کسی رکن کا ترک کر دینا خروج عن الملت کے مشابہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تارک الصلوٰۃ کو مشرکین سے تشبیہ دی اور تارکِ حج کو یہودی اور نصرانی سے، کیونکہ مشرکین حج کرتے تھے مگر نماز نہیں پڑھتے تھے اور یہود ونصاریٰ نماز پڑھتے تھے لیکن حج نہیں کرتے تھے۔ [2]

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے فریضہ حج کا انکار کیا وہ کافر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے [3] جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ " [4]

اللہ کے واسطے ان لوگوں کے ذمہ اسکے مکان کا حج کرنا فرض ہے جن کو طاقت ہو وہاں پہونچنے کی۔ پھر جس نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے عالم والوں سے۔

فقیہ اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: اس میں وہ شخص تو داخل ہے ہی جو صراحتہً حج کا منکر ہو اور حج کو فرض نہ سمجھتا ہو —— (وہ بھی داخل ہے) جو شخص عقیدہ کے طور پر حج کو فرض سمجھتا ہو لیکن باوجود استطاعت وقدرت کے حج نہیں کرتا کیونکہ وہ بھی ایک حیثیت سے منکر ہی ہے —— اس لئے فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ آیت کے اس جملہ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو باوجود قدرت واستطاعت کے حج نہیں کرتے کہ وہ اپنے اس عمل سے کافروں کی طرح ہو گئے۔ العیاذ باللہ [5]

---

[1] ترمذی: ۱۰۰۸، [2] حجۃ اللہ البالغہ: ص: ۵۶، [3] تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۰۳، [4] سورۂ آل عمران: ۹۷، [5] معارف القرآن: ۲/۲۲۱

دیکھئے کس قدر نازک معاملہ ہے اور کیسی سخت وعید ہے فریضہ حج سے لاپرواہی برتنے والے کے لئے ۔اس لئے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی مالی حالت اہل علم کے سامنے رکھ کر معلوم کرلے کہ آیا اس پر حج فرض تو نہیں ہوا؟ اگر ہو گیا ہے تو اس کی تکمیل بعجلت کرے، مبادا آدمی کا وقت موعود آجائے اور اسے وصیت کرنے کی بھی فرصت نہ ملے تو بڑی محرومی کی موت مرے گا، اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو جس پر حج فرض ہے ادائیگی میں جلدی کرنے کا حکم دیا ہے۔

من اراد الحج فلیعجل..........جو حج کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ پھر عملدرآمد میں عجلت کرے۔[1] اور بیہقی کی روایت میں اس تائید کے بعد یہ بھی ہیکہ تمہیں نہیں معلوم کہ کب کوئی بیماری یا حاجت ایسی پیش آجائے جو اس فریضہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔[2]

حج جس طرح مردوں پر فرض ہوتا ہے عورتوں پر بھی جب انہیں استطاعت وقدرت حاصل ہوجائے تو فرض ہوتا ہے۔(فرضیت کی تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھ لیں، یا اہلِ علم سے معلوم کرلیں) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "**استأذنت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فی الجهاد فقال جهاد کن الحج**" میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا تمہارا جہاد حج ہے۔[3]

اور جہاں تک اس عملِ عظیم کے فضائل کا تعلق ہے تو اس کے فضائل بہت ہیں نمونۃً چند حدیثیں درجِ ذیل کی جاتی ہیں۔

سئل عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ای الاعمال افضل قال ایمان باللّٰہ ورسوله قیل ثم ماذا ؟ قال الجهاد فی سبیل اللّٰہ قیل ثم ماذا ؟ قال حج مبرور[4]

[1] مسند امام اعظم:۳۸۱، [2] البیہقی ، [3] مشکوٰۃ:۱/۲۲۱ [4] مشکوٰۃ:۱/۲۲۱،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا پھر اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا حج مقبول!

"من حج للّٰہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولد تہ امہ"

جس نے اللہ کی خاطر حج کیا پھر اس حج میں نہ گالی گلوج کیا نہ فسق وفجور وہ حج کے بعد اس طرح لوٹتا ہے جیسے اپنی ولادت کے دن تھا۔[۱]

"الحج المبرور لیس لہ جزاء الا الجنۃ"

حج مبرور کی جزاء جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔[۲]

امام نوویؒ نے حج مبرور کے بارے میں فرمایا کہ صحیح قول کے مطابق مبرور اس حج کو کہتے ہیں جس میں گناہوں سے بچا گیا ہو اسی طرح مقبول کو بھی مبرور کہتے ہیں اور اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حاجی کی دینی حالت اس سے بہتر ہو جائے جتنی حج سے پہلے تھی۔

"الحاج والعمار وفد اللّٰہ ان دعوہ اجابھم وان استغفروہ غفرلھم"

حجاج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اگر وہ دعا کریں تو قبول ہے اور اگر مغفرت چاہیں تو بخش دیتا ہے۔[۳]

"تابعوا بین الحج والعمرۃ فانھما ینفیان الفقر والذنوب کما ینفی الکیر خبث الحدید"

پے بہ پے حج اور عمرہ کیا کرو کیونکہ وہ دونوں افلاس اور گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کی گندگی کو ختم کر دیتی ہے۔[۴]

---

۱ مسلم:۱/۲۳۲، ۲ ایضاً، ۳ ابن ماجہ:۲۱۳، ۴ ترمذی:۱/۱۰۰،

اس لئے وہ حضرات جن پر حج فرض ہو چکا ہے۔اس مسئلہ کی نزاکت واہمیت کی طرف توجہ دیں اور محض حیلے بہانے یا خودساختہ اعذار کی وجہ سے تاخیر کر کے کسی خطرہ میں نہ پڑنے سے بچیں، زندگی بار بار نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق جس قدر ادا کر سکتے ہوں اس میں کوتاہی، آخرت کا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

واللّٰہ الموفق والمستعان

اسلام اور سوال

بلا ضرورت خاص کے آدمی کا کسی سے سوال کرنا، مدد مانگنا، اور احتیاج کو مخلوق کے سامنے پیش کرنا سخت ترین گناہ اور بدترین عادت ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حاجات کو مخفی رکھنے اور لوگوں سے ظاہر نہ کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے اہل ثروت کو اپنی خیرات وحسنات میں ان کا خاص خیال رکھنے کی سفارش وتاکید فرمائی ہے۔ غور کیجئے تو یہ کتنی بڑی اور کیسی عظیم خوشخبری ہے ان لوگوں کے حق میں جن کی غیرتِ ایمانی حوائج کو مخلوق کے سامنے پیش کرنے سے انہیں روکیتی ہے، خواہ انہیں تکلیف ہی اٹھانا پڑے۔

اسی طرح حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ ”جو شخص اپنی حاجات اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے سامنے پیش نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اس کی بخشش فرمادیں۔[1]

نیز آپ نے سوال کو ذلت قرار دیا اور ہے بھی بڑی بدترین ذلت۔ اسی وجہ سے حضراتِ صحابہ کرامؓ اس سے بہت بچتے تھے، اور اسقدر احتیاط فرماتے تھے کہ سواری پر گذرتے وقت اگر ہاتھ سے کبھی لگام چھوٹ کر گر جاتی تو وہ بھی کسی سے مانگتے نہ تھے، بلکہ سواری بٹھا کر خود اٹھا لیتے تھے۔[2] تاکہ سوال کی ذلت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیئے گئے عہد کی مخالفت نہ ہوجائے۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس زمانہ میں اور برائیوں کی طرح ”سوال“ بھی عام ہوگیا ہے، اور اچھے اچھے شرفاء بھی رنگ ڈھنگ بدل کر اس ذلت میں ہنسی خوشی مبتلا ہو رہے ہیں۔

[1] معارف الحدیث: ۲/۳۰، [2] مسلم: ۲/۳۵

آگے درج ہونے والی احادیثِ شریفہ سے اس کی شناعت وخباثت کا اندازہ لگائیے، پھر معاشرہ پر ایک نظر ڈالئے۔

مانگ کر کھانے والے کا چہرہ قیامت کے دن بدل دیا جائیگا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ (آدمی کو مانگ کر کھانے کی عادت ہو جاتی ہے) اور مانگ مانگ کر کھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا تو اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک لوتھڑا (بطور ذلت کے) لٹک رہا ہوگا۔[۱]

بلاضرورت لینے والا ہاتھ بُرا ہاتھ ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اوپر کا (یعنی دینے والا) ہاتھ نیچے (یعنی لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور اوپر کا ہاتھ خرچ کرنیوالا ہاتھ ہے نیچے کا ہاتھ مانگنے والا ہاتھ ہے۔[۲]

سوال چہرہ نوچنے کی کنگھی ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے (بلاضرورت) سوال کرنا (گویا) ایک کنگھی ہے جس سے آدمی اپنے چہرہ (کی عزت) نوچتا ہے۔ ہاں کوئی اگر حاکم سے اپنا حق طلب کرے یا سخت مجبور ہو جائے تو الگ بات ہے۔[۳]

مخلوق سے مانگنا تنگی کو بڑھالینا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو فاقہ (اور تنگی معاش) اور وہ لوگوں کے سامنے (حاجت پیش کر کے) ان سے سوال کرے تو اس کا فقر دور نہیں کیا جاتا (یعنی بڑھتا ہی رہتا ہے)۔[۴]

---

[۱] بخاری:۳/۲۶۸، [۲] بخاری:۳/۲۳۵، [۳] ترمذی:۱/۲۰۸، [۴] ابوداؤد کذا فی المشکوٰہ:۱/۵۱۳

سوال کی ذلت سے مزدوری کی تکلیف بہتر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی لکڑیوں کے گٹھرا پنے سر پر ڈھو کے لائے یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی سے کچھ مانگے خواہ وہ دے یا نہ دے۔[۱]

بلاضرورت سوال کرنا آگ کا انگارہ لینا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے مال بڑھانے کیلئے کسی سے کچھ مانگا اور اُس کو اس سے کچھ مل بھی گیا تو درحقیقت اس نے اپنے لئے آگ کے انگارے مانگے ہیں، اب اس کو اختیار ہے کہ زیادہ مانگے یا کم۔[۲]

کیونکہ وہ انجام کے اعتبار سے دوزخ کی آگ ہی ہے۔قرآن مجید میں یتیم کا مال کھانے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا: اِنَّمَا یَأْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَاراً وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔[۳]

سوال کرنے والے کی اللہ تعالیٰ محتاجی بڑھا دیتے ہیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے سوال کا دروازہ کھولا (یعنی مخلوق سے مانگنا شروع کیا) تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے محتاجی وفقر کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔[۴]

سوال چہرہ کا بدنما داغ ہے جو جہنم کی آگ ہی سے زائل ہوگا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آئے اور انھوں نے آپ سے کچھ مانگا، آپ نے ان سے فرمایا: تمہارے گھر میں کوئی چیز ہے؟، انہوں نے دو چیزوں کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چیزیں منگوا کر دو درھم میں فروخت کروادیں، اور ارشاد فرمایا: ایک درھم کا غلہ گھر میں دیدو، اور ایک درھم سے کلہاڑی خرید کر لاؤ، انہوں نے ایسا ہی کیا، پھر آپ نے اپنے دست مبارک سے اس

---

۱ بخاری: ۳/۲۳۵، ۲ مسلم: ۱/۲۴۸، ۳ سورۂ نساء: ۱۰، ۴ سنن ترمذی: ۲/۲۷۰

کلہاڑی میں دستہ لگا دیا، اور فرمایا: جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور اسے شہر میں بیچو پندرہ دن سے پہلے میرے پاس نہ آنا، چنانچہ انہوں نے اس طرح ان پندرہ دنوں میں اچھا خاصا نفع کمایا، اور خوشی خوشی آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ ان سے ارشاد فرمایا: دیکھو! (عزتِ نفس وخودداری کی) یہ حالت اچھی ہے اس حالت سے کہ تم سوال کرنے کی وجہ سے قیامت کے دن اس طرح اٹھائے جاؤ کہ تمہارے چہرہ پر ایک سیاہ داغ ہوتا جسے جہنم کی آگ کے علاوہ کوئی شئی دھونہیں سکتی ہے[1]

مذکورہ بالا احادیث میں بلاضرورت خاص کے سوال کرنے کی جو مذمت آئی ہے اس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی حاجات ظاہر کر کے ان سے سوال کرنا کس قدر بری بات اور کتنا سنگین جُرم ہے۔

سوال حلال ہے بقدرضرورت

آگے درج ہونے والی روایت سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ خاص ضرورت اور ناگزیر صورتیں کیا ہیں جن میں سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس کا معلوم ہونا اسلئے بھی ضروری ہے کہ ہم لوگ اپنے معاملات میں دیانت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ اس قسم کے امور طئے کرنے میں بھی نفس کے حیلوں اور خیانت سے کام لیتے ہیں

حضرت قبیصہؓ فرماتے ہیں (اپنا ابتدائی قصہ بیان کرنے کے بعد) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے قبیصہ! سنو بلاشبہ لوگوں سے سوال کرنا تین آدمیوں کے علاوہ کسی کے لئے حلال نہیں ہے۔

(۱) ایک وہ شخص جس پر کچھ "ضمان" عائد ہوگیا ہو (جس کو وہ بغیر کسی کی مدد کے ادا نہ کرسکتا ہو تو یہ شخص کسی سے سوال کرسکتا ہے) ضرورت پوری ہونے تک۔

(۲) دوسرے وہ شخص جس پر کوئی ناگہانی آفت آئی ہو اور اس نے اس کا سب مال برباد کردیا ہو (تو یہ شخص سوال کرسکتا ہے) ضرورت پوری ہونے تک۔

---

[1] ابوداؤد: ۲/۱۲۰،

(۳) تیسرے وہ شخص جوفاقہ زدہ ہو اوربستی کے (کم ازکم) تین آدمی شہادت دیں کہ یہ فاقہ زادہہے تواس کے لئے سوال حلال ہے بقدرضرورت۔

(ان تین صورتوں کا ذکر کرنے کے بعد آپؐ نے فرمایا) اے قبیصہ !ان کے علاوہ جتنے لوگ سوال کر کے کھاتے ہیں، وہ حرام کھا رہے ہیں اور گندگی کھا رہے ہیں۔[1]

دیکھ لیا آپ نے ! کن حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سوال کی اجازت دی ہے؟ اور بقیہ تمام حالات میں آدمی اس لائق ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی یا تجارت کے ذریعہ کھائے ،اسے چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے مال ودولت دیا ہے تو تجارت کرے، زراعت کرے اور اگر نہیں اپنی قوت بازوکو استعمال کر کے محنت ومزدوری کرے،کوئی کام اور کوئی پیشہ ضرورت کا اسلام میں معیوب ہے نہ عار وشرم کی بات ، کیا دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی مزدوری کرے،موچی بنے ، یا اور کوئی پیشہ اختیار کرے، خدارا ہوش میں آیئے۔

سوال کے بغیر جائز طریقوں سے کمائی کے بےشمار فضائل آئے ہیں (جنہیں ہم علاحدہ جمع کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ) اسلئے مسلمانوں کو چاہئے کہ سوال کے مختلف سلسلوں کو بند کرے، کیونکہ جس طرح گداگر اور بھیک منگے ان وعیدوں میں داخل ہیں ۔اسی طرح وہ متمول، پڑھے لکھے اور ٹھاٹ باٹ والے بھی داخل ہیں جو چھوٹی بھیک تو نہیں مانگتے بڑی بڑی بھیکیں مانگتے ہیں ،آج شادہ بیاہ کے موقع پر کتنے ہی شرفاء ہیں جو اپنے تاج شرافت کو پلٹ کر لڑکی والوں کے سامنے" کاسۂ گدائی" بنا کر پیش کرتے ہیں ۔انہیں سوچنا چاہیے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے ایسے محتاج وضرورت مند کو (جس کے گھر میں سوائے دو درھم کے بقدر ایک پیالہ ایک چمڑے کے ٹکڑے کے اور کچھ نہ تھا) سوال کی اجازت نہیں دیتے ،اور اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھانے کی ترغیب بلکہ سخت ہدایت دیتے ہیں ، کیا وہ نبی

[1] ابوداؤد:۲/۱۲۱،

آج کے خوشحال اور صاحب مال لوگوں کو اسکی اجازت دے سکتے ہیں؟ لیکن کیا کیا جائے کہ مال کی محبت نے ہمیں بے غیرت بنا کے رکھ دیا ہے، آج نت نئے طریقوں سے مانگا جا رہا ہے، لیا جا رہا ہے دیا جا رہا ہے، نہ لینے والا اپنے کو گنہ گار اور ان وعیدوں کا مستحق سمجھتا ہے نہ دینے والا۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس خبیث، گھناؤنی اور معاشرہ کیلئے باعثِ ننگ حرکت میں اہل دین، علماء وحفاظ تک مبتلا ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماویں۔ آمین

آخر میں ایک حدیث جو صابروں اور راضی برضاء رہنے والوں کے لئے عظیم خوشخبری ہے نقل کرتا ہوں۔

میں جنت کی ضمانت لیتا ہوں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کون ہے؟ جو مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ کبھی کسی مخلوق سے سوال نہیں کرے گا، تاکہ میں اس کے لئے اس کی ضمانت لوں کہ اسے ضرور جنت میں داخل کروں گا۔[1]

امید ہے کہ امت کے جیالے اور بہادر نوجوان اور دوسرے سبھی افراد اس خوشخبری کو سننے کے بعد اپنے آپ کو سوال کی اس ذلت سے بچانے اور اپنی تمام حاجات کو رحمٰن ورحیم ہی کے سامنے رکھنے کا عہد کر لیں گے۔ اللہ پاک ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

نوٹ: یہ تمام وعیدیں اپنی ذات اور ضروریات کے لئے سوال کرنے پر ہیں، جہاں تک قوم اور دین کی ضرورتوں کے لئے قوم سے مانگنے کا تعلق ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ سنت بھی ہے۔

وفقنا اللّٰہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

---

[1] مسلم شریف

قادیانی سیلاب سے ہوشیار رہئے!

مسلمانو! ہوشیار!

قادیانی سیلاب نے اب شہروں کا رخ کرلیا ہے مسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی جاری کردہ ارتداد کی تحریک اب تک صرف دیہاتوں اور سلم علاقوں میں مال وزر کے ذریعہ اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی تھی، اس فتنہ کی وہیں پر سرکوبی آسان بھی تھی، لیکن اللہ معاف فرمائے ہماری ملی، رفاہی اور مذہبی جماعتوں نے ——جس میں ان سطروں کا راقم بھی برابر کا شریک ہے—— کما حقہ کوشش اس فتنے کا قلع قمع کرنے میں نہیں کی، یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں اس سلسلہ میں گرانقدر مساعی اور ملی اتحاد کے نمونے سامنے آئے تھے، اور ان دنوں قادیانی گروہ بھی سوچ بچار میں پڑ گیا تھا، کیونکہ اسے ماضی میں ہمارے اسلاف سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ جن کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ جس کام کے لئے قدم اٹھاتے تھے غور وفکر اور پوری تحقیق وتدبیر کے ساتھ اٹھاتے تھے، اس میں عجلت نہیں فرماتے تھے، مگر جب پوری بصیرت اور مکمل شرح صدر ہو جاتا تو پھر ان کا سفر منزل مقصود پر پہنچ کر ہی تکمیل پاتا تھا، اثناءِ راہ وہ ——خواہ کتنے ہی صبر آزما اور کٹھن مراحل پیش آویں—— کبھی رکنے والے نہ تھے، جس فرقہ ضالہ کا انہوں نے تعاقب کیا ٹھیک رخ اور مستقیم نہج پر کیا، اور ایسا تابڑتوڑ حملہ کیا کہ پھر اس فتنہ کا سر اس طرح کچل کے رہ گیا کہ یا تو فنا ہو گیا یا پھر اس قدر کمزور پڑ گیا کہ مدتوں سر اٹھانے کی ہمت وطاقت نہ رہی۔

القصہ قادیانی پہلے تو ہمارے اقدامات سے بہت گھبرائے۔ پریشان ہوئے دو چار جگہوں پر منھ کی کھائے اور خوار ہو کر وہاں سے بھاگ بھی گئے۔ لیکن اپنے قدم

جمانے اور چپکے چپکے اپنے کام اور کاز کو مستحکم کرنے سے غافل نہ رہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ وہ دیہاتوں میں تو خوب پھل پھول ہی رہے ہیں اور اپنے استحکام کے لئے وہ تمام ہتھکنڈے اور طریقے اختیار کررہے ہیں جو دشمنان اسلام ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں ،اور ادھران کی سرکوبی کے لئے اہل اسلام کی جانب سے بھی کسی نہ کسی درجہ میں کوشش ہوہی رہی ہے۔"کسی نہ کسی درجہ میں" کا لفظ اس لئے استعمال کررہا ہوں کہ جس قوت سے ارتداد کا یہ سیلاب امڈتا آرہا ہے اس کے لئے اسی قدر مضبوط طاقتور بندھ نہیں لگایا جاسکا ہے۔

ممکن ہے کہ کسی کا خیال یہ بھی ہو کہ ان کی جانب توجہ نہ دی جائے اور بے توجہی ہی ان کا علاج ہے، اور اگر زیادہ توجہ دی جائے تو یہ ان کی تشہیر وتوسیع کے مقصد میں مفید ہوگی ،لہذا انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جانا چاہیے، جیسا کہ بعض حضرات کا خیال سامنے آیا مگر یہ خیال اولاً تو کسی کے نزدیک بھی علی الاطلاق قابل قبول نہیں، کیونکہ دشمن کو کمزور سمجھنا سب سے بڑی حماقت ہے۔ثانیاً جب کہ ان کی سرگرمیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں اور اب دیہی علاقوں کے بعد ہمت وجرائت میں اضافہ ہوا تو شہروں کی جانب بھی اپنی سرگرمیوں کا رخ کرنا شروع کردیا ہے،ان حالات میں اس خیال کی تردید ہوجاتی ہے کہ بے توجہی ان کا علاج ہے

ابھی ۳۰ رجون ۱۹۹۶ء کو انہوں نے حیدرآباد میں باقاعدہ اشتہار کے ذریعہ اپنی ریاستی کانفرنس کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ،عینی شاہدین کے بقول خاصی بڑی تعداد ـــــ گومختلف دیہاتوں سے لاکر ہی سہی ـــــ انہوں نے اس کانفرنس میں جمع کرلی ،علاوہ ازیں متعدد ثقہ حضرات سے معلوم ہوا کہ شہر کے اہم مرکزی مقامات میں تک ان کی تعداد روز افزوں ہے،ایک مسجد بھی "جہاں نما" محلّہ میں معلوم ہوا کہ اب ان کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔[۱] یہ بات مسلمانوں کے یادرکھنے کی

[۱] اب تو باقاعدہ کئی عبادتگاہیں ان کی حیدرآباد میں بن چکی ہیں،اور شہر کے کئی محلے ان کی سرگرمیوں سے متاثر ہیں،اور خبر یہ ہے کہ متعدد بااثر شخصیتوں کو بھی انہوں نے اپنے دام فریب میں گرفتار کرلیا ہے۔

ہے کہ ”فرقہ قادیانیہ“ جو اپنے آپ کو ”مسلم جماعت احمدیہ“ کے نام سے یاد اور موسوم کرتا ہے، مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک بالاتفاق و بلاشبہ کافر ہے۔ اور ان میں شامل ہونے والے، ساتھ دینے والے اور ان سے خوش وراضی رہنے والے، سب مرتد اور خارج اسلام ہیں۔ ان کے ساتھ کھانا پینا، دوستی رکھنا، ان کی مدد کرنا، مکان دوکان وغیرہ کرایہ پر دینا، ان کی دعوت قبول کرنا، یا اپنی دعوت میں بلانا، یہ سب باتیں ناجائز اور ممنوع ہیں، تفصیل کے لئے حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ کے رسائل کا ملاحظہ از حد نافع ہے اور بہت ضروری ہے۔

بہرحال شہر کے مسلمانوں کو چوکنا ہو جانیکی ضرورت ہے، قبل اس کے کہ شہر میں اس دجالی فتنہ کی جڑیں مضبوط ہوں،[1] اسکے اکھاڑ پھینکنے کی سعی لازم ہے، اس سلسلہ میں جذبات و جوش کے مقابلہ میں تدبر، غور وفکر اور علم کی روشنی سے کام لینا وقت اور حالات کا تقاضہ ہے اور اہل علم کی سرپرستی تو بہرحال ناگزیر ہے۔

خدا کرے کہ سارے مسلمان خصوصاً باوسائل و ذی اثر جماعتیں اپنے محبوب خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی شان خاتمیت کو داغدار ہونے سے بچانے کے لئے دشمنان ختم نبوت کے خلاف اپنی استعداد کا آخری حصہ خون کا آخری قطرہ اور جاہ و مال کا آخری حبہ تک لگادینے کے عزائم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں۔ تاکہ ہم سر محشر محافظین ناموس رسالت کے ساتھ محشور ہوسکیں۔

اللھم اننا ضعیفون فقوفی رضاک ضعفنا. وانصرنا علی عدوک وعدونا ولا تجعلنا فتنة للقوم الظالمین

---

[1] یہ مضمون اب سے بارہ سال قبل لکھا گیا تھا، اس اثناء میں حیدرآباد شہر میں ان کی جمعیت اس قدر مضبوط ہوگئی کہ متعدد عبادت گاہیں ”مسجد“ کے نام سے تعمیر ہوگئیں، عیدگاہ بھی بنالی، لاوڈ اسپیکر کے ذریعہ ناحق ”اذانیں“ بھی دی جارہی ہے، اور ابھی جون ۲۰۰۸ء میں ”سوسالہ جشنِ خلافت“ بڑے پیمانہ پر منعقد کرنے اور اپنی جمعیت وقوت کا مظاہرہ کرنے کی بھرپور تیاریاں بھی کر لی تھیں، اللہ کا کرم ہوا کہ مسلمانوں کے تمامِ مکاتبِ فکر یک زبان و یک قوت ہوکر اس اقدام سے باز رہنے پر مجبور کردیا، **الحمد لله ولا فخر**، لیکن اس موقعہ سے اندازہ بھی ہوا کہ اس منحوس گروہ کی جرأت اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں کس قدر بڑھ گئی ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے آمین۔

قادیانی فتنہ ؟

اضلاع ورنگل، کھمم اورنلگنڈہ کے بعداب کریم نگر کے دیہات مرزائیوں کے ذریعہ ارتداد کا نشانہ بن چکے ہیں، اورنہ معلوم کہاں کہاں تک یہ جال پھیل چکا ہے، پچھلے دنوں بعض ذرائع سے جب یہ پتہ چلا کہ اس ضلع کے دیہات ان بد بختوں کی ارتدادی سازشوں کے شکار ہوچکے ہیں، اورایک دیہات کے مقامی لوگوں میں اس قدر پختگی آگئی ہے کہ اب وہ کسی کی بات سننے تک تیارنہیں ہیں، بلکہ جومسلمان پہونچے تھے انہیں اپنا حاسد و بدخواہ قرار دیکر پولس کی مدد سے گاؤں میں داخلہ سے روک دیا گیا، کریم نگر کے نوجوان علماء کرام نے فیصلہ کیا کہ اطراف واکناف کے تمام دیہاتوں کا جائزہ لے لینا چاہیے تاکہ جہاں یہ خطرناک صورتحال پیش نہیں آئی وہاں حفاظتی انتظامات کئے جاسکیں، چنانچہ جامعہ ہذا کے استاذ مولانا خواجہ کلیم الدین اسعدی، مفتی اعتمادالحق قاسمی مدرس مدرسہ احسن العلوم کریم نگر، مولانا مفتی محمد یونس قاسمی مدرس مدرسہ اشرف العلوم کریم نگر نے مع رفقاء کے مسلسل ایک ہفتہ تک دورہ کیا، چنداوردیہات ایسے ملے جن میں قادیانی مبلغ امام اورمعلم کے لبادہ میں بھولے بھالے دیہاتی مسلمانوں کی دولتِ ایمانی لوٹنے میں مصروف ہیں، کہیں للہ امامت کا جھانسہ دیکر، کہیں مسجد تعمیر کرانے کا دھوکہ دیکر، کہیں غریب مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا بہانہ بنا کر، کہیں کسی طرح کہیں کسی طرح قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، چونکہ گاؤں والوں سے وہ کوئی مطالبہ نہیں کرتے بلکہ

الٹا انہیں اور ان کے بچوں کو اپنی طرف سے کاپی پنسل وغیرہ دیتے ہیں، اسلئے خستہ حال اور بے علم وشعور دیہاتی انہیں اپنا ہمدرد وبہی خواہ سمجھنے لگے ہیں۔

اور یہی ترتیب ان لوگوں نے اپنے تمام زیر تبلیغ علاقوں میں چلا رکھی ہے کہ پہلے وہاں پہونچ کر کچھ لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں، ہفتہ پندرہ دن میں ان کی دعوت طعام بھی کرتے ہیں، نیز مسجد نہ ہوتو بنواتے ہیں، یا بوسیدہ یا چھپر پوش ہوتو پختہ بنواتے ہیں، قرض تقسیم کرتے ہیں، نوجوانوں اور بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا نظم، بیماروں کے علاج کا بندوبست کرتے ہیں، غرض چونکہ دیہات کے عوام معاشی خستہ حالی اور عائلی مسائل کے شکار ہوتے ہیں، اسلئے ان سماجی کاموں کے ذریعہ ان کے قلوب جیتنا اور ان پر اپنا جال ڈالنا آسان ہوجاتا ہے، دوسرے معنوں میں عیسائی مشنری کا مکمل عکس ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ ہیں ہی ان کے زائدہ اور پروردہ، انہی کی سرپرستی اور ان ہی کے ظل حمایت میں پروان چڑھ رہے ہیں، چنانچہ **الکفر ملة واحدة** کے مصداق سب کے طریق کار ایک ہیں۔

یہ تو ان کی روداد ہے، ہمارا قصہ یہ ہیکہ ان دیہاتوں تک پہونچنے کیلئے کوئی تیار نہیں، کوئی آدمی ایسی جگہوں پر امامت کرنا نہیں چاہتا، اور اگر کسی کو تیار کر بھی لیا جائے تو اس کی ضروریات وحوائج کیلئے تنخواہوں کا نظم ایک مستقل مسئلہ ہے، ایک مفتی صاحب جو اپنے علاقے میں خاصی محنت فرمارہے ہیں انہوں نے خود مجھ سے فرمایا کہ مولانا! ایسا بھی ہوا کہ ایک جگہ پہونچنا ضروری تھا اور میں ایک ایک اسکوٹر والے مسلمان بھائی سے خوشامد کرتا رہا کہ آپ مجھے لے چلئے اسلئے کہ دیہاتوں میں سواریوں کی بڑی مشکل ہوتی ہے، مگر شام تک ایک بندۂ خدا تیار نہ ہوا، شہر حیدرآباد کا حال یہ ہیکہ بعض کمپنیوں اور دوکانوں کے اشتہار بلا ناغہ اخبار میں آتے ہیں جن کی قیمت یومیہ ۲ / ہزار سے دس دس ہزار تک ہوتی ہے، اگر ان اشتہارات کو ایک

دن کے وقفہ سے دیگر ایک دن کی رقم بچائی جائے اور وہ رقم دیہاتوں میں اماموں کو رکھنے اور وہاں کی دینی وملی ضرورتوں پر لگا دیں تو یقین ہے کہ ان کے کاروبار پر تو کوئی اثر نہ پڑے گا البتہ "ناموس ختمِ نبوت" کی بہت بڑی خدمت ہو جائیگی، مگر....

حقیقت یہ ہیکہ بڑے اور اچھے کاروبار کرنے والے حضرات میں سے ہر شخص چند دیہات کی ذمہ داری لے لے تو شاید آندھرا پردیش کا ایک دیہات بھی امام یا مدرس سے خالی نہ رہے، اور انہیں از خود نہ ہو تو ان کے دیندار اور فکر مند اعزہ واحباب کو چاہیے کہ ان کو نرمی وحکمت سے اس اہم امر کی طرف متوجہ کریں کہ آپ اپنی گاڑھی کمائی ایسے کاموں میں خرچ کر رہے ہیں، جس میں گناہ ہے یا گناہ نہیں ہے تو بھی کم از کم حساب تو دینا ہی پڑے گا، اور دوسری جانب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ ختمِ نبوت کے حاسدین اپنی کمائی اس پر صرف کر رہے ہیں کہ بھولے بھالے مسلمانوں کو بدعقیدہ بنا کر ایمان سے محروم کر دیں، حمیتِ اسلامی اور غیرتِ قومی کا تقاضہ یہ ہے کہ کم از کم اپنے غیر ضروری مصارف کو روک کر ان انتہائی ضروری امور پر صرف کریں، وگرنہ قیامت کے دن آپ کا دامن ہوگا اور محسنِ انسانیت ﷺ کا دستِ مبارک!

سلیقے اور حسنِ اسلوب سے ان حضرات کو ترغیب دینے سے میں نہیں سمجھتا کہ انہیں نفع نہ ہوگا، آخر اہل ایمان ہیں اور "اِنَّ الذِّکْریٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ" کے مصداق ہیں پھر جو حضرات اس سلسلہ میں ترغیب وتحریص کا کام کریں گے —— خواہ بظاہر نفع ہو یا نہ ہو —— ان کو تو اس عمل کا اجر مل ہی جائیگا، اور کل قیامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضوری کے لائق ہو سکیں گے، بہر حال یہ وقت کا اہم ترین کام ہے، جس کی جانب توجہ "نا" کے درجہ میں دی جارہی ہے، اور اس مسئلہ سے لاعلمی وبھولے پن کا حال یہ ہے کہ چند ہی دن قبل حیدر آباد کی مکہ مسجد

میں جو ختمِ نبوت کا جلسہ عام ہوا تھا اس میں ملک کے نامور اور اکابر علماء کے خطابات سننے کے بعد ایک صاحب میرے پاس آئے وہ کہنے لگے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ "آیا قادیانیت اس قدر پھیل رہی ہے یا آپ لوگ قصداً اس قدر ظاہر کر رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں، میں تنقید نہیں کر رہا ہوں جاننا چاہتا ہوں"۔

جس قوم میں خطرات سے بے خبری کا یہ عالم ہو وہ قوم کسی اقدام کی ہمت تو کیا کر سکتی ہے، دفاع کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس نازک گھڑی میں ہر طبقہ اپنا فرض ادا کرے، علماء اس خبیث فتنہ کی حقیقت سے عوام کو باخبر کرتے رہیں، ریاست کی تمام مساجد کے ممبروں سے مہینہ میں کم از کم ایک جمعہ ختمِ نبوت کے عنوان سے خطاب ہوتا رہے تو بہت کچھ آگہی قوم کو ہو سکتی ہے، امراء اپنی آمدنیوں کا ایک حصہ مختص کر کے تحفظ ختمِ نبوت کے مقدس فریضہ کی تکمیل میں صرف کریں۔

آندھرا پردیش میں پہلی بار کل ہند مجلس تحفظ ختمِ نبوت دار العلوم دیوبند کی نگرانی میں ریاستی مجلس قائم ہو چکی ہے، جس کے خازن مولانا احمد عبید الرحمٰن اطہر صاحب خطیب مسجد ٹین پوش لال ٹیکری ہیں[1]، ان کے ہاں تعاون جمع کئے جا سکتے ہیں، تاکہ ترتیب سے خرچ ہو سکے، اسی طرح اضلاع کے باشعور مسلمان اس فتنہ کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کر کے ذمہ داروں تک ان کی تفصیل پہونچاتے رہیں، فارغ و بے روزگار حضرات دیہاتوں میں خدمت کرنے کے عزم کے ساتھ اپنے آپ کو مجلس کے حوالہ کر دیں تاکہ ضروری تعلیم وٹریننگ دے کر ان کا تقرر کیا جا سکے، اضلاع کے تبلیغی ذمہ دار حضرات دیہاتوں میں جماعتوں کی رسد کا نظم مزید مستحکم کریں۔ رفاہی تنظیمیں دیہات کے غریب مسلمانوں کی امداد کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ غیر مقلدین نہایت غیر اہم مسائل کو بالائے طاق رکھ کر نمازیوں

[1] اب ریاست کے اکابر علماء پر مشتمل باقاعدہ "رجسٹرڈ ٹرسٹ" قائم ہو چکا ہے، جس کا مرکزی عارضی دفتر مسجدِ معراج کرما گوڑہ حیدر آباد میں قائم ہیں۔

کی نمازوں کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان ارتداد کے دبانے پر کھڑے مسلمانوں کی دستگیری کریں۔ غرض ملت کے سارے ہی طبقے اس فتنے کا تعاقب ہر گوشہ سے شروع کردیں تو وہ دن دور نہیں کہ یہ فتنہ بیک بینی ودوگوش اپنے وطنِ اصلی یعنی برطانیہ کا رخ اختیار کرلے گا، اور سرزمینِ ہند کے مسلمان اس جعل ودجل سے چھٹکارا پاجائیں گے۔

وماذالک علی اللّٰہ بعزیز

یکساں سول کوڈ اور ہمارا ملک

"ہندوستان" ایک ایسا ملک ہے جس کی تعمیر وتشکیل جمہوریت اور ہمہ قومی مملکت کی بنیاد پر ہوئی ہے، اسی پس منظر میں اس کا بنیادی دستور مرتب کیا گیا ہے، چنانچہ "دستورِ ہند" میں تمام ہندوستانی اقوام کیلئے بنیادی وشہری حقوق میں یکسانیت کی صراحت کردی گئی ہے، درج ذیل دفعات ملاحظہ کیجئے:

☆مملکت کسی شخص کو بھارت کے علاقہ میں قانون کی نظر میں مساوات یا قانون کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کرے گی۔

☆مملکت محض مذہب، نسل، ذات، جنس، مقامِ پیدائش، یا ان میں سے کسی کی بناء پر کسی شہری کے خلاف امتیاز نہیں برتے گی۔

☆ تمام شہریوں کے لئے مملکت کے تحت کسی عہدہ پر ملازمت یا تقرر سے متعلق مساوی موقع حاصل ہوگا، کوئی شہری محض مذہب، نسل، ذات، جنس، مقامِ پیدائش، بودوباش، یا ان ہی جیسی کسی بناء پر مملکت کے تحت کسی ملازمت یا عہدے کیلئے نہ تو ناقابل ہوگا، اور نہ اس کے خلاف امتیاز برتا جائیگا۔[1]

اسی طرح دستورِ ہند میں تمام ہندوستانی اقوام کیلئے مذہبی، تشخص، تہذیبی ورثہ کی حفاظت، اور تعلیم وتبلیغ کی مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔

☆ تمام اشخاص کو آزادیٔ ضمیر، اور آزادی سے (کسی) مذہب کو قبول کرنے، اسکی پیروی (کرنے) اور اسکی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے، بشرطیکہ امن عامہ، اخلاقِ عامہ، صحتِ عامہ اور حصے کے دیگر توصیفات متأثر نہ ہوں۔[2]

---

۱ دستورِ ہند حصہ:۲ دفعات:۱۴تا۱۶، ۲ ایضاً ح:۳ د:۲۵

یہی وجہ ہے اور اسی کی برکت ہے کہ ہمارا ملک مذہبی تنوع، اور تہذیبی تلون کا حسین گلدستہ ہے، مختلف افکار و نظریات، متفرق عقائد و احکام اور متعدد رسوم ورواج کا ملک کی سالمیت پر آج تک کوئی اثر واقع نہ ہوا، بلکہ یہی رانگا رنگی اور آزادی اسکے استحکام کا سبب بنی ہوئی ہے، معمارانِ دستور کی اسی وسعت ظرفی، سلامت طبعی اور حکمتِ عملی کے نتیجہ میں تمام مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے اپنے مذہبی احکام ورسوم کی روشنی میں محدود و مخصوص قوانین ـــــ پرسنل لاز ـــــ کی تدوین اور اسپر عمل کی سہولت حاصل کر لی ہے جس سے انکی ذہنی وروحانی سکون وسلامتی وابستہ ہے، ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کا وجود بھی اسی ضرورت سے عمل میں آیا ہے۔ اسکے برخلاف اب ملک میں ایسے اذہان وافکار بڑھتے جارہے ہیں جنہیں اقوام ملک کی یہ رنگارنگی ناپسند ہے، وہ اسکے مقابلہ میں یک رنگی اور یکسانیت کے قائل ہیں، ان میں سے بعضوں کا منشاء قومی عصبیت ہے اور بعضوں کا مقصد تقلید یورپ ہے، ایسے لوگوں کی جانب سے رہ رہ کے ''یکساں عوامی قانون'' ـــــ یونیفارم سول کوڈ ـــــ کیلئے قانون سازی کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے، ماضی میں کئی مرتبہ یہ مسئلہ اٹھایا گیا مگر موافق ومخالف آراء کے تبادلوں اور الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گیا، اب پھر اس مسئلے کو چھیڑا جارہا ہے۔ جسکی تفصیل روزنامہ '' منصف '' کے بموجب اس طرح ہے:

ازدواجی مسائل کی یکسوئی کیلئے یکساں سول کوڈ کی سفارش

پارلیمانی کمیٹی نے ازدواجی مسائل کی یکسوئی کیلئے تمام مذاہب کیلئے یکساں سول کوڈ وضع کرنے کا مشورہ دیا...... لوک سبھا میں آج یہ رپورٹ پیش کی گئی، جس میں حکومت سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ تمام مذاہب کیلئے، شادی، طلاق، نان و نفقہ، حقوقِ جائداد اور دیگر ازدواجی مسائل پر یکساں سول کوڈ کی تدوین کرے... [1]

---

[1] روزنامہ منصف: ۱۳۰/ اگست ۲۰۰۷ء

دراصل یہ مسئلہ دستور کے" رہنماء اصول" میں کی گئی ایک تصریح وسفارش کی تکمیل کےعنوان سےاٹھایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

مملکت یہ کوشش کرے گی کہ بھارت کے پورے علاقہ میں شہریوں کیلئے " یکساں سول کوڈ" کی ضمانت ہو۔[۱]

اس رہنمائی کا منشاء یہ بتلایا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی اقوام کے درمیان اتحادو یکجہتی پیدا ہوگی، اور مقدمات کے فیصلوں میں عدالتوں کو بھی راحت مل سکی گی، دستور میں" یکساں سول کوڈ" کی تدوین کے لئے سفارش کرنیوالوں اور اس کی قانون سازی کی کوشش کرنے والوں کے بھلےارادوں اوراچھی نیتوں پر شک وشبہ اورکسی بدگمانی کے بغیرمحض اس اصل کےممکن العمل ہوسکنے یا نہ ہوسکنے پربھی اگرغور کیا جائے تو ملک کےمخصوص احوال—— تعدداقوام، تہذیبی اختلاف اورفکری واعتقادی تقسیم—— کے مدنظر یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ" یکساں سول کوڈ" کا قیام ونفاذ ملک اوررعایا کےحق میں مفید مطلب اورمؤثر مقصدنہیں ہوسکتا، بالخصوص مسلمانوں کےحق میں، اسلئے کہ اہلِ اسلام اپنے عقیدہ کے مطابق شخصی مسائل —— پرسنل لاء جوکہ معدودے چند مسائل ہیں—— کےحل میں کتاب وسنت کے فیصلوں کے پابند ہیں، اوران کی خلاف ورزی ان کےاعتقادکےمطابق سخت ترین مذہبی جرم ہے۔ یہی صورتحال دیگراقوام کی اپنے مذہب سے متعلق ہوگی۔ یہی وجہ ہے دستور کی بعض دوسری سفارشات کی طرح یہ کام اب تک نہ ہوسکا اور نہ آئندہ خوشدلی کےساتھ اقوامِ ہند کے لئے کبھی قابلِ قبول ہوسکے گا۔اس لئے کہ " یکساں سول کوڈ" کا دوسرا مطلب ہندوستانیوں کی مذہبی آزادی ختم یا ان کے پرسنل لاز منسوخ ہوجائیں۔

جہاں تک مسلم معاشرہ میں ان شرعی احکامات کی ناقدری وبے التفاتی کا

[۱] دستورِ ہند حصہ:۴ دفعات:۴۴،

معاملہ ہے تو یہ بات افسوس کے ساتھ ماننی پڑتی ہے کہ شادی بیاہ، طلاق وتفریق، حقوق کی ادائیگی اور وراثت کی تقسیم جیسے حساس معاشرتی مسائل میں مسلمان اسلامی احکامات کی سخت خلاف ورزی کے مرتکب ہورہے ہیں۔ اور دن بہ دن ان جرائم میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں اسلام نے واضح راہنمائی کردینے کے بعد ان کی خلاف ورزی پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور سخت پکڑ کی وعیدیں سنائی ہیں۔ پھر ان خالص دینی مسائل میں اختلاف ونزاع پیدا ہوجانیکی صورت میں "کتاب وسنت" کی روشنی میں علماء کرام، شرعی پنچایتوں اور دارالقضاء سے رجوع ہونے کے بجائے عدلیہ کے دروازے کھٹکھٹانے لگتے ہیں، کیونکہ اب اسلام سے زیادہ اغراض عزیز ہوگئے ہیں، جذبۂ انتقام کی تسکین، مطالبۂ نفس کی تکمیل اور حرص وہوس کی آگ بجھانے کے خوگر لوگوں کی وجہ سے ذرا ذراسی بات پر طلاق کی عادت، وراثت میں خیانت، کاروبار میں حق تلفی، ازدواجی حقوق کی خلاف ورزی، ظلم وزیادتی مسلم معاشرہ میں عام ہوتی جارہی ہے، پھر ان مسائل کے حل کیلئے صلح وصفائی کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے مقابلہ ومجادلہ کی راہ اختیار کی جارہی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور لیڈرانِ قوم جہاں "مسلم پرسنل لاء" کے تحفظ کیلئے حالاتِ زمانہ پر گہری نظر اور اربابِ اقتدار سے ربط رکھے ہوئے ہیں۔ وہیں پر خود امتِ مسلمہ اسلامی احکامات کی قدردانی اور ایک دوسرے کی حقوق کی ادائیگی کی فکر کرتے رہیں، اللہ کو حاضر وناظر جان کر اس کی نافرمانی اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا اہتمام کرتے رہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

اے نبی! آپ کے رب کی قسم!! وہ لوگ اس وقت تک ایمان والے نہیں کہلائے جائیں گے جب تک کہ آپسی مخاصمتوں کا آپ سے (اور آپ کے بعد آپ کی امت کے علماء سے) ہی فیصلہ نکروائیں، (یہی نہیں کہ صرف فیصلہ کرالیا

جائے بلکہ) پھر جو آپ نے فیصلہ کر دیا اسکے قبول کرنے میں اپنے دلوں میں تنگی تک محسوس نہ کریں، اور پورے پورے حوالے نہ ہو جاویں۔

اللہ پاک ہم سب کو اپنے احکام کی قدر، حفاظت اور ان پرعمل کی توفیق عطا فرمائے اور تمام ظاہری و باطنی آزمائشوں سے حفاظت فرمائے۔(آمین)

یکساں سول کوڈ کی حقیقت

گذشتہ دنوں سپریم کورٹ کی ایک بنچ نے مرکزی حکومت سے ملک میں ”یکساں سول کوڈ“ نافذ کرنے کی سفارش کرکے ایک مرتبہ پھر مسلمانون کے جذبات واحساسات کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ آئینی طور پر ہمیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

دراصل ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا ہے جو ہندو احیاء پسندی اور جن سنگھی نظریات کا حامل ہے اس کو یہ بات سخت ناگوار محسوس ہورہی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو، اور وہ پورے اطمینان ووقار کے ساتھ اسلامی تہذیب واحکام کے مطابق زندگی گذارتے رہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بعض ممالک اسلامیہ میں اسلامی قانون نافذ ہے اسی طرح ہندوستان میں ایک ”ہندوا یکٹ“ ہو جس کی پابندی تمام باشندگانِ ہند پر لازمی قرار دی جائے ،مگر چونکہ دستور میں مذہبی آزادی کو اہمیت دی گئی ہے اور اسی کی روشنی میں قوموں کے ”پرسنل لاز“ کو تسلیم کیا جاتا ہے، اس لئے دستور ہی کی ایک ”رہنما سفارش“ کا سہارا لیکر ”یونیفارم سول کوڈ“ کی بات رہ رہ کر اٹھائی جاتی ہے، اوراس کی تدوین ونفاذ کا مطالبہ دہرایا جاتا رہتا ہے، اگرچہ یہ لوگ کہتے تو ”یونیفارم سول کوڈ“ کی بات لیکن ان لوگوں کو جو کانٹا بہت زیادہ کھٹکھٹا تا رہتا ہے وہ ”مسلم پرسنل لاء“ کا ہے، چنانچہ اس متعصب گروہ کے اس مطالبہ کے پیچھے وہی بات ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ملک مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو ختم کیا جائے، اور وقتاً فوقتاً ان کے بعض لیڈروں کی زبان سے

ایسی باتیں علی الاعلان بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو دانشوروں کا کہلاتا ہے، اور وہ بھی "یونیفارم سول کوڈ" کا مطالبہ کرتا رہتا ہے، ان کے مطالبے کے پیچھے مذکورہ جذبات تو نہیں ہیں، مگر وہ یورپ کے نظامِ حکومت سے مرعوب ہیں، اور ان کا تجدد پسند ذہن اس ملک میں بھی اس نظام کو درآمد کرنا چاہتا ہے، حالانکہ ہندوستانی دستور کے مقابلہ میں یورپین سسٹم نہ صرف یہ کہ ناکام ہو چکا ہے بلکہ بدنام بھی ہو چکا ہے، خود انکی رعایا ان سے مطمئن نہیں ہے، پھر بھی پتہ نہیں کیوں اس قسم کے اذہان اس کی تائید کرتے ہیں؟

بہر حال! بھاجپا کی متعصب ذہنیت اس کی مانگ کر رہی ہو یا تجدد پسند و مغرب کا مقلد طبقہ مطالبہ کر رہا ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ہمہ مذہبی و ہمہ تہذیبی معاشرہ میں اس مطالبہ پر تکمیل عملاً ناممکن ہے، بالخصوص جب کہ حکومت نے ملک کی دو ریاستوں "ناگالینڈ" اور میزورم کے انضمام میں ان کے "قبائلی نظامِ عدل" کو تسلیم کر لیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اقوامِ ہند پر "یکساں سول کوڈ" کا اطلاق قانون میں ترمیم کے بغیر ناممکن العمل ہے۔

ان دو نظریات کے علاوہ اس قسم کے مطالبوں کے پیچھے ایک "سیاسی حکمتِ عملی" بھی کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ جب کبھی کوئی ایسا حادثہ رونما ہوتا ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور ان کے احساسات سخت مشتعل ہو جاتے ہیں تو ایسے مسائل کھڑے کر دیئے جاتے ہیں کہ جن کی بناء پر وہ اس حادثہ کی طرف سے غافل ہو جائیں، اور اس حادثہ کا موضوع اس جدید مسئلہ کے پس پردہ چلا جائے۔ ماضی کی تاریخ میں زیادہ دور جانے کے بجائے انہی قریبی دو واقعوں کو دیکھ لیجئے کہ "بابری مسجد" کے شرمناک حادثہ پر پورے ملک کے مسلمان غمگین اور مشتعل تھے تو اخبارات نے انہی دنوں "تین طلاق" کا قصہ چھیڑ دیا، جس سے زعمائے ملت اور

علماء اسلام ہی کا نہیں عوام الناس کے ذہن وفکر کا رخ بھی اس طرح مشغول ہوگیا، اور اب ”درگاہِ چراغ شریف“ کے خوفناک واقعہ نے مسلمانوں کے قلوب مجروح کر کے رکھ دیئے، اور اخباروں میں روز روز یہی مسئلہ موضوعِ بحث بنتا رہا تو فوراً ”یکساں سول کوڈ“ کا معاملہ اٹھا دیا گیا۔ جو کچھ بھی ہو بہر حال ایک نا قابلِ عمل ملک کی سلامتی کے لئے نقصاندہ مطالبہ ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ملت کو درپیش خطرات سے باخبر، ان کے مقابلہ کے لئے ملک کے مقتدر علماء کرام اور ”مسلم پرسنل لاء بورڈ“ کے حامی ومددگار رہیں۔ اور اس ظاہری تدبیر کے علاوہ حقیقی تدبیر اور سب سے اہم ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس بات کا تہیہ کر لیں کہ آپسی تمام معاملات میں شریعتِ مقدسہ کے قوانین کا احترام کریں گے۔ اور خلاف ورزی کر کے ان کی توہین ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان اپنے اپنے علاقہ میں ”اسلامی دارالقضاء“ کے قیام کی سعی کریں اور تمام باہمی معاملات وآپسی تنازعات میں اسی سے رجوع ہو کر کتاب وسنت کی روشنی میں ہونے والے فیصلوں کو سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کر لیں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتیٰ یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُم لاَ یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً [1] قسم ہے آپ کے رب کی! جب تک یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے جب تک کہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ کو حکم نہ مان لیں، پھر آپ فیصلہ کو قبول کرنے میں انہیں کسی قسم کی تنگی بھی نہ ہو بلکہ مکمل طور پر تسلیم کر لیں۔

اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تو ان کا حکم اور ان کی شریعت ہی فیصلہ کرے گی۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ محض چند مفادات دنیویہ اور محض ضد وعناد اور جذبہ انتقام کی تسکین کی خاطر احکام شریعت کو پس پشت ڈال کر کورٹ کچہری کے چکر مارتے رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے بدنصیب بھی ہیں کہ اگر انہیں آپسی

[1] سورۂ نساء: ۶۵

نزاعات میں احکام اسلام قبول کر لینے کی ترغیب دیجاتی ہے تو اور سرکش ہو جاتے ہیں۔حتیٰ کہ زبان سے ایسے بے جا کلمات کہہ گذرتے ہیں جن سے ایمان بھی خطرہ میں پڑ جائے۔نقل کفر، کفر نہیں ہوتا اسلئے عبرت کے طور پر لکھتا ہوں کہ ایک جگہ سے میراث کی تقسیم شرعی کی درخواست آئی۔اہل علم حضرات جمع ہوئے اور جب فیصلہ پڑھ کر سنایا گیا تو ایک فریق نے ناراض ہوکر کہا" ہم کو ایسی تقسیم کی ضرورت نہیں اس سے اچھا فیصلہ تو دھیڑوں کے ہاں بٹائی ہوتی ہے"(معاذ اللہ) اسی طرح کی ایک مجلس میں ایک پہلوان یہ کہتے ہوے چلے گئے" ہم ان فیصلون کو نہیں مانتے" ایک اور موقع پر ایک بڑے دیندار اور پابند صوم وصلوۃ صاحب نے کہا" ہم کو کسی عالم بزرگ کی ضرورت نہیں ہے، ہم کورٹ چڑھ کر ہی بات کرینگے" استغفر اللہ۔

عرض کرنا یہ ہے کہ" یکساں سول کوڈ" کے بار بار مطالبے ہماری اس اسلام کی ناقدری اور گستاخی کے نتیجہ میں عذاب الٰہی اور قہر خداوندی تو نہیں ہے؟....خوب غور کر لیجئے!! **رَبَّنَا لاَ تُواخِذْنَا اِنْ نَسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَاصَنَعْنَا. آمین**

جماعت اسلامی کا علماء کنونشن

جماعتِ اسلامی ہند حلقہ آندھرا اوڑیسہ کے ذمہ داروں کی جانب سے اپنی جماعت کے "شعبۂ اسلامی معاشرہ" کے تحت ۲۷/جنوری ۲۰۰۸ء کو دن بھر کا ایک پروگرام مولانا محمد رفیق صاحب قاسمی امیر شعبہ کی صدارت میں بہ عنوان "علماء کنونشن" منعقد ہوا۔ جس میں درج ذیل عنوانات پر مختلف مکاتب فکر کے علماء سے خطابات کروائے گئے (۱) علماء کا مقام اور موجودہ حالات میں ملت کی رہنمائی (۲) اختلاف کے باوجود اتحاد کی راہیں (۳) اسلامی معاشرہ کے قیام میں علماء کا رول (۴) اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور علماء کا رول، اس اجلاس کا افتتاحی خطبہ جناب ملک معتصم صاحب امیر جماعت آندھرا اوڑیسہ اور صدارتی خطاب مولانا محمد رفیق قاسمی سکریٹری شعبۂ اسلامی معاشرہ جماعت اسلامی ہند کا رہا۔ کنونشن کو کامیاب بنانے کے لئے جہاں اسٹیج پر مختلف مکاتب فکر کے چند علماء جمع کر لئے گئے تھے، وہیں سامعین و مستفیدین کی نشستیں پر کرنے کے لئے بھی معلوم ہوا کہ پوری ریاست سے باقاعدہ سواریاں فراہم کر کے علماء کرام کو لانے کا اہتمام کیا گیا، ظاہر ہے کہ ان علماء کی اکثریت "علماء دیوبند" ہی کی تھی، ویسے شرکاء سے معلوم ہوا ہے کہ ایک بڑی تعداد کارکنان جماعت اور غیر علماء کی بھی حاضرین میں موجود تھی۔ راقم السطور کو بھی حلقہ کے ذمہ داروں نے بہت اصرار و تکرار کے ساتھ دعوت دی تھی، مگر اپنے بڑوں سے مشورہ کا موقع نہ مل سکنے کی وجہ سے اور دیگر مصالح سے اس میں شرکت نہ ہو سکی۔ البتہ روداد معلوم کرنے اور خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کا موقع ملا، یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ

ایک علماء بیزار جماعت کو علماء کنونشن کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کہیں یہ مجلس علمیہ کے تحت دوسال سے جاری ریاستی علماء کے اجلاس عام کا اثر کم کرنے کے لئے تو نہیں کیا گیا؟ جو بھی اسی خطبہ استقبالیہ کے حوالہ سے ہم قائدین جماعت اور علماء کرام کے سامنے چند معروضات پیش کررہے ہیں۔

اس کنونشن کے خطبۂ استقبالیہ میں جناب ملک معتصم صاحب ریاستی امیرِ جماعت نے سب سے پہلے بہت سنجیدہ وسلجھے ہوئے انداز اور علماء کرام کے مناقب وفضائل کی روشنی میں آئے ہوئے علماء کرام کو خراجِ عقیدت پیش کیا (جبکہ جماعت کے نزدیک علماء کرام ہی امت کو پستی میں ڈھکیلنے، دین کے غلط تصور کو پھیلانے، تلوار کے بجائے تسبیح ہاتھوں میں تھما دینے کے ذمہ دار ہیں، جیسا کہ ان کے راہنما اور بانئ جماعت نیز قائدینِ جماعت کے لٹریچر سے واضح ہے) اس کے بعد ساری دنیا میں اسلام اور اسلامی رجحانات کے عام ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اسلام ایک ناقابلِ شکست نظریاتی قوت کی حیثیت سے ابھر رہا ہے" (جبکہ علماء کرام کے نزدیک اسلام "نظریاتی قوت" کے بجائے ازلی حقیقت اور عملی دعوت کا نام ہے، اور اسی تعبیر وتعریف کے فرق نے علماء کرام اور جماعت اسلامی کے درمیان ایسی حد فاصل قائم کردی ہے کہ سمجھوتہ دشوار ہے) اسکے بعد "ایک حقیقت" کے عنوان سے وہی پرانا راگ کہ "اسلام میں مذہبی پیشوائیت یا پاپائیت کا تصور نہیں ہے، ہر مسلمان اپنے عمل کے سلسلہ میں خدا کے سامنے راست جوابدہ ہے، انسان راست طور پر اللہ سے تعلق پیدا کرسکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ انسان سے قریب ہے" (اور ظاہر ہے کہ علماء انسان سے اتنا قریب نہیں ہیں، عالم تک پہونچنے سے پہلے ہی آدمی جب خدا کو پالے سکتا ہے تو علماء کی راہنمائی اور رہبری کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے؟) اگلے پیراگراف میں اسکو تسلیم کیا ہے

کہ ”کبھی بھی علماء نے اپنا کوئی الگ طبقہ نہیں بنایا“ (جب بنایا ہی نہیں تو پھر اس موضوع کو علماء کے سامنے ذکر کرنیکی ضرورت کیا ہوئی؟ ہاں غیر علماء اور غیر مسلموں میں علماء اسلام کی یہ خوبی بار بار بیان کرنیکی ضرورت ہے، لیکن تجربہ یہ ہے کہ وہاں تو علماء کی شکل اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ رہی سہی عقیدت بھی ختم ہوجائے۔) مزید فرماتے ہیں ”علماء کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ دین کا علم رکھتے ہیں، اسلام کے مزاج شناس ہیں، وحی الٰہی، سنت رسول ﷺ اور عصر حاضر کا شعور رکھتے ہیں اس شعور اور علم کی وجہ سے وہ تمام خادمانِ دین کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں“ (علماء کی اس اہمیت کو جو انہوں نے بیان کی ہم اسی طرح تسلیم کر کے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی اور خود اسکے بانی دین کی تعبیر وتشریح میں علماء کرام ہی کو مرجع مانتے ہیں یا ”راست جوابدہی“ اور ”راست طور پر تعلق مع اللہ“ حاصل کر سکنے کا حق استعمال کرتے ہوئے علماء سے ہٹ کر ایک علاحدہ روش اپناتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے لٹریچر نے جہاں جدید اسلوب اور عام فہم تعبیرات کے ذریعہ دہریت زدہ طبقہ کو اسلام سے قریب کرنے کا کام کیا ہے بالخصوص یورپین مما لک میں، وہیں اس مائل بہ اسلام طبقہ کو علماء کرام اور ان کے فکر و مذاق سے فکری طور پر بدظن اور عملی طور پر دور کر کے براہِ راست کتاب وسنت پر عمل کر لینے کی بدعت میں مبتلا بھی کر دیا ہے، **فیا اسفاً علیھم**۔) بعد ازاں امت کو درپیش بحران کا تجزیہ کر کے اسکے تین سبب تجویز کئے ہیں۔ ”۱۔ علماء کرام کا عصری شعور سے اور دانشورانِ قوم کا دینی شعور سے محروم ہونا ۲۔ امت کی عملی قیادت کا مفاد پرستوں، سیکولر قوتوں اور اسلامی فکر ونظر میں کمزور لوگوں کے ہاتھ میں چلے جانا ۳۔ امت کی دینی فکر میں جمود واضمحلال جس نے مغربی افکار کا مقابلہ دشوار کر دیا“

(اس بحران کا حل ہونا علماء کرام کے آگے بڑھے بغیر جماعت اسلامی سے ممکن

نہیں ہوسکا، غالبًا اسی لئے جماعت کو ضرورت پڑی کہ علماء کرام کو متوجہ ومتنبہ کرنے کے لئے "علماء کنونشن" رکھا جائے اور انہیں جمع کر کے بتلایا جائے) کہ "(۱) محض دینی تعلیم کی اشاعت، درس وتدریس اور امامت وخطابت (جو وہ کر رہے ہیں) کافی نہیں ہے، اسکے ساتھ علماء کرام غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت، مسلم معاشرہ کی تعمیر وترقی، مسلمانوں کو (عصری) تعلیم یافتہ بنانیکی جدوجہد، انہیں معاشی اعتبار سے اوپر اٹھانیکی فکر، سیاسی مسائل کا حل کرنیکی کوشش، مخالف اسلام نظریات کی عملی ونظریاتی تردید، موثر ومدلل لٹریچر کی تیاری اور عدل وانصاف کے قیام کی جدجہد کرنا بھی انکی ذمہ داری ہے (جو وہ بظاہر نہیں کر رہے ہیں) (۲) اسکے لئے علماء کرام اپنے اندر وہ لیاقتیں پیدا کریں جنکی ان کاموں کے لئے ضرورت ہے (۳) اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں علماء کے اتحاد کے بغیر امت کا اتحاد ممکن نہیں ہے"۔

ہم کسی بناوٹ کے بغیر صاف طور پر جماعتِ اسلامی کے ذمہ داروں سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عرصہ تک علماء کرام کے عوامی اعتماد واعتقاد کو مجروح کرتے رہنے اور اپنے لٹریچر کے ذریعہ ایک بڑے طبقہ کو علماء اور انکی خدمات سے بدگمان بلکہ دور ونفور کر دینے کے بعد اب جاکے آپ کو خیال آیا کہ "علماء کرام کے اختلافات امت کے لئے رحمت ہیں اور علماء کی شمولیت کے بغیر امت کو درپیش بحران سے نکالا جانا ممکن نہیں ہے"۔ تو ان باتوں کو پڑھ کر ہم بجز اس کے کیا کہہ سکتے ہیں ۔ بہت دیر کی مہربان! آتے آتے

مگر ہم اس قربت ودوستی کے جذبہ کو اسی وقت مخلصانہ سمجھ سکتے ہیں جب کہ بانیٔ جماعت کی جن فکری لغزشوں اور تعبیری غلطیوں کی علماء امت نے نشاندہی کی ہے اور انہی کی وجہ سے جماعتِ اسلامی کو صراطِ مستقیم اور افکارِ سلف سے ہٹی ہوئی جماعت قرار دیا ہے، ان سے برأت کا جماعت کی جانب سے واضح اظہار کیا جائے

ایک پلاٹ فارم پرآنے اوراصلاحِ معاشرہ کی مشترکہ جدوجہد کرنے کے لئے یہ لازمی امر ہے، وگرنہ آپ اپنی فکر کے مطابق امت کی خدمت کرتے رہیں، ہم اپنی تحقیق کے مطابق کام کرتے رہیں گے،آپ یہ اطمینان رکھیں کہ مخالفت برائے مخالفت علماء کا کام نہیں ہے، البتہ اتحادامت کی ضرورت کوتسلیم کرنے اورحدود کے اندرتمام اہل اسلام کےساتھ متحدرہنے کے باوجود"زہر" کو"قند" کہہ دینے کے لئے بھی وہ کبھی تیارنہیں ہوسکتے،آخر"**الحب فی اللّٰہ**" کی طرح"**البغض فی اللّٰہ**" بھی توایمان ہی کی ایک مضبوط کڑی ہے! جہاں تک اختلافِ فکر کے باوجوداتحاد ملت کاتعلق ہےتو علماءِ دیوبندملّی مساعی اورمسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں سب مسلمانوں کے ساتھ ہیں ، اورضرورت کے مواقع پرمل بیٹھنے،سوچنے اور اشتراکِ عمل کیلئے ہمیشہ تیاررہتے ہیں ۔چنانچہ ہمارےعلماءکرام نے احقاقِ حق کے سلسلہ میں موقف حق اورطریق سلف پرمضبوطی سے قائم رہنے کے باوجودفریق مخالف کااحترام کرنے اوراس کےاسلامی حقوق کی خلاف ورزی سے بچتے رہنے کی اسلامی تعلیم کوکبھی بھی نظرانداز نہیں کیا۔خود جماعتِ اسلامی اوراسکے بانی جناب سید مودودی صاحب سےشدیدعلمی واعتقادی اختلاف کے باوجوداتحادملت کی اہمیت اورحدوداختلاف کی رعایت کے مدنظران کی مخالفت کونہ اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں،اور نہ ہی منافرت کاروبہ اختیارکئے ہوئے ہیں،کیونکہ انہیں تو عیسائیت، قادیانیت،اوران جیسی ملحدانہ وکافرانہ تحریکوں سےملتِ اسلامیہ کومحفوظ رکھنے کی فکر نے اسلامی جماعتوں سے بلاضرورت اختلاف سے یکسوکررکھا ہے۔ہاں !اسلام کا غیرمتوازن نظریہ اپنانے والوں، یااہل السنۃ والجماعت کے مسلک سے انحراف کرنے والوں کے تعاقب اوران کی کوتاہیوں کی نشاندہی کیلئے بوقتِ ضرورت، بقدرِضرورت اظہارِاختلاف کواپنااسلامی فریضہ سمجھتے ہیں۔اگرعلماءکرام اتحادِملت

کی اہمیت سے بے خبر ہوتے اور اختلافی امور میں اس کی رعایت نہ کرتے تو یہ ملت کبھی کے مٹ چکی ہوتی۔ **فجزاھم اللّٰہ عنا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء**

خلاصہ یہ ہے کہ علماء کرام بفضلہٖ تعالیٰ اتحادِ امت کی ضرورت کو اسقدر سمجھتے اور اس کی رعایت اس قدر رکھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی جانب سے انہیں اس کی تلقین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ عصمتِ انبیاء، عظمتِ صحابہؓ، مقامِ اولیاء، اور تعبیراتِ دینیہ کے سلسلہ میں عقیدۂ اہل السنۃ والجماعت اور منہجِ سلف کی دھجیاں بکھر جانے کے باوجود بھی علماء کرام محض علمی اختلاف کی حد میں محدود ہیں، نہ صرف یہ! بلکہ حدودِ گنجائش میں اتحادِ امت کی خاطر دستِ تعاون بڑھانے کے لئے بھی تیار ہیں، **فالحمد للّٰہ ولا فخر**۔ ہمارے نزدیک اسی کو ”اختلاف کے باوجود اتحاد“ کہتے ہیں، اور اگر اتحاد کا مطلب یہ ہیکہ علماء کرام غیر صالح اور غیر اسلامی افکار ونظریات کا تعاقب کرنا اور امت کے سامنے اسکی نشاندہی کرنا چھوڑ دیں، بلکہ قبول وتسلیم بھی کر لیں جیسا کہ اس زمانہ میں ہر اتحاد کے داعی کا عملاً مطالبہ یہی ہے تو یہ نہ ماضی میں ممکن ہوسکا ہے اور نہ آئندہ انشاءاللہ ہوسکے گا۔

اس کنونشن میں موجود علماء کرام کو چند کتابیں ہدیہ بھی کی گئیں (۱) مقامِ صحابہؓ (۲) جماعتِ اسلامی ۸۰ علماء کی نظر میں (۳) جماعتِ اسلامی ہند پس منظر و خدمات (۴) دستور جماعتِ اسلامی ہند، مذکورہ کتابوں کی تقسیم سے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ علماء کرام کو جمع کرنے کا مقصد جہاں اتحاد کی دعوت دینا تھا وہیں ان کے ذہنوں سے جناب مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں ان کے اساتذہ واکابر کے قائم کردہ نقوش کو مٹانا اور غلط ——— یا راست ——— فہمی کو دور

کرنا بھی تھا، اس لئے کہ "مقامِ صحابہ ؓ" مودودی صاحبؒ یا کسی صاحب کی کوئی باضابطہ تحریر نہیں ہے، مختلف کتب میں ضمناً ان کے قلم سے عقیدت کے جو کلمات نکل گئے وہ بھی زیادہ تر ایسی خوبیاں جن سے تنقید کا تحمل اور تنقید کا جواز فراہم ہو سکے۔ انہیں مختلف سطروں کو جگہ جگہ سے جمع کر کے "خلافت وملوکیت" کا پاپ دھونے کے لئے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے، اور جہاں تک "۸۰ علماء کی نظر" کا معاملہ ہے تو اس میں عرب علماء کے مزاج سے تو سب واقف ہیں کہ ان کے ہاں ردوقبول کا معیار بالکل سطحی قسم کا ہے، اور ہندوستانی علماء میں سے جن چند وقیع شخصیتوں کی تائید حاصل کی گئی ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے پوری گہرائی سے جماعت کے لٹریچر کو ملاحظہ نہیں فرمایا ہے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے تحقیق کے بعد باقاعدہ جماعت کے خلاف اپنے موقف کا اظہار بھی فرمایا ہے، جن کی سب تحریریں شامل کرنے سے پہلو تہی کی گئی ہے، **نحن نحکم بالظواھر واللّٰہ المتولی السرائر**

خطبۂ استقبالیہ کے آخری پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ "جماعتِ اسلامی نہ کسی مسلک کی دعوت ہے نہ کسی شخصیت کی" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر جماعتِ اسلامی ہے کیا؟ سبحان اللہ! جماعتِ اسلامی کا اپنا مخصوص ٹائٹل ہے، مخصوص دستور ہے، مخصوص اصطلاحات ہیں، دین کی سلف سے ہٹ کر مخصوص تعبیرات وتاویلات ہیں، جماعت میں کارکنان کے مخصوص مرتبے ہیں، مخصوص لٹریچر ہے، مخصوص دعوت ہے اور مخصوص داعی وبانی ہے، اگر مخصوص نظریہ دعوت کو "مسلک" نہیں کہتے اور مخصوص شخص کے افکار ونظریات کو حق قرار دیکر اسکی طرف بلانے کو "شخصیت" کی طرف دعوت نہیں کہتے تو مسلک، شخصیت اور کس کو کہتے ہیں؟ کیا مودودی صاحب اور ان کے افکار کا صاف طور پر انکار کر کے یا دستور جماعتِ اسلامی کی بعض دفعات کی

مخالفت کر کے کوئی شخص جماعتِ اسلامی کا امیر، رکن، قیم، یا کم از کم متفق کہلا سکتا ہے؟ پھر نہیں معلوم کہ اس خوبصورت جھوٹ کے ذریعہ علماء کے سامنے مسلک وشخصیت سے دستبرداری کی کیا ضرورت پیش آئی؟ جب جماعتِ اسلامی دین کی تعبیر کا اپنا ایک مستقل تصور ونظریہ آئے ہوئے علماء کرام کے نظریہ سے ہٹ کر رکھتی ہے تو پھر اس سے براءت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہر جماعت کا اپنا مسلک ہوتا ہی ہے ورنہ وہ کوئی مستقل جماعت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین مخصوص شخصیات اور مخصوص مکتبِ فکر کی تحقیق وتعلیم پر سختی سے عمل پیرا ہونے اور ہزاروں احادیثِ مبارکہ کو نظرانداز کر دینے کے باوجود خم ٹھونک کر کہتے ہیں۔

اہل حدیث کا ایک ہی اصول

اتباع کتاب اللہ و حدیثِ رسول

آخر میں ہم نو فارغ علماء کرام سے خصوصیت کے ساتھ دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ادھر اُدھر نہ بھٹکیں اپنے اسلاف واکابر کے طرزِ عمل کو مضبوطی سے تھامے رہیں، تعصب اور چیز ہے تصلب اور، پہلی مذموم اور دوسری محمود صفت ہے، دینی نظریات وافکار کے بارے میں اپنے علم وعقل پر کامل اعتماد نہ کرنے اور اکابر سے رجوع کرتے رہنے کی معقول ضرورت سے مستغنی نہ بنیں، اکابر علماء دیوبند کا مسلک، مسالکِ عصریہ میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے سب سے معتدل ومتوسط، کتاب وسنت سے اوفق اور طریقِ سلف سے قریب تر ہے، جو شریعت وطریقت کا جامع، توحید وسنت کا حامل اور حرکت وعمل کا داعی ہے، اسی سے وابستہ رہ کر ملت کی خدمت کرتے رہیں، اور زمانے وعلاقے کی ضروریات کو اچھی طرح سمجھ کر خوب خوب سے خوب کام کریں اور امت کی صلاح وفلاح کے لئے اپنے دنیوی مصالح ومسائل

کے ایثار والی بزرگوں کی روش سے چمٹے رہیں، علمی تحقیق و عملی تدقیق، تقوی اللہ و تعلق مع اللہ کی زینت سے مزین و آراستہ رہیں، آج ساری دنیا کی نظریں علماء اہلِ حق پر ہیں، اور دشمنانِ اسلام تسلیم کر رہے ہیں کہ انہیں صرف دیوبندی علماء سے خطرہ ہے ـــــ وکفی بہ فخراً ـــــ اس لئے انہیں رجھانے اور طریقِ سلف سے ہٹانے کے لئے طرح طرح کے منصوبے اور قسم قسم کی اسکیمیں سامنے لائی جارہی ہیں، جس کی بھولے بھالے اور سطح بیں مسلمان بھی حمایت ووکالت کر رہے ہیں، ایسے حالات علماء کرام پر تاریخ میں پہلے بھی آچکے ہیں، مگر اب کی مرتبہ صورتحال زیادہ خطرناک ہے، اس لئے اپنوں کے بھولے پن اور پرایوں کی سازشوں دونوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، اس کا واحد راستہ بڑوں کے زیر سایہ اور پسِ راہنمائی کام کرنا ہے، جس کی اس وقت علماء کرام میں بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جو نہایت نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ چند معروضات علماء کی خدمت میں کسی تعلّی و ترفع کی بنیاد پر نہیں محض ایک خادم دین ہونے کی حیثیت سے اپنے محدود تجربات کی روشنی میں اظہار حقیقت کے طور پر پیش کی ہیں، علماء کی چھوٹی سی لغزش امت کے بڑے خسارہ کا سبب ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علماء امت کے فکر و نظر اور جہد و عمل کا قبلہ ہمیشہ درست اور ہر قسم کے انحراف سے محفوظ رہے تاکہ ملتِ اسلامیہ کا سفر سعادت کامیاب رہے۔ **وما توفیقی الا باللّٰہ**

مختصر خاندان یا خاندانی منصوبہ بندی!

ویسے تو "تحدیدِ نسل" کے نظریہ کا آغاز انیسویں صدی کے شروع ہی میں انگلستان سے ہوا، لیکن بیسویں صدی کے وسط میں" خاندانی منصوبہ بندی" کے حسین عنوان اور معصوم نام سے اس نظریے کو پوری دنیا میں پھیلا دیا گیا، اور گذشتہ پچاس برس سے تو مغربی ممالک کے سامنے یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، بالخصوص مشرقی ممالک میں اس پر عملدرآمد کیلئے ان کی جانب سے مسلسل سعی اور دباؤ جاری ہے۔ سن ۱۹۵۹ء میں امریکہ کی صدارتی کمیٹی نے یہ تجویز پاس کی تھی کہ "امریکی امداد صرف ان ممالک کو دی جائے گی جو" ضبطِ تولید" کے نظریہ پر کاربند ہوں" ان لوگوں کا ماننا تھا کہ انسانی آبادی کی وسعت وکثرت کا یہی حال رہا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ انسانوں کی بنیادی ضروریات زندگی کا فراہم ہونا بھی مشکل ہوجائے گا، اور انسانیت غلہ اناج اور پھل پھلاری کے بجائے کیڑے مکوڑے کھانے پر مجبور ہوجائیگی۔

چنانچہ ہندوستان نے بھی یورپی ممالک کی تقلید میں یا مرعوبیت ومحتاجی کی بنیادوں پر اس نظریہ کو اپنے ملک میں درآمد کرنے اور یہاں کے باشندگان پر لاگو کرنے کی بار بار کوشش کی، اس کیلئے ترغیب وترہیب پر مشتمل منصوبے بنائے، کبھی کبھی جبر واستبداد سے بھی کام لینے کی کوشش کی گئی، اگر چیکہ کچھ زیادہ کامیابی اس میں حاصل نہ ہوسکی مگر حکومت کو اس سلسلہ میں فکر ضرور ہے اور اس کیلئے باقاعدہ

ایک محکمہ اچھے خاصے بجٹ کے ساتھ کام بھی کر رہا ہے۔ جس کا نتیجہ مختلف منصوبوں اور ترغیبات کی شکل میں وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہتا ہے، مثال کے طور پر "لا کمیشن" کے صدر، دستور پر نظر ثانی کی کمیٹی کے رکن اور ماہر قانون جسٹس پی جیون ریڈی کا یہ بیان ملاحظہ ہو

"صدر نشین لا کمیشن اور دستور پر نظر ثانی کمیشن کے رکن جسٹس پی پی جیون ریڈی نے آج ملک کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ کی روک تھام کیلئے "ایک بچہ" کے اصول پر سختی کے ساتھ عمل آوری کی وکالت کی ہے، آنجہانی برگولا رام کرشنا راؤ کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر بعنوان "دستور ہند میں ریاستی پالیسی کے راہنمایانہ اصول اور انسدادِ غربت" پر لکچر دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ چین میں ایک بچہ کا لزوم عائد کر دیا گیا ہے، جس کے باعث وہاں آبادی کے مسئلہ پر قابو پانے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے، لیکن ہم یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک بچہ کے اصول پر عمل آوری ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہمارا ملک جمہوری ہے، ممتاز ماہر قانون نے کہا کہ عوام کو یہ قائل کروانا ہوگا کہ خوشحال سماج اور روشن مستقبل کیلئے اس طرح کے اقدامات ضروری ہیں، انہوں نے استفسار کیا کہ ہندوستان ترقی کے ثمرات حاصل کرنے کیلئے کب تک انتظار کرے گا جبکہ ہر سال آبادی میں ۲ کروڑ کا اضافہ ہو رہا ہے، انہوں نے بتایا کہ حال ہی میں حکومت مہاراشٹرا نے آبادی پالیسی کا اعلان کیا تو بعض رجعت پسند طاقتوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی، جبکہ اس پالیسی میں کہا گیا ہے کہ یکم اکٹوبر ۲۰۰۰ء کے بعد اگر کوئی تیسرا بچہ پیدا کرے تو سرکاری مراعات بشمول کوآپریٹیو قرضہ جات اور راشن کارڈ سے محروم کر دیا جائیگا۔ جسٹس ریڈی نے رجعت پسند طاقتوں کے ان دلائل پر ناخوشی کا اظہار کیا کہ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل آوری سے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں، انہوں نے

دریافت کیا کہ (آیا اسطرح) کوئی ترقی پسند اقدام ملک بھر میں قابل قبول ہوگا؟ انہوں نے بتایا کہ انسداد غربت کی راہ میں بے قابو آبادی، ناخواندگی اور رشوت ستانی رکاوٹ بن گئی ہے۔ آبادی میں اضافہ کی روک تھام کے لئے سیاسی قوتِ ارادی کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آزادی کے وقت ملک کی آبادی ۳۰ رکروڑ تھی جو کہ اب ۱۰۰ رکروڑ تک پہنچ گئی ہے اور آبادی کے مسئلہ نے حکومت کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔[۱]

ایک بچہ کا اصول حکومتِ مہاشٹرا نے یکم اکٹوبر ۲۰۰۰ء سے نافذ کیا ہے، اس کی خلاف ورزی پر قانونی مراعات سے محروم کردئے جانے کی تنبیہ کی ہے۔ چیف منسٹر مہارشٹرا نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس فیصلہ سے کسی طرح بھی اسلامی قوانین کی خلاف ورزی اور مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں ہوتی۔[۲]

جہاں تک اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے، اس لئے کہ اس سلسلہ میں اسلام کا نظریہ بالکل واضح اور دوٹوک ہے، اللہ تعالیٰ نے روزی کے خوف سے اولاد کو قتل کرنے کی صاف ممانعت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ روزی تمہیں بھی ہم ہی دیتے ہیں اور ان نومولودوں کو بھی ہم ہی دیں گے۔ نیز روئے زمین کے تمام جانداروں کو روزی پہونچانا اپنا ذمہ قرار دیا ہے۔

رزق اسلامی اصطلاح میں تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے، اسلئے اس میں وہ تمام امور داخل ہیں جن کے مدنظر حکومتوں نے تحدید نسل کے منصوبہ کی ضرورت محسوس کی ہے، اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ہم نے زمین کو اس لائق بنایا ہے کہ وہ زندوں اور مردوں کو جمع کرسکے اور انہیں سہار سکے۔ یعنی انسانوں کا خالق و مالک انسانی آبادی کے تناسب سے بھی واقف ہے اور اسے سنبھالنے کے طریقہ کار سے بھی باخبر ہے، اور یہ کام واقعتاً بھی قدرت ہی کا ہوسکتا ہے، انسانوں کے بس میں نہ

[۱] روزنامہ سیاست ۱۸ ستمبر ۲۰۰۰ء ، [۲] روزنامہ منصف ۲۱ ستمبر ۲۰۰۰ء

کل تھا نہ آج ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق ازدواجی تعلق کا قیام یعنی شادی بیاہ سماج میں عزت وعصمت کی حفاظت اور تکثیرِ نسل کیلیئے ہی کے جاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”بہت محبت کرنے والی اور بہت اولاد جننے والی عورت سے شادی کرو“ اس لئے یہ کہنا کہ اس فیصلہ سے مسلمانوں کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں ہوتی سفید جھوٹ اور دیدہ دلیری کی بات ہے۔

بہر حال جہاں تک اس مسئلہ میں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے نظریئے کا تعلق ہے کسی قیمت پر یہ منصوبہ اہلِ اسلام کیلیئے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مسلمان ہر محرومی کو گوگوارا کرسکتا ہے مگر قدرت کے مقابلہ کی جسارت کو برداشت نہیں کرسکتا۔

یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خود عقلی وعملی طور پر اس منصوبہ کو ان مقاصد کے حصول میں کس قدر دخل ہے؟ جن کی خاطر یہ نظریہ تصنیف کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی آبادی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی آبادی روز اول سے ہمیشہ بڑھتی رہی ہے، اگر قدیم زمانہ میں بھی لوگ کثرتِ آبادی کو قلت وسائل کا سبب سمجھتے اور اس پر کنٹرول شروع کردیتے تو شاید اب تک انسانیت ہی دنیا سے مٹ چکی ہوتی۔

دوسری بات یہ ہیکہ جن ممالک نے ماضی میں اس منصوبہ پر پوری قوت سے عمل کیا ان کے نتائج میں غور کیا جائے کہ کیا نکلے؟ تو جواب ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ ان ممالک میں صد فیصد ناکام ثابت ہوا! کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ مسائل اور الجھنیں وجود میں آئیں کہ حکومتوں کو پھر اس کے خلاف قوانین بنانے پڑے، مذہبی اداروں وجماعتوں کے ذریعہ نسل کشی کی مذمت اور ”بقاءِ نسل“ بلکہ ”تکثیرِ نسل“ کے جذبات ابھارنے کی محنتیں کرنی پڑیں، آج جس طرح ہندوستان میں تحدیدِ نسل کی خلاف ورزی پر مراعاتِ قانونی سے محروم کیئے جانے کی تنبیہ کی جارہی ہے، وہاں توسیع

نسل کی خلاف ورزی پر بڑی بڑی سزائیں مقرر کی گئیں، اس لئے کہ اس نہایت نامعقول منصوبہ بندی نے ان ممالک پر بہت خطرناک اثرات ڈالے تھے، انسانیت جسمانی، ذہنی، اخلاقی، اجتماعی، اور خانگی مہلکات میں مبتلا ہوگئی تھی اور خلافِ فطرت حرکات کا انجام تباہی و بربادی ہی ہوسکتا ہے۔

بطور لطیفہ ایک بڑے بزرگ اور طبیبِ حاذق حضرت حکیم امداد اللہ صاحبؒ کی بات بھی اس جگہ درج کردینے کو جی چاہتا ہے جو انہوں نے فیملی پلاننگ ہی سے متعلق ایک ملکی کانفرس کے اختتام پر کہی تھی کہ "تحدیدِ نسل" کی ضرورت جن اہم ترین وجوہات سے آپ حضرات نے بیان کی ہے اس کو ــــ باجود نامعقول ہونے کے بھی ــــ تھوڑی دیر کیلئے تسلیم کر کے میں شرکاءِ اجلاس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آبادی پر کنٹرول کیلئے یہی کیا ضروری ہے کہ توالد وتناسل کے سلسلہ پر روک لگادی جائے، ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ بچے تو پیدا ہونے دیئے جائیں، لیکن پیدا ہونے والوں کیلئے ایک عمر کی تحدید کردی جائے کہ مثلاً پچاس برس کے بعد انہیں کسی طرح ختم کردیا جائے؟ اسطرح ازدواجی زندگی کے فطری نظام پر بھی اثر نہیں پڑیگا، صحتیں اور آرزوئیں بھی متاثر نہیں ہوں گی، ادھر آبادی پر کنٹرول بھی رہے گا۔ بس! آبادی پر کنٹرول کے بڑے بڑے فضائل بیان کرنے والے بھی چپ سادھ کے رہ گئے۔

اصل بات بس اس قدر ہے کہ یورپ کو دنیا میں مشرقی اقوام کی بڑھتی ہوئی آبادی سے خطرہ ہے وہ ان قوموں کی ترقی وعروج سے اپنی حفاظت چاہتا ہے اسی لئے اس نے مشرقی ممالک میں اس نظریہ کو فروغ دینے اور اس کی بنیاد پر اعانت وامداد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کاش! اس ملک کے ناخدا اس حقیقت کو سمجھ لیتے۔

دعوتِ دین کی جدید کوششیں اور ان کے اثرات

دینِ حق یعنی "اسلام" ہی دنیا میں وہ واحد مذہب ہے، جو حق وصداقت اور سچائی کی بنیاد پر قائم ہے اس کے مقابلے میں نہ کوئی دین "دین" ہے اور نہ کوئی مذہب "مذہب" ہے! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" چنانچہ دین اسلام کے علاوہ تمام ادیان باطل اور عنداللہ مردود ہیں۔ اس سچائی کو ہر مسلمان تک پہونچانا اور اس کو دینِ حق کی طرف بلانا یقیناً ایک اہم ترین کام ہے اور فریضۂ اسلام ہے اس سے کسی صاحبِ علم کو انکار نہیں ہوسکتا۔

یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا کبھی کم کبھی زیادہ، ہمارے اس ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتداء ہی عملاً اسی کام سے ہوئی اور اسی کی برکت سے ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آج موجود ہے، البتہ یہاں کے مسلم حکمرانوں اور سلاطین نے اپنے پرشکوہ دور اقتدار میں نہ ہی دعوت الی الایمان کا خود کوئی کام کیا اور نہ ہی اس کام کے لئے اپنی حکومت میں کوئی شعبہ قائم کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس ملک کی تہذیبی و مذہبی تنوع کے مدنظر مذہب کے اختیار کو ضمیر کی آواز پر چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا ہو، یا پھر عیش وعشرت نے ان کو اتنی فرصت ہی نہ دی ہو کہ اس مسئلہ کی طرف توجہ کی جائے۔

مسلمانوں کی حکومتوں کے زوال کے بعد حالات اس قدر ابتر ہوئے کہ خود مسلمانوں کا اسلام پر قائم رہنا مشکل ہو گیا اور ارتداد کے خطرات منڈلانے لگے،

تو علماء اسلام اور داعیان کرام نے تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند کے دین وایمان کے تحفظ اور ان کی نسلوں کی ایمان پر بقاء وثبات کی جانب مبذول کی، اور اسی میں ہمہ وجوہ منہمک رہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ انہیں اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اس دور میں بھی دعوت الی الایمان کا کام کسی نہ کسی سطح پر ضمناً ہوتا رہا۔ مثال کے طور پر صرف جماعتِ تبلیغ کے کارکنوں کے ذریعہ ملک وبیرونِ ملک جو لوگ ایمان میں داخل ہوئے وہ اتنے ہیں کہ ان کی تعداد کا شمار کرنا بھی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اور تحریکوں نے بھی ضمناً اس خدمت کو انجام دیا اور دے رہے ہیں، نیز انفرادی طور پر متعدد داعی ہمیں ایسے معلوم ہیں کہ انہوں نے شہروں اور قرایا میں دعوتِ ایمان کا بہت مؤثر کام انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں۔

البتہ کبھی اسکے لئے کوئی باقاعدہ تحریک چلانے اور ان مسلمان ہونیوالوں کی اور اپنے کام کی تشہیر کرنیکی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور ایسا نہ کرنا ہی قرینۂ حکمت ومصلحت تھا بلکہ اب بھی ہے۔ ہر جگہ کے حالات اور وہاں کی خصوصیات جدا جدا ہوتی ہیں چنانچہ اس ملک کے احوال بھی سیاسی اور سماجی اعتبار سے اس کام کے پروپگینڈہ کے متحمل نہیں ہیں اور نہ ہی علی الاعلان تقابل وتفاضل کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ہاں! انفرادی طور پر ذہن سازی اور حکیمانہ دعوت ضرور مؤثر ہے اور ہو بھی رہی ہے۔ بقول مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ داعی میں اگر مزاج شناسی، موقع شناسی اور مردم شناسی (یعنی اشخاص واحوال پر گہری نظر) نہ ہو تو وہ اپنی محنت میں کامیاب نہیں ہوسکتا، بہر حال! آج بھی جو اللہ کے بندے انفراداً یا جماعۃً اس عظیم ومبارک کام کو حکمت ومصلحت اور اخلاص وللٰہیت کے ساتھ بغیر کسی تشہیر و پروپگینڈہ کے اور بغیر کسی تقابل وتفاضل، بحث ومباحثہ کے نہایت سادگی ودلسوزی سے انجام دے رہے ہیں وہ قابلِ تحسین بھی ہیں لائقِ تقلید بھی اور مستحقِ تعاون وتناصر بھی۔

ان کے برخلاف کچھ کوششیں مختلف گوشوں سے اب ایسی سامنے آ رہی ہیں جو حکمت و مصلحت، موعظت و نصیحت، تقاضہائے وقت اور ملکی و ملی مصالح سے مستغنی ہو کر کام کم پروپگینڈہ زیادہ کی صورت اختیار کر گئی ہیں ان تحریکوں میں بلا مبالغہ کروڑہا روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اور نتیجہ بظاہر اسقدر بھی نہیں ہے جتنا حکیمانہ و مخلصانہ خاموش محنت کرنیوالوں کو حاصل ہو رہا ہے۔ اور اگر اس سے کچھ فوائد حاصل بھی ہو رہے ہوں گے تب بھی نقصانات وخطرات ان فوائد سے کچھ کم نہیں ہیں بلکہ زیادہ ہی ہیں، اسکی وجہ اصلاً یہی ہے کہ کام کے طریقے اسلام کے اصول دعوت اور احکامِ تبلیغ کی روشنی میں اختیار کرنے کے بجائے اپنی عقل وفہم سے وضع کر لئے گئے ہیں۔ ان کاموں کے لئے حدودِ شرع سے واقف علمائے دین کی سرپرستی حاصل کی جاتی ہے اور نہ ہی توثیق وتصدیق کی ضرورت سمجھی جاتی ہے! نہ خود وہ حضرات دین کا اسقدر علم رکھتے ہیں جس سے اسلام کے مزاجِ دعوت اور حدود وقیود پر وقوف اور گہری نظر حاصل ہوتی ہے، جو کچھ انہیں معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ شخصی مطالعہ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں، انکا کل سرمایۂ علم "سیلف اسٹیڈی" اور "خود اعتمادی" ہے، یہ لوگ عام طور سے اسلام کے اصول وقواعد اور بنیاد ی باتوں کو جانے بغیر براہِ راست قرآن وحدیث تک پہونچ جاتے ہیں، وہ بھی کسی استاذ کے بغیر، جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ان کا علم قرآن وحدیث سے اخذ کردہ ہوتا ہے مگر اس کی تشریحات اپنی فہم کے مطابق ہوتی ہیں سلف کی تحقیق و توارث کے مطابق نہیں ہوتیں، اسی وجہ سے ان کے مفہوم اور شارع کے مقصود میں تضاد ہو جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب ان کا علم ان کے مفہومات ومزعومات ہیں تو انکی دعوت بھی اسی کی طرف ہوگی نہ کہ مقصودِ شارع کی طرف! **فافهم و تدبر !!**

اسی لئے اہلِ علم نے غیر مستند علم کو غیر معتبر سمجھا ہے، چنانچہ ان تحریکوں کے

مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ دیگر مذاہب کی کتب بالخصوص ہندو مذہب کے لٹریچر سے استدلال میں غلو کیا جارہا ہے، یہ چیز علمی بنیادوں پر لکھنے پڑھنے اور شخصی گفتگو کی حد تک تو پھر بھی چل سکتی تھی لیکن حدود سے ناواقف داعی، دین سے بالکل بے خبر عوام کے سامنے ان چیزوں کو اس طرح پیش کررہے ہیں گویا وہ قطعی طور پر آسمانی علوم ہیں اور ان کے قائلین واقعی موحد وخدا پرست تھے بلکہ انبیاء کرام میں سے تھے۔ اس بے احتیاطی کے نتیجہ میں "دینِ واحد" اور "وحدتِ ادیان" میں اشتباہ واختلاط پیدا ہوتا جارہا ہے، یہ اور بات ہے کہ ان حضرات کو اس موضوع کی حساسیت اور نزاکت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اس خطرہ کا احساس بھی نہیں ہے۔

اسی طرح بعض لوگ اس کام کو ایک دلچسپ مشغولیت کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں اور لوگوں کو محض مسلمان بنا کر چھوڑ دینے کو کافی سمجھتے ہیں، جبکہ خود ان کی اپنی زندگی بھی اسلام اور اسکی تعلیمات سے عملاً کوسوں دور ہے، بعض ایسے نوجوان داعیوں کو قریب سے دیکھنے پرکھنے کا موقع ملا کہ وہ ایک نرے فلسفہ کے طور پر اس کو اختیار کئے ہوئے ہیں، محض فلسفیانہ لکچر دیتے ہیں اور شخصی طور پر نماز روزہ تک کا اہتمام نہیں کرتے، نہ دین کی کما حقہ عظمت ان کے قلوب میں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی دعوت قبول کرنے والے بھی محض ایک فلسفہ کے طور پر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں منتقل ہوں گے اور عملی زندگی کی تربیت اور اصلاح وتقویٰ کی تعلیم نیز مابعد اسلام ان کے مواخاۃ ومدارات اور تکمیل حاجات کے نظم سے محروم ہونگے اور ہورہے ہیں۔

ایک صاحب کے ہاں دیکھا گیا کہ وہ بڑے فخر سے اسلام کی تبلیغ اور لوگوں کے مسلمان ہونیکی باتیں کرتے ہیں اور بڑے بڑے قابل تعلیم یافتہ لوگوں کے اپنے ذریعہ مسلمان ہونے کے واقعات سناتے ہیں مگر قریب سے دیکھنے والے متعدد لوگوں سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو حقیقی اسلام کی ہوا بھی نہیں لگتی ہے، یہ لوگ

آدھا تیتر آدھا بٹیر بنے ہوئے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں پوجا بھی کر لیتے ہیں، ذہنوں سے شرک کے جراثیم بھی نہیں نکلے اور تہذیبِ اسلامی سے محبت بھی نہیں پیدا ہوئی۔ غور کرنے اور ان میں سے ایک آدھ سے تبادلۂ خیال کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہ لوگ حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور اسلام کی صداقت سے متأثر نہیں ہیں صرف ان صاحب کی کرشماتی حرکات اور انوکھے کمالات کے مداح اور بھگت ہیں۔

ان سب سے جدا اور علاحدہ ایک تحریک بلکہ امت کے لئے ایک عظیم آزمائش جو "اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن" کے نام سے پہلے بمبئی میں قائم ہوئی۔ اور اب ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں اس کے اثرات پھیل رہے ہیں، یہ ادارہ جناب ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کے نام اور کام سے منسوب ہے ڈاکٹر صاحب اصلاً عصری تعلیم یافتہ آدمی ہیں، شروع میں جناب احمد دیدات صاحب مرحوم کی ردِ عیسائیت کی سرگرمیوں سے متأثر رہے اور اسی نسبت سے ان سے ملاقات اور غالباً صحبت وتربیت بھی حاصل کی، بعد ازاں اچانک اس مرتبہ پر پہونچ گئے کہ ایک "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" قائم کر کے بقول خود محققِ اسلام قرار پا گئے۔ چنانچہ اپنی تحقیقاتِ اسلامیہ کے ذریعہ اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں پہلے لکچرز دئے پھر مناظروں کا بازار گرم کیا۔

ڈاکٹر صاحب شروع شروع میں تو اپنے لئے اتنا کام ہی کافی سمجھتے تھے، دینی احکام اور مسئلے مسائل کو علماء کرام کا کام سمجھتے تھے، لیکن جیسے جیسے عوامی قبولیت حاصل ہوتی گئی اور بڑے بڑے خیراتی اداروں سے تبلیغ اسلام کے نام پر مالی تعاون کے دہانے کھل گئے اور کچھ چاہنے ماننے والوں کا حلقہ تیار ہو گیا تو اب خود کو دینِ اسلام کا حقیقی ترجمان اور منصبِ تحقیق واجتہاد پر براجمان تسلیم کر کے ہر کسی مسئلہ میں رائے زنی اور کتاب وسنت کی تفہیم وتشریح میں من مانی شروع کر دی ہے، اور عوامی

اسٹیج سے کسی بھی مناسب نامناسب سوال کا فوری جواب اوراس پر قرآن وحدیث سے کسی بھی طرح استدلال پیش کردیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی جماعت قوم وملت کا——خواہ عرب کا ہو یا عجم کا—— کروڑ ہا روپیہ ایک ایک پروگرام پر صرف کررہی ہے اوراسی مناسبت سے وصول بھی کررہی ہے،صرف تشہیر وپروپگینڈہ پر جس قدر رقم یہ لوگ صرف کرتے ہیں اگراس کا استعمال دیہات وقرایا میں جہاں عیسائیت وقادیانیت مسلمانوں کومرتد بنانے میں پوری قوت کے ساتھ مشغول ہے، صرف کرتے تو اس سے سینکڑوں گنا زائد لوگ ارتداد سے نکل آتے جتنا کہ اسلام کے نام سے اس نمائش کے ذریعہ اسلام میں داخل ہونے کے یہ لوگ امیدوار یا دعویدار ہیں۔ان پروپگینڈوں کے فوائد وہی حضرات جانیں کہ کیا ہورہے ہیں البتہ ان کے درجہ ذیل دوررس مضرات کو بہ نظر انصاف دیکھنے کی ضرورت ہے۔

(۱) ان کے پروگراموں کے انعقاد کے لئے دولت کا بےضرورت اور بے جا خرچ، جو اسراف وتبذیر کی بدترین حد کو پہونچ گیا ہے، جگہ جگہ اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے لیکن بمبئی کے حالیہ پروگرام نے اس فضول خرچی ونمائش کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔(۲) ضرورت سے زیادہ تشہیر وپروپگینڈہ۔(۳) جلسہ گاہ کی نوابانہ اور حد سے متجاوز تزئین وآرائش اور دولت کی نمائش جبکہ ان کا یہ مسرفانہ انداز غیر مسلم برادری، حکومت وانتظامیہ کے ذمہ داروں بالخصوص دشمنِ اسلام طاقتوں کیلئے سوالیہ نشان بن رہی ہے کہ آخر دولت کی اتنی فراوانی کہ حکمراں جماعتیں بھی اپنے پروگرام اس شاہانہ تزک واحتشام سے نہیں کرپاتیں،تبلیغِ اسلام کیلئے ان کے پاس کہاں سے ہورہی ہے؟ اور ظاہر ہے کہ اس کی زد غیر محسوس انداز میں اور خفیہ طور پر مسلمانوں کی معیشت پر پڑے گی، جس کا ماضی میں خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ (۴) نفسیاتی طور پر ہر آدمی اپنے مذہب سے اٹوٹ عقیدت و وابستگی اور جذباتی

لگاؤ رکھتا ہے اور مذہب کی شکست کو گوارا نہیں کر پاتا، آئے دن اس کا تجربہ ہوتا ہی رہتا ہے، آج کل دعوتِ اسلام کے نام پر ''ڈیبیٹ'' کے انگریزی عنوان سے مناظروں کا جو بازار گرم کیا جارہا ہے، جس میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ بڑے جوش وخروش سے حصہ لے رہا ہے، اس کو اسلام کی فتحِ مبین تصور کررہا ہے اس میں اس کا کوئی خیال نہیں کیا جارہا ہے کہ جب دو مذاہب کے پیشوا آپس میں مباحثہ کرینگے، دیکھنے سننے والوں میں دونوں مذہب کے پرستار موجود ہوں گے، ادھر یہ بھی طئے ہے کہ فتح مسلمان ہی کی ہوگی کیوں کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، تو ایسے ماحول کا حاضرین پر جو تأثر ہوگا وہ یہ ہے کہ مسلمان فاتحانہ مسکراہٹوں اور نعرہ تکبیر کی گونجوں کے ساتھ غیر مسلموں کی جانب دیکھ دیکھ کر مسرور ہورہے ہوتے ہیں، اور غیر مسلم مسلمانوں، پریس رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی موجودگی میں اپنی شکست و ہزیمت کے تأثر اور اپنے پیشوا کی بے بسی و بے عزتی کے منظر سے شرمندہ وسرنگوں ہورہے ہوتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ وقتی طور پر بات رکھنے کی حد تک مسلمان مناظر کے سامنے رواداری وشکر گذاری کا اظہار کر لیتے ہیں مگر قلوب ضد وتعصب اور نفسیاتی دباؤ کے شکار ہوتے ہیں، نفرتوں کی دیوار مضبوط اور دوریوں کا سلسلہ مستحکم ہوتا جاتا ہے، چنانچہ میں نے ایک ایسے ہی پروگرام کی صدارت کرنیوالے ـــــ عصری علوم اور عوامی خدمت کے اعتبار سے ایک قابلِ قدر بزرگ ـــــ سے پوچھا کہ اس پروگرام میں اخبار کی اطلاع کے مطابق مسلم مناظر فتح پا گیا اور عیسائی مناظر لاجواب ہو کر شکست کھا گیا تھا، لیکن یہ بتائیے کہ اس پروگرام کا نتیجہ کیا نکلا؟ تو انھوں نے بڑے مسرت آمیز انداز میں کہا کہ عیسائیوں نے اسی ہال میں پروگرام کے فوراً بعد اپنے فادر کو پیٹنا شروع کردیا! میں نے پوچھا کہ وہ لوگ اپنے فادر کو کیا اسلئے پیٹ رہے تھے کہ تو نے اب تک حق کیوں نہیں بتلایا اور ہمیں

حق سے کیوں محروم رکھا؟ اور یہ کہ ہم اب مسلمان ہو جاتے ہیں؟ تو کہنے لگے نہیں! یہ کہکر نہیں پیٹ رہے تھے بلکہ یہ کہہ رہے تھے کہ تو نے عیسائیت کی طرف سے صحیح جواب کیوں نہیں دیا، اور کیوں ہمیں ذلیل کیا؟ میں نے کہا، اسکا مطلب یہ ہوا کہ مناظرہ میں مناظرِ اسلام کی فتح کے بعد بھی وہ اپنے ہی دین کو برحق سمجھ رہے تھے اور صرف یہ تأثر لیکر جا رہے تھے کہ ان کا مناظر لائق نہیں تھا اسلئے مقابلہ نہ کرسکا، تو سوال یہ ہے کہ اس پورے پروگرام کا فائدہ بجز مسلمانوں کو خوش کرنے کے اور کیا نکلا؟

اسی طرح میں نے بنگلور کے ایک ڈیبیٹ میں —— جس کا عنوان تھا "خدا تعالیٰ کا تصور اسلام میں کیا ہے اور ہندوازم میں کیا ہے" اسلام کی طرف سے ڈاکٹر صاحب اور ہندوازم کی جانب سے کوئی ہندو اسٹیج پر مدعو تھے —— شریک ہونے والے بعض مسلمانوں سے تأثرات معلوم کئے تو انہوں نے کہا کہ "ہندوؤں کو توحید کی حقیقت سمجھ میں آئی یا نہ آئی انہیں معلوم، مگر سنی گئی باتوں سے اندیشہ ہے کہ مسلمان شرکاء، جن کی اکثریت خود اپنے مذہب کی بنیادی باتوں سے تک بے خبر تھی وہ وسوسوں اور شکوک کی شکار نہ ہوگئی ہو، ہمارا تأثر ایسا ہی رہا" واقعہ یہ ہے کہ یہ مباحث عوامی اجتماع میں کئے جانیکے ہرگز نہیں ہیں اس سے فکروں کا انتشار اور شکوک کا انفجار یقینی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ضرورت کے مواقع پر اسلام نے "جدالِ حسن" کی گنجائش رکھی ہے، لیکن کیا ان پروگراموں کے انعقاد کیلئے کوئی ضرورت پیش آئی ہے؟ اور کیا علماءِ امت نے اسکے مفید ہونیکی توثیق کردی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی ہی میں ہے! دیکھئے جب انگریز اور آرین قوم ہندوستان میں ارتداد کی تحریکیں چلا رہی تھیں، اور کھلے عام مسلمانوں کے علماء کو مناظرہ و مقابلہ کیلئے چیلنج کر رہی تھیں تو ہمارے علماء مثلاً مولانا نانوتویؒ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا رحمت اللہ

الکیرانویؒ وغیرہ نے ان کے چیلنجس کو قبول کیا اور ڈٹ کر ان سے مجادلہ کیا، مگر یہ سب ان کی ضد اور دعوت پر کیا گیا، خود اپنی طرف سے عوامی اور ہمہ مذہبی جلسے کر کے مذہبوں کی بیخ کنی کی کوششیں نہ اس سے پہلے پسند کی گئیں اور نہ اس کے بعد! اسلئے کہ ضرورت کے مواقع کو مستثنیٰ کر کے خود ہی اپنی طرف سے ہمہ مذہبی عوامی اجتماع کرنے اور اس میں ان کے مذاہب کے باطل و بے حیثیت ہونے کو ثابت کرنے کا نتیجہ ان کے حق کی طرف مائل ہونے سے زیادہ نفسیاتی طور پر ضد وتعصب میں اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۵) اس قسم کے خطابات میں باوثوق شرکاء سے سنا گیا ہے کہ باتوں باتوں میں علماء کرام انکی دینی خدمات بالخصوص ان کے قدامت پسندانہ مزاج اور دین کے متواتر ومتوارث عقیدہ وعمل کے ساتھ ان کے تصلب وپختگی پر پھبتیاں بھی اڑائی جاتی ہیں، کیونکہ جو لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی گرفت کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں انہی کے کردار کو مسخ ومجروح کر دیا جائے تو عوام الناس کا ان پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور عوام ان علماء کی تنقیدوں پر توجہ نہ دیں گے اور ان کی پکار صدا بصحراء ثابت ہو، اور اس سلسلہ میں تو کسی خاص شخص کا کیا ذکر؟ جتنی تحریکیں اہل السنۃ والجماعت کے معتبر ومتوارث طریق سے ہٹ کر وجود میں آتی رہتی ہیں ان سب میں قدر مشترک خصوصیت یہی ملے گی کہ وہاں علماءِ امت اور انکی قابلِ قدر وقیع دینی خدمات اور بلند ترین علمی مقامات کا نہ صرف انکار کیا جاتا ہے بلکہ ان کا استہزاء کیا جاتا ہے اور ایسے تبصرے وفقرے کہے جاتے ہیں جن سے عوام الناس ان سے دور ونفور ہو جائیں۔

(٦) ہندوستان ایک ہمہ مذہبی ملک ہے اس میں تمام اقوام کو مذہب کی آزادی دستوری طور پر حاصل ہے جس کی بدولت الحمدللہ یہاں دعوت کا میدان کھلا

ہوا ہے، اگر حکیمانہ و مدبرانہ راستے اسکے لئے اختیار کئے جائیں، خیر خواہی، محبت اور دلسوزی و تڑپ کے ساتھ انفراداً یا خصوصی محفلوں کے ذریعہ ان کے سامنے صداقتِ اسلام کو واضح کر کے اور آخرت کی حقیقت کو اجاگر کر کے وہاں کی ناکامی سے بچانے کی فکروں کا مظاہرہ کرتے ہوئے دعوت کا کام کیا جائے تو امید افزا صورتحال سامنے آسکتی ہے۔ اور اگر اس آزادیٔ دعوت کا استعمال اسطرح کیا جائے کہ ہزاروں لاکھوں پر مشتمل ہندو مسلم یا کرسچن مسلم اجتماع میں دو پیشوایانِ مذہب باہم بحث و مباحثہ کریں، اور انمیں سے ایک کو شکست ہو جائے۔ (اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام کو تو ہوگی نہیں لازماً دوسرے مذہب کو ہوگی)[1] تو اس طریقۂ کار سے ایک طرف ہزیمت و ندامت خوردہ عوام میں نفرت و تعصب کا بیج پیدا ہوگا دوسری جانب وہ سیکولر غیر مسلم ——— جو مسلمانوں کی دینی و ملی مساعی میں مداخلت کو پسند نہیں کرتے، بلکہ ضرورت کے مواقع پر مسلمانوں کی حمایت کو ترجیح دیتے ہیں ——— وہ بھی عصبیت جاہلیہ کے شکار اور مذہبی جانبداری کا رویہ اختیار کرنے لگیں گے، جس کے نتیجہ میں بحیثیت مجموعی مسلمانانِ ہند کے لئے آزمائشوں کے دروازے کھل سکتے ہیں ...... یہی وجہ ہے کہ انتہاء پسند ہندو تحریکوں کے مضر اثرات سے سماج کو بچانے اور خود مسلمانوں اور اسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ملک کے خاص ماحول میں جو تحریک "پیامِ انسانیت" کے نام سے چلائی تھی، اس میں عوامی اجتماعات اور مشترکہ پلاٹ فارم سے امن پسند ہندوؤں کے ذریعہ احترامِ انسانیت اور فوائدِ امن کے پیغام تو عوام الناس تک پہونچواتے تھے مگر مذاہب کے تقابل و تفاضل کا موضوع نہیں چھیڑتے تھے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو اسلام کی حقانیت ثابت کرنا نہیں آتا تھا بلکہ صرف اسلئے کہ عوامی اجتماعات ان

---

[1] یہ بھی ذہن میں رہے کہ ایسی محافل میں شکست و فتح کا فیصلہ اصلاً سامعین کے تاثر پر مبنی ہوتا ہے، اور علم و فہم کی کمی کی وجہ سے یا بات کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے بہت ممکن ہے کہ ان کے تاثر میں مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم ہی کامیاب ہے۔

بحثوں کے متحمل نہیں، اس کا نقصان، نفع سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ خود مولاناؒ، دعوتِ ایمان لے کر بڑی بڑی شخصیتوں اور" ائمۃ الکفر" تک پہونچتے تھے حتیٰ کہ "سائی بابا" اور" امبیڈکر" کے گھر پہونچکر بھی خلوت میں پوری طرح پیغامِ اسلام پہونچانے کا حق ادا فرمایا۔ مگر اس کے پروپگینڈہ کو مناسب نہ سمجھا **فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء**

واضح رہے کہ میں کسی اچھے کام کی مخالفت کی بات نہیں کر رہا ہوں صرف طریقِ کار کے حسن و قبح سے متعلق گفتگو کر رہا ہوں۔ غور کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کا یہ طریقِ کار اسلام اور مسلمان دونوں کے لئے مستقبل میں حد درجہ خطرناک اور نقصان دہ ہی معلوم ہوتا ہے، گو وقتی طور پر دیکھنے میں ایک اچھا مشغلہ اور دلچسپ مذہبی میلہ نظر آتا ہے اور جرأتِ ایمانی و دعوتِ اسلامی کا مظاہرہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ عوام الناس اور جدید تعلیم یافتہ وعصری علوم سے وابستہ ایک بڑا طبقہ، انگریزی زبان اور مغربی طرزِ محاضرات استعمال کرنے کی وجہ سے ان پروگراموں کا مداح اور شائق ہوتا جارہا ہے، یہ طبقہ ایک اعتبار سے معذور بھی ہے کہ ان کے پاس دین کا نہ پورا علم ہے اور نہ وہ جوش و ہوش کے فرق کو محسوس کرتے ہیں۔ انہیں تو اپنی سمجھ کے موافق زبان و بیان میں کچھ سننے سمجھنے کا موقع مل رہا ہے اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔

(۷) سب سے بڑا نقصان جو اس تحریک اور اس طرزِ تبلیغ سے سامنے آرہا ہے وہ اس کام سے وابستہ لوگوں بالخصوص نوجوانوں میں آزادیٔ فکر و عمل کا فتنہ ہے، ان کے ماننے والے مغربی تہذیب کے مشابہ لباس اختیار کرتے ہیں، اور اسلام میں لباس کے کسی امتیاز کے قائل نہیں ہیں، حتیٰ کہ ان کے اسکولوں میں پڑھانے والے بعض اساتذہ سے معلوم ہوا کہ حفاظ وعلماء جو قرآن و دینیات پڑھانے پر مامور ہیں انہیں بھی اسی طرز اور وضعِ مغربی اختیار کر کے آنے کا پابند کیا جاتا ہے۔

اس آزادیٔ فکر وعمل کے نتیجہ میں یہ طبقہ علمائے دین کو ترقیٔ دین کے راستہ میں رکاوٹ سمجھنے لگا ہے، اور بنیادی علوم کے بغیر براہِ راست و بلا استاذ قرآن وحدیث کے مطالعہ کے سلسلہ میں سلفِ صالحین کی احتیاط، اور اس کے مضر ہونیکی بات کو برہمنیت اور مذہب پر اجارہ داری سے تعبیر کرنے لگا ہے۔ چنانچہ جتنی عقلیں ہیں اتنے دین بنتے جارہے ہیں، اور اللہ کا دینِ حقیقی چودہ سو سالہ متوارث شکل سے نکل کر ایک جدید صورت اور ناقص تصور کے ساتھ وجود میں آرہا ہے۔ ان کے خیال میں مسئلے مسائل یعنی فقہ اسلام مولویوں کی پیداوار ہے جبکہ دین تو بس قرآن و حدیث ہے، ان سے استفادہ کیلئے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن سب کے لئے اتارا ہے، صرف مولویوں کے لئے نہیں، یہ اور اس جیسی بے شمار ہفوات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور کوبہ کو سننے اور دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

خصوصاً عوام الناس کو ان تحریکوں کے ذریعہ تقلید کے بے ضرورت بلکہ دین کیلئے مضر ہونے —— جس کے بارے میں خود مبصر ومدبر غیر مقلد علماء نے بھی صراحت کردی ہے کہ لاعلمی یا کم علمی کے ساتھ ترکِ تقلید گمراہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے —— کا جو سبق پڑھایا اور پختہ کرایا جارہا ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان حضرات کو اور ان کے بڑوں کو آزادی کی کس حد، اور گمراہی کی کس انتہاء پر قوم کو پہونچانے کے بعد احساسِ زیاں ہوگا؟ پھر اگر اس وقت ہوگا بھی تو کیا فائدہ ہوگا؟ اس وقت اسلام بزبان حال کہہ رہا ہوگا ؎

کی میرے قتل کے بعد توبہ اس نے جفا سے
ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس سلسلہ میں اپنے اور بہت سے علماء کرام کے تجربات کی روشنی میں ان جدید

دعوتی تحریکوں کے خوشنما بیانروں تلے جو غیر دانشمندانہ سرگرمیاں دین کے اساسی وحقیقی ڈھانچہ کے تباہی کا سبب بن رہی ہیں، ان پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر مضمون کی طوالت اور اپنے سامنے موجود دیگر اہم مصروفیات کے مدنظر اسی پر اکتفاء کرتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر علماء کے نزدیک بھی اگر یہ اندیشے صحیح ہیں تو اس صورتحال کا سنجیدہ نوٹس لیں گے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں انکی اصلاح کی جانب کوئی قدم اٹھائیں گے، اور اگر ان کے علم کے مطابق راقم سطور کے یہ تأثرات وتجربات اور انکی روشنی میں ظاہر کئے گئے خدشات وخطرات صحیح نہیں ہیں تو ان کا علم ہو جانے کے بعد میں اپنی کوتاہی فہم کے اقرار کے ساتھ رجوع کرلوں گا۔ مقصد کسی تحریک سے بغض وعناد نہیں قوم وملت کے نقصان کا احساس ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب. وما توفیقی الا باللّٰہ علیه توکلت والیه انیب

نماز میں حضورِ قلب کے اسباب

علامہ ابنِ قدامہ حنبلیؒ کے ایک مضمون سے ماخوذ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین اما بعد !

جہاں تک نماز کا تعلق ہے تو وہ دین کا ستون اور نیکیوں کی سردار ہے، نماز کے فضائل بے شمار احادیث میں وارد ہوئے ہیں، جو مشہور و معلوم ہیں۔ البتہ نماز کے بہت سے آداب بھی ہیں جن کے اہتمام سے نماز حقیقت میں نماز ہو جاتی ہے اور انھیں ترک کر دینے سے ایک جسدِ بے روح کی مانند رہ جاتی ہے، نماز کے اندر جان پیدا کرنے والے اُن آداب میں سے ایک ادب خشوع و خضوع کا پیدا کرنا ہے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے فرض نماز کا وقت ہوتے ہی اچھی طرح وضو کیا اور رکوع و سجود کو اہتمام سے ادا کیا اور اس میں خشوع کا التزام رکھا تو وہ نماز بلا شبہ اس کے لئے اب تک کئے گئے عام گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے بشرطیکہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔ اور یہ کسی خاص نماز یا خاص موقعہ کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر نماز کی یہی خصوصیت ہے۔“

ان ہی سے ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے دو رکعت نماز اس اہتمام سے پڑھی کہ اس میں حدیثِ نفس کو شامل ہونے نہ دیا تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔“

انہی بشارتوں کی وجہ سے صحابہ کرام ؓ نماز میں خشوع وخضوع اور حضورِ قلب کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ احادیث میں اس کے بہت واقعات ملتے ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ ابنِ زبیرؓ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو خشیتِ خداوندی سے ان کا حال یہ ہوتا تھا گویا کہ وہ ایک لکڑی کا ستون ہیں اور جب سجدہ فرماتے تھے تو پرندے انھیں دیوار سمجھ کر ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے تھے، ایک دن حطیم میں نماز ادا فرمارہے تھے کہ ان کے سامنے سے ایک پتھر آیا اور ران کے کپڑوں میں گر گیا لیکن وہ اس جانب متوجہ بھی نہ ہوئے۔

حضرت میمونؒ بن مہران فرماتے ہیں کہ میں نے مسلم بن یسارؒ کو کبھی نماز میں دوسری طرف توجہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ مسجد کا ایک حصہ گر پڑا جس کی آواز سے بازار کے لوگ گھبرا گئے، وہ اسی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے مگر نماز میں اتنے محو ومگن تھے کہ انہیں اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔

حضرت علیؒ بن حسینؒ جب وضو فرماتے تھے تو چہرہ کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا کسی نے عرض کیا کہ وضو کے وقت آپ کا یہ کیا حال ہوجایا کرتا ہے؟ فرمایا تم جانتے نہیں کہ میں کس کے سامنے کھڑے ہونے جارہا ہوں؟

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلفِ صالحین نماز کے فریضے کو بہت اہتمام اور غایتِ توجہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرتے تھے، اور جیسے ہی نماز کا ارادہ اور اس کی تیاری شروع کرتے ان کے دل ودماغ میں حق تعالیٰ شانہ کی کبریائی کا استحضار غالب ہوجاتا تھا، اور کیوں نہ ہوتا؟ جبکہ نماز ہے ہی دربارِ الٰہی میں باریابی کا نام! لیکن پچھلے لوگوں کے برخلاف آج ہماری نمازوں کا حال یہ ہیکہ وہ ایک معمول ہے جسے عادتاً نمٹا لیا جاتا ہے، جیسا کہ کھانے پینے کا ایک معمول ہوتا ہے وقت ہوتے ہی اس کا تقاضہ بھی ہوتا ہے اور کسی طرح اس تقاضے کو نمٹا بھی لیا جاتا ہے،

حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ بہت اہتمام اور ذوق وشوق سے ایک فریضہ اور دربارِ الٰہی کی حاضری سمجھ کر پڑھنا چاہئے ، پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نمازیں بھی حقیقی نماز بن جائیں ، اور ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جائیں تو اس کے لئے چند چیزوں کا اہتمام کرنا ضروری ہوگا ، ذیل میں اسی کی تفصیل کی جارہی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ نماز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ! یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ایک جسم ہے ایک روح ! نماز کا جسم یا ظاہر شرائط فرائض اور واجبات وسنن وغیرہ کی تکمیل کرنا ہے اور اس کی روح یا باطن نیت کی تصحیح عاجزی واخلاص اور حضوریٔ قلب کا حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر الفاظ مافی الضمیر کی صحیح تعبیر نہوں تو وہ ہذیان اور بے معنی گفتگو کہلائے جاتے ہیں ، اسی طرح حرکت وعمل بغیر حضورِ قلب کے محض حرکت ہوں تو ان سے بھی کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ مثلاً قیام کا مقصد اصل میں جذبۂ خدمت کا اظہار ہے اور رکوع وسجود سے اپنی ذلت اور مالک کی بڑائی کا اعتراف ہے ، اب اگر قیام ورکوع وسجود محض ظاہری حرکات ہوں اور ان میں حضورِ قلب اور وہ جذبات جو ان حرکات سے مقصود ہیں مفقود ہوں موجود نہ ہوں تو بس صورتِ نماز رہ جائے گی اور صورت کا کوئی اعتبار نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”لَنْ یَنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلاَ دِمَائُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ“

(سورہ حج: ۳۷) اللہ تعالیٰ کے پاس ان (قربانیوں) کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ صرف تمہارا التقویٰ یعنی ایمان واخلاص پہنچتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اعمال میں اللہ تعالیٰ تک پہونچنے والا جو جز ہے وہ بس یہی وصف ہے ، جو قلب ودماغ پر اس درجہ غالب ہو کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی تکمیل تک پہونچادے ، پس معلوم ہوا کہ نماز میں حضورِ قلب اور خشوعِ نفس نہایت

ضروری امر ہے، لیکن چونکہ اس کے حصول میں معتد بہ وقت اور خاصی محنت لگتی ہے اسلئے شریعت نے اس مسئلہ میں غفلت سے تسامح اور رعایت کا معاملہ فرمایا ہے، اسی لئے علماء فرماتے ہیں کہ حضورِ قلب اگر نماز کے آغاز میں بھی موجود ہو تو وہ حکم میں اخیر تک باقی رہے گا، البتہ اس مرتبے و مقام کو حاصل کرنے کے لئے چند باتوں کے اہتمام سے بڑی مدد ملتی ہے۔

۱۔ حضورِ قلب :- جیسا کہ ابھی ہم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور حضورِ قلب کا مطلب یہ ہے کہ دل کو ایسے خیالات اور وساوس سے محفوظ رکھے جو اسے دوسری جانب متوجہ کرتے ہوں، اس کے حصول کا ذریعہ ہمت کا استعمال کرنا ہے، اس لئے کہ جس چیز کی ہمت ہوتی ہے لامحالہ دل اس جانب زیادہ توجہ کرتا ہے، اور یہ ہمت کا استعمال کرنا آخرت کے باقی اور دنیا کے فانی ہونے کے عقیدہ کی پختگی کے مطابق کم زیادہ ہو جاتا ہے، اس لئے اگر آپ محسوس کریں کہ نماز میں جی نہیں لگ رہا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نتیجہ ہے ایمان کی کمزوری کا پس فوراً ایمان کو مضبوط کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

۲۔ جو کچھ پڑھا جا رہا ہے اس کے معنیٰ و مفہوم کو ذہن میں رکھنا :- استحضارِ قلب کیلئے یہ بڑی اہم چیز ہے، کیوں کہ بعض مرتبہ دل صرف الفاظ کی صحت و درستگی میں منہمک و مصروف ہو جاتا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کو دوسری جانب متوجہ کرنے والے خیالات اور اسباب کو ختم کرتے ہوئے الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی جانب بھی متوجہ رکھا جائے۔

اور خشوع میں خلل ڈالنے والے اسباب دو طرح کے ہیں۔ ظاہری اور باطنی، ظاہری اسباب آنکھوں اور کانوں سے متعلق ہیں اور باطنی اسباب جو کہ اس سے بھی اہم ہیں ذہن سے متعلق ہیں۔ مثلاً ھموم و غموم کی کثرت، مختلف دنیوی افکار و

اشغال کا غلبہ، اس لئے کہ جب طرح طرح کی الجھنیں ذہن میں ہوتی ہیں تو وہ کسی ایک عنوان پر قائم نہیں رہ پاتا ہے ایسی صورت میں تو نگاہیں نیچی رکھنا بھی خشوع کے حصول کیلئے کافی نہیں ہوتا کیوں کہ دل میں پھیلے ہوئے خیالات اس کو اذکارِ نماز اور اسکے معنیٰ کے استحضار سے محروم کر دیتے ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ظاہری اسباب سے حفاظت کیلئے تو سب سے پہلے اپنی نگاہ کو سجدہ کی جگہ پر مرکوز کر لے اور قبلہ کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہو جائے اور نقش ونگار کی چیزوں کی طرف اُٹھنے سے اپنی نظر کو بچائے۔ اور ایسی جگہ نماز نہ پڑھے جہاں اطراف میں پھیلی ہوئی چیزیں اس کی حس کو اپنی طرف مائل کرتی ہوں، چنانچہ خود نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب ایک خاص قسم کے کپڑے پر کہ جس پر نقش نگار تھے نماز پڑھی تھی تو اسے ہٹا دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ”قریب تھا کہ اس کی وجہ سے میری نماز ٹوٹ جاتی“۔

اور جہاں تک باطنی اسباب سے بچنے کا تعلق ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ نفس کو زبردستی ان اذکار کی طرف متوجہ کرے جو نماز میں پڑھی جارہی ہیں اور اس کے علاوہ میں لگنے سے جبراً بچاتا رہے اور اس کے لئے نماز شروع کرنے سے پہلے تیاری کرے، مثلاً نماز سے کچھ پہلے ہی مصروفیات ترک کر دے، اور دل کو خیالات سے فارغ کر دے اور نفس کو آخرت کے مسائل، خدا کے سامنے کھڑے ہونے کے مناظر اور قبر وحشر کے دردناک مراحل یاد دلاتا رہے اس کی برکت سے انشاء اللہ نماز میں یکسوئی وتوجہ حاصل ہو جائیگی۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی ہیبت:۔ یہ صفت دو باتوں کے اہتمام سے حاصل ہو جاتی ہے، ایک اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور اس کی عظمت کی معرفت دوسرے نفس کے حقیر وذلیل اور غلام ہونے کی معرفت۔ ان دونوں باتوں کی

کماحقہ معرفت حاصل ہوجائے تو اس کے ذریعہ سے دو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ عاجزی اور بندگی، پھر نمازی کو جس طرح نماز کی کوتاہی پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے اسی طرح اس کی ادائیگی پر اللہ تعالیٰ کی عنایت وشفقت کا امیدوار بھی ہونا چاہیے، نمازی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نماز کے ہر عمل اور ہر ظاہری رکن کی ادائیگی کے وقت اپنے قلب و باطن کو بھی متوجہ رکھے، مثلاً جب اذان کی آواز سُنے تو فوراً اس بلاوے اور پکار کو ذہن میں مستحضر کرلے جو قیامت کے دن اس کو دی جائیگی، یہ بھی تازہ کرلے کہ کس طرح وہ جواب دے گا اور کس حالت میں اللہ کے سامنے حاضری ہوگی، پھر جب اپنے کپڑے پہن رہا ہوتو تصور کرے کہ کپڑے بدن کے مخفی حصوں اور قابلِ شرم اعضاء کو مخلوق سے چھپانے کے لئے پہنے جاتے ہیں، میرے باطنی امراض اور بُرائیاں جونہایت قابلِ شرم ہیں جس پر خالق تعالیٰ مطلع ہے اور میں کسی کپڑے کے ذریعہ خدا کی نظر سے اسے چُھپا نہیں سکتا سوائے اس کے کہ ندامت حیا اور خوفِ خدا میرے اندر آجائے اور اس کے ذریعہ سے یہ بُرائیاں محو ہوجائیں اور مٹ جاویں۔

اسی طرح جب قبلہ کی طرف رُخ کرے اور سب طرف سے اپنا منہ موڑ لے تو اس کا خیال رکھے کہ دل کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا اس سے بھی اہم اور ضروری ہے پس جس طرح دوسری سمتوں سے چہرہ ہٹائے بغیر اس کو قبلہ کی طرف کرنا ممکن نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل کو مشغول کرنا اور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ غیر اللہ کی محبت سے خالی نہ ہوجائے۔

پھر جب تکبیر کہے تو اس کا خیال رکھے کہ کہیں اس کا دل اس کی زبان کی مخالفت نہ کررہا ہو اس لئے کہ اگر دل میں کسی اور چیز کی اہمیت اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہوگی تو زبان کا ''اللّٰــــہ اکبر'' کہنا ایک جھوٹا دعویٰ ہوگا، پس اپنی خواہشات کو

اللہ تعالیٰ سے بھی بڑا سمجھنے سے بچے، اور اس سے بچ جانے کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی خاطر اپنی خواہشات کا ایثار کرے۔

پھر جب **اعوذ باللّٰہ** پڑھے تو سوچے کہ تعوذ کے معنی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں جانے کے ہیں، اگر میرا دل اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں نہیں ہے تو پھر یہ میرا کلام فضول اور بے معنی ہو گیا، اسی طرح جو کچھ پڑھا جا رہا ہے اس کے معنی کا بھی دھیان رکھے۔ مثلاً ''**الحمد للّٰہ رب العالمین**'' کہتے وقت قلب میں رب العالمین کا استحضار اور ''**الرحمن الرحیم**'' کے وقت اس کی مہربانیوں اور احسانات کا تصور'' **مالک یوم الدین** '' کہتے وقت اس کی عظمت اور بزرگی کا احساس رہے اسی طرح پوری تلاوت کے دوران مفہوم و مطالب کو مستحضر رکھے۔

حضرت زرارہ بن ابی اوفیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ نے جب نماز میں یہ آیت تلاوت کی ''**فاذا نقر فی الناقور** '' تو اسی وقت گر پڑے اور جان بحق ہو گئے، اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ آیت کو زبان سے تلاوت کرتے وقت قلب میں اس دن کا تصور آ گیا اور وہ روزِ محشر کے منظر کی تاب نہ لا سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری نمازوں کے ظاہر و باطن دونوں کو دُرست فرمائے۔ اور انہیں ہمارے لئے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

باسمہ تعالیٰ

ریاستِ گوا............حال دیدہ وشنیدہ

یہ حالات تقریباً پندرہ سال قبل کے ہیں، اب حالات دینی ودنیوی ہر اعتبار سے کافی بدل چکے ہیں، پہلے کے مقابلہ میں علماء کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے، دعوت کے کام میں بھی اضافہ ہوا ہے، کئی مسجدیں تعمیر ہوچکی ہیں، مدارس بھی قائم ہیں، اوراسی کے ساتھ آزادیٔ فکراور شخصی آراء وافکار پراعتماد کا فتنہ بھی دکھائی دے رہا ہے، سب سے بڑھ کر دکھ کی بات یہ ہے کہ ریاست اوراس کے متصل کرناٹک کے علاقوں میں جماعت المسلمین کا فتنہ دن بہ دن بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے، اللہ ہی اپنی قدرت سے مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین

پچھلے دنوں ۲۴رتا ۲۹ر اگست ۹۴ء "مسلم اسوسی ایشن پونڈا" کی دعوت پر گوا جانے کا اتفاق ہوا، اس سے قبل بھی ڈسمبر ۹۳ء میں اسی اسوسی ایشن کی خواہش پر مختصر وقت کیلئے جانا ہوا تھا، اصل میں یہاں ایک مسجد کی نشأۃِ ثانیہ تھی اسی کی سنگِ بنیاد کی تقریب میں پہلی دفعہ، اور ایک مرحلہ کی تکمیل پر دوسری دفعہ مقامی احباب نے دینی اجتماع کا نظم کر کے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس بہانے اس چھوٹی سی ریاست اور وہاں کے باشندوں کی مذہبی وتہذیبی صورتحال کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا۔ انہی مشاہدات ومحسوسات کو مختصراً ذیل میں درج کررہا ہوں۔ کیونکہ ان میں اگر کچھ معلومات ہیں تو "بہت کچھ" عبرت وموعظت بھی ہے۔

گوا: اب ہندوستان کی مستقل ریاست ہے۔ پہلے مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں شامل تھا اوراس سے قبل پرتگالی عیسائیوں کے زیرِ نگیں رہا۔ ہندوستانی افواج نے غالباً ۱۹۶۳ء میں برائے نام مزاحمت کے بعد ان کے قبضہ سے چھین

لیا تھا، جس طرح برطانوی عیسائیوں نے" ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے تجارتی تعلقات قائم کر کے دھیرے دھیرے اپنے قدم مضبوط اور" بہادر شاہی حکومت" کی جڑیں کھوکلا کی تھیں، اسی طرح پرتگالی عیسائیوں نے اس علاقہ میں کاروباری اغراض سے داخل ہوکر آہستہ آہستہ بغاوت شروع کردی اور بالآخر" عادل شاہی حکمراں" کو بے دخل کر کے اپنا غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں مسلمانوں کو جس قدر اپنوں سے نقصان پہونچا ہے اتنا کسی اور سے نہیں پہونچا۔ مجھے وہاں کے بڑے بوڑھے لوگوں نے اپنے آباء واجداد کے حوالوں سے یہ بات بتلائی کہ جب پرتگالیوں نے ملک پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، اس وقت وہاں کی ہندو قوم نے تو ان کی غلامی تسلیم کر لی، بلکہ بہت سے لوگ اپنا مذہب بدل کر عیسائی بھی ہوگئے، مگر ان کے مقابلے میں جیالے اور غیرت مند مسلمان ان غیر ملکی ظالموں کو اپنا حکمراں ماننے کسی طرح تیار نہیں ہوئے بلکہ انہیں بھگانے اور ملک کو ان سے واپس لینے کیلئے ہر قربانی دینے کو آمادہ وتیار تھے، مگر شومیٔ قسمت کہ کچھ تو چاپلوس اور ضمیر فروش مسلمانوں نے اور کچھ ہندؤوں نے ملکر ان انگریزوں کو مشورہ دیا کہ مسلم قوم یوں دبنے اور خاموش رہنے والی قوم نہیں ہے، اگر تمہیں ان سے اور ان کے مقابلے سے محفوظ رہنا ہے تو ان کا قتلِ عام کرو اور ان کے مذہبی وتہذیبی آثار کو مٹا دو۔

اس مشورہ کے بعد پُرتگالی فوج کو مسلم کشی کا حکم دیا گیا، اور اس کے ساتھ ہی علاقہ میں چاروں طرف مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا گیا، بربریت اور وحشت کا وہ بازار گرم کیا گیا کہ پناہ بخدا! جمعہ کے دن بھری مسجدوں میں گھس کر قتل عام کیا گیا اور صرف نمازیوں ہی کو نہیں مسجدوں تک کو شہید کر دیا گیا، اسلامی آثار واملاک کو مٹا دیا گیا، جو مسلمان بچ رہے وہ خوف ودہشت کی بنا ترک وطن پر مجبور ہو گئے

اور جو مسجدیں رہ گئیں انہیں چرچ بنا دیا گیا ۔صرف شہر پونڈا جہاں ہمارا قیام تھا،معلوم ہوا کہ اس میں ستائیس مسجدیں تھیں جن میں سے اب صرف ایک مسجد "مسجدِ صفا کدل" کے نام سے باقی ہے۔ جسے دیکھ کے آنکھیں ٹھنڈی کرنے اس کے اطراف کے تاریخی کھنڈروں سے عبرت حاصل کرنے اوراسمیں موجود نمازیوں کے ساتھ مختصر دینی مذاکرہ کا مجھے شرف حاصل ہوا۔اور جس مسجد کے سنگِ بنیاد کا شرف مقامی مسلمانوں نے اپنے حسنِ ظن سے مجھے عطا کیا ہے، خود یہ مسجد بھی پرتگالی ظالموں کے ہاتھوں شہید شدہ ہے ۔مسجد کے ذمہ داروں نے بتلایا کہ تعمیر کیلئے کھدوائی کے دوران مسجد کی قدیم چوکی اورحوض وغیرہ کے آثار بھی ظاہر ہوئے، نیز سڑک کی دوسری جانب خرید کردہ پلاٹ پر جب ایک صاحب نے اپنے کامپلکس کیلئے کھدائی کروائی تو وہاں بھی مسجد کے مینار وغیرہ کے باقیات ظاہر ہوئے ۔الحمد للہ اب لوگ آہستہ آہستہ جس قدر ہو سکے قدیم مساجد کی تعمیرِ نو کی فکر کرر ہے ہیں اور جدید مساجد بھی تعمیر کرتے جارہے ہیں۔

"گوا" جانے کے لئے ٹرین اور بس گنتکل ۔ہبلی ۔دھارواڑ ہوتے ہوئے پہونچتی ہے ٹرین کا سفر میٹر گیج اور پہاڑی راستوں کی وجہ سے اٹھائیس گھنٹے طویل اور سخت تھکا دینے والا ہے۔ ریلوے لائن متعدد لمبی سرنگوں کے اندر اور خوفناک وادیوں کے کنارے ہوکر گئی ہے۔تاہم ہرے بھرے درختوں سے ڈھکے ہوئے فلک بوس پہاڑوں اسمیں سے پھوٹ کر آنے والے پانی کے صاف وشفاف چشموں اور میلوں گہری وادیوں کے نظاروں اور خصوصاً ہمارے کرم فرما رفیق جناب ظہیر الاسلام خان صاحب کی راحت رسانی نے ہمیں تھکاوٹ کا احساس راستے میں ہونے نہیں دیا۔

راستے میں ایک جگہ ٹرین رکی ،نہایت بلند پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا

اسٹیشن ”دودھ ساگر“ کے نام سے نظر آیا۔اس کی وجہ تسمیہ وہاں موجود کرشمہ قدرت ہے کہ پہاڑ کی بلندی سے پانی کا چشمہ پوری قوت وتیزی کے ساتھ بہہ کر نیچے آرہا ہے،اسکا پریشر اس قدر زیادہ ہے کہ دیکھنے والوں کوایسا لگتا ہے پانی نہیں دودھ بہہ رہاہے،اوروہ واقعی قابلِ دیدنظارہ ہوتا ہے۔(وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ) کرناٹک کے اختتام پر”لونڈا“ نامی مقام آتا ہے۔غالبًا اسی سے کچھ فاصلے کے بعد ریاستِ گوا کے حدود شروع ہوجاتے ہیں ۔ٹرین اگرچہ ”کاچیگوڑہ“ اسٹیشن سے چل کر گوا کے آخری شہر ”واسکو“ تک جاتی ہے ۔(یہ شہر سمندری راستہ سے خشکی کودریافت کرنے والے مشہور شخص ”واسکوڈی گاما“ کے نام سے موسوم ہے)مگر ہمیں سہولتاً ”مڈگاؤں“ اتر کر بذریعہ کار بقیہ سفر طے کرنا تھا، چنانچہ مڈگاؤں اسٹیشن پر ہمارے دوست جناب ضمیرالاسلام صاحب (ملازم ڈیفنس) رکن ”پونڈا مسلم اسوسی ایشن“ استقبال کیلئے موجود تھے،ان کے ہمراہ بذریعہ کار پونڈا کیلئے روانہ ہوگئے،”پونڈا“ مڈگاؤں سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے،عشاء کے قریب گھر پہونچ گئے،ضمیر الاسلام صاحب کا تعلق حیدرآباد ہی سے ہے،وہ ملازمت کے تبادلوں میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے ”گوا“ پہونچ گئے ہیں اور کچھ سہولتیں میسرآئیں تو ایک فلاٹ بھی خریدلیا ہے،انہوں نے ہی ہمارے لئے حسبِ مزاج قیام وطعام کا بہترین نظم کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔

ریاست ”گوا“ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر واقع چند شہروں پر مشتمل ہے۔ مڈگاؤں، مارگوا،اور ماپوسا بڑے شہر ہیں ۔ باقی سب چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ دارالحکومت ”پنجم“ ہے جسے انگریزی میں پاناجی بھی کہاجاتا ہے۔زمینی رقبہ پوری ریاست کا 3702 مربع کلومیٹر ہے۔کل آبادی گیارہ لاکھ اڑتیس ہزار سے کچھ

زیادہ ہے، یہاں کا تعلیمی فیصد بہت اچھا ہے، یعنی تقریباً 77% فیصد ہے، مقامی زبان کوکنی ہے، زمین نہایت سرسبز وشاداب ہے، اونچے اونچے پہاڑ اور گہری کھائیاں سب بڑے چھوٹے گنجان درختوں سے ڈھکی ہوئی ہیں، حد یہ ہے کہ آبادی میں بھی مٹی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ سڑکوں کی دونوں جانب گھانس اسطرح اُگی ہوئی ہے جیسے دونوں طرف سے سبز مخمل کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو، بارش کے موسم میں مکانوں کی دیواروں اور چھتوں پر بھی سبزہ اگ آتا ہے، مکان کی چھتیں عموماً بنگلور ٹائلز سے بنی ہوئی ہیں البتہ اب پختہ مکانوں کا رواج چل پڑا ہے، تاہم اس کے ڈیزائین قدیم پرتگالی طرز پر ہی ہیں، کالونیوں کی شکل یہاں دیکھنے میں کم آتی ہے، اکثر لوگ سڑکوں کے کنارے نشیبی علاقہ میں ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر گھر بنائے ہوئے ہیں، وہ بھی اونچے درختوں کی اوٹ میں ہونے کی بناء پر نظر نہیں آتے، بعض بستیوں میں بیان کیلئے جب ہمارا جانا ہوا تو جمع شدہ لوگوں سے اندازہ ہوا کہ یہاں اتنے مکان ہیں، ورنہ دیکھنے سے آبادی کا کچھ پتہ نہ چل سکا تھا، درخت عموماً کاجو اور ناریل کے ہیں، اسکے باجود ان کی قیمت میں یہاں کچھ کمی نہیں ہے، معلوم ہوا کہ سب پیداوار برآمد کردی جاتی ہے، کہیں کہیں چھالیہ یا اور پھلوں کے درخت بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بایں ہمہ سرسبزی وشادابی قدرت کا کمال تو دیکھئے کہ یہاں کاشت برائے نام ہوتی ہے، تقریباً اناج دوسری ریاستوں سے درآمد کیا جاتا ہے، اسی طرح ترائی، کھیرا، لوکی اور چند چیزوں کو چھوڑ کر بقیہ سب سبزیاں دوسری جگہوں سے آتی ہیں، اس کی وجہ مٹی میں "آئرن" کی کثرت بتلائی جاتی ہے۔ مقامی لوگ مچھلی کا استعمال خوب کرتے ہیں، اور سمندر کے قرب کی وجہ سے فراوانی سے میسر بھی ہے، مسلمانوں میں بڑے گوشت کا بھی رواج ہے۔

آج کل بارش کا موسم ہے، اس کی وجہ سے مزید شادابی ہے۔ سمندری علاقہ

ہونے کی بنا موسم عجیب وغریب ہے، باہر مسلسل بارش اور اندر گرمی ابل رہی ہوتی ہے، بارش بھی انوکھی قسم کی ہے، اچانک بادل چھا جاتے ہیں، سارے ماحول پر گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے اور بڑے زوروں سے بارش ہوتی ہے لگتا ہے کہ ہفتہ بھر نہیں تھمے گی۔ مگر بمشکل سات آٹھ منٹ برس کر رک جاتی ہے، تھوڑی سی دھوپ پھر نکل آتی ہے، زمین بہت تیزی سے پانی جذب کر لیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑکیں صاف ستھری ہو جاتی ہیں، کیچڑ اور گندگی کہیں نظر نہیں آتی۔

عوام پر عیسائی تہذیب غالب ہے، یوں بھی آبادی کا ایک بڑا حصہ عیسائیوں پر مشتمل ہے، تعداد میں ہندو اور عیسائی مساوی ہیں، مسلمان اقلِ قلیل ہیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ جھگڑے ہندو اور عیسائیوں کے آپس میں ہوتے ہیں، مسلمان عموماً اس سے محفوظ ہیں دن میں ایک سے چار بجے تک تمام بازار بند رہتے ہیں، شراب عام ہے، خرید وفروخت کی بھی کھلی اجازت ہے، تمام بازاروں اور شوارع عام پر اسی کی جلوہ گری ہے، تاہم مسلمانوں کی اکثریت اس لت سے محفوظ ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔ جگہ جگہ چرچ قائم ہیں اور ہر گھر کے سامنے اور سڑکوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سمینٹ یا ٹائلس کی صلیبیں بنی ہوئی ہیں، ان کے نیچے چھوٹی سی طاق میں اکثر موم بتی یا دیپ جلتی رہتی ہے۔

علاقہ کی خوبصورتی اور شراب کی سہولت اور" اولڈ گوا" میں کسی عیسائی پیشوا "سینٹ فرانس زیویر" کی نعش سیاحوں خصوصاً انگریز سیاحوں کی آمد کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے معلوم ہوا کہ سواحل سمندر اور وہ شہر جو سمندر سے متصل ہیں میں عریانیت کا طوفانِ بدتمیزی قائم ہے۔ لیکن وہ علاقے جو وسط ریاست میں ہیں ان میں یہ نقشے شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔" اولڈ گوا" جہاں بہت بڑا تاریخی چرچ ہے وہاں بھی ہمیں جانے کا اتفاق ہوا، سڑک کی ایک جانب سمندر کے

کنارے ایک بہت بڑا ''محل'' ہے دوسری جانب ''چرچ'' ! معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں یہ محل ''عادل شاہ'' کی قیامگاہ تھا اور یہ چرچ ''شاہی مسجد'' تھا، اور یہ بات بھی وہاں زبان زد ہے کہ اس چرچ پر ''صلیب'' نہیں ٹکتی، چنانچہ متعدد بار لگائی گئی تو نیچے گری ہوئی ملی، بالآخر لگانا چھوڑ دیا گیا، ہم نے بھی سب طرف تلاش کیا مگر کہیں نظر نہ آئی، حیرت ہوئی کہ جہاں قدم قدم پر صلیب نظر آتی ہو وہاں ایسے تاریخی عظیم ''کلیسا'' میں صلیب کیوں نہیں؟ ہندو کہتے ہیں کہ یہ ہمارا مندر تھا بھگوان کے غصہ سے گر جاتی ہے، مسلمان کہتے ہیں یہ ہماری مسجد تھی پروردگار کے جلال وغضب کی وجہ سے قائم نہیں رہتی ہے، زیادہ قرینِ قیاس مسجد ہونا ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ مندر اور چرچ میں لفظی فرق تو ہے مگر معناً کوئی فرق نہیں کہ دونوں شرک گاہیں ہیں۔ اسکے علاوہ خود عمارت کی ساخت، رخ، اور قدامت جیسے شواہد بھی جو بالکل واضح ہیں بتلاتے ہیں کہ اس عمارت کے ماضی میں مسجد ہونے کی روایت ہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم

دینی اعتبار سے یہاں کے مسلمان نہایت پسماندہ ہیں، ''علمِ دین'' سے افسوسناک حد تک محروم ہیں، پوری ریاست میں کوئی ایسا عالم نہیں جو مسلمانوں کی سرپرستی اور ان کے مسائل کے حل کی اہلیت رکھتا ہو۔ علماء کی آمد بھی بہت کم ہے، اور کچھ آتے ہیں تو ان سے ہدایت کم اور گمراہی زیادہ پھیل رہی ہے، تبلیغی جماعتوں کی آمد بھی بہت کم ہے، شائد یہاں کے ماحول کی وجہ سے ذمہ دار حضرات جماعت بھیجنے سے احتیاط کرتے ہوں، مساجد بھی بہت کم ہیں حتیٰ کہ دارالحکومت پنجم میں صرف دو مسجدیں ہیں، مساجد کی کمی، علماء کی عدم موجودگی، اردو سے ناواقفیت جیسی وجوہ سے علم کی روشنی تقریباً مدھم پڑ گئی ہے، حد یہ ہے کہ ضروریاتِ دین سے بھی تجربہ ہوا کہ اکثر مسلمان ناواقف ہیں، سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ اس جہالتِ دینی

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند بریلوی حضرات زور وشور سے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی اپنی سرگرمیاں قائم کئے ہوئے ہیں ۔الغرض مسلمانوں کی دینی حالت قابلِ رحم اور لائقِ توجہِ خاص ہے۔

ویسے اب الحمد للہ لوگوں میں شعور بیدا ہورہا ہے،اسی شعور کا نتیجہ ہے کہ ان بے چاروں نے صرفِ کثیر کے ذریعہ دینی اجتماعات کا نظم کیا،ان کی توجہ اور طلب کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے چارروزہ قیام میں بارہ اجتماع ہوئے،اس کے علاوہ روزانہ بعد عشاء تقریباً بارہ بجے تک مقامی نوجوانوں سے باہمی مذاکرات ہوتے رہے، بہت سے حضرات کے ذہن صاف ہوئے ،عوامی اجتماعات میں ان کے سامنے حق کسی حد تک واضح ہوسکا۔خدا کرے کہ اس کے اثرات دیرپا ثابت ہوں ۔اب ’’بلگام‘‘ میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہونیوالا ہے،اس مناسبت سے ’’گوا‘‘ پر بھی محنت ہورہی ہے خدا کرے کہ محنت رنگ لائے’’پونڈا مسلم اسوسی ایشن‘‘ کافی سرگرم عمل ہے، اسکے سبھی ارکان خصوصاً صدر’’ حمزہ بھائی‘‘ بڑے ہی مخلص وفعال اورمہم جو شخصیت کے حامل ہیں۔مستقبل میں اس تنظیم کے متعدد پروگرام ہیں جن کی تفصیل سے انکی ملی غیرت وحمیت کا اندازہ ہوا۔یہاں کے حالات کو دیکھ کر جتنی تکلیف ہوئی تھی ان حضرات اوران کے پروگراموں کو جان کر اتنی ہی خوشی بھی ہوئی ہے۔خدا کرے کہ یہ حضرات اہلِ علم وتجربہ کے مشوروں سے کام کریں تا کہ جو کام ہو وہ صحیح بھی ہو۔

ایک خاص بات یہاں جو معلوم ہوئی وہ یہ کہ یہاں جہیز اور گھوڑے جوڑے کے مطالبہ والی لعنت نہیں ہے۔ان لوگوں کیلئے جہیز وغیرہ کا مطالبہ عجیب چیز ہے۔شاید یہ ملک کی واحد ریاست ہے جواس برائی سے محفوظ ہے۔اللہ پاک تمام علاقوں سے اس غیر اخلاقی وغیر انسانی برائی کا خاتمہ فرمائے۔آمین

یوم سیاہ فوائد و مضرات

ایودھیا کی تاریخی بابری مسجد بربریت پسندوں کے ہاتھوں شہید ہوکر آج[۱] ۸ر سال مکمل ہوگئے، لیکن اب تک نہ خاطیوں کو کوئی سزا ملی اور نہ ہی اس مسئلہ کا کوئی مستقل اور قابلِ قبول فیصلہ ہوسکا، کیونکہ ہمارے ملک میں عام مقدمات کی یکسوئی کیلئے ہی برسوں درکار ہیں، خاص اور حساس مسائل کا تو پوچھنا ہی کیا ہے؟

ہر سال ڈسمبر کی چھ تاریخ اندیشوں اور خطرات کے بیچ میں آتی ہے، احتجاجات، جلوس اور جلسوں کے درمیان چلی جاتی ہے، مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں رہ جاتا ہے، اب تو صورتحال اور بھی نازک ہوتی جارہی ہے، اسلئے کہ مسلمان اور سیکولر جماعتیں اس دن کو "یوم سیاہ" قرار دیکر احتجاجی پروگراموں کا اعلان کرتی ہیں تو فسطائی اور فرقہ پرست قوتیں اس کو "یومِ شجاعت اور یوم الفتح" مانتے ہوئے رقص وسرور کی باتیں کرتی ہیں، جانبین کے بیانات، نعرے اور فقرے مزید دل آزاری اور بے امنی کا سبب بنتے جارہے ہیں۔

حکومت محض تماشائی ہے، اسلئے کہ "بابری مسجد کا سانحہ" اس کے حلق کا کانٹا ہے نہ نگلے بنتا ہے نہ اگلے، اس مسئلہ کو موضوع بنا کر بلکہ اس مسئلہ کو انجام تک پہونچا کر ہی موجودہ حکومت کرسیٔ اقتدار تک پہونچ سکی ہے، وزیرِ داخلہ ایل کے اڈوانی بابری مسجد کیس کے باقاعدہ ملزم ہیں تو اب ان کی حکومت سے انصاف کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ ہاں اس ملک کی عدلیہ اب بھی غیر جانبدار ہے اور اس سے بجا طور

---

[۱] اور اب تقریباً اٹھارہ سال ہونے جارہے ہیں، ۱۸ سال کے بعد لبراہن کمیشن نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ وزیرِ اعظم کے حوالہ کی ہے، اسکا افشاء کب ہوگا؟ اور مظلوموں کو انصاف کب ملے گا؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ "حقدار" کو "حق" پہو نچائے گی، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کب پہو نچا ئیگی، اور اس کیلئے کتنے سال درکار ہو نگے، اسلئے اس پر گفتگو بیکار ہے۔

سوچنے کی اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اس مسئلہ کے حوالے سے کیا لائحہ عمل اختیار کریں اور کونسی صورت اپنا ئیں؟ اس سوال کے جواب کیلئے ضروری ہے کہ سنجیدہ، سمجھدار، ملت سے سچی ہمدردی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والے اور دستور کی وسعتوں سے پوری طرح باخبر حضرات اکھٹے ہوں، اور ایسا لائحہ عمل تیار کرلیں جس کے ذریعہ پر امن اور منظّم طریقہ پر انصاف کے حصول تک قانونی لڑائی لڑی جاسکے، اور عوام الناس کرنے کے دوسرے کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کرلیں۔

اس کے برخلاف ہر سال ۶ رڈسمبر کو بعض سیاسی و ملی جماعتوں کی طرف سے جو کچھ ہورہا ہے وہ حصولِ مقصد میں نہ تو کچھ مؤثر ہے اور نہ مفیدِ مطلب، وقتی تسلی اور اظہارِ ناراضگی بالفاظِ دیگر "سالانہ ماتم" کے علاوہ کچھ نہیں، اس طرح صدیوں غم مناتے رہیں گے، تب بھی کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، اسلئے کوئی مؤثر و مثمر اقدام وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا فرمائیں۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز